50
شیرازہ
جموں و کشمیر میں اردو ادب کے پچاس سال
جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز ۔ سرینگر

نگران

## بلونت ٹھاکر

مدیر

## محمد احمد اندرابی

معاون

## محمد اشرف ٹاک

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر

ناشر : سیکرٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

کتابت: محمد عباس، شمس الدین، محمد انور لولابی، عبدالسلام بٹ

سرورق: جی۔ احمد

مطبع : میکاف پرنٹرس۔ دہلی

•

شرحِ چندہ:

سالانہ : ۲۰۰ روپے

فی شمارہ : ۶۰ روپے

•

شیرازہ میں جو مضامین شائع ہوتے ہیں ان میں ظاہر کی گئی آرا، سے اکیڈیمی یا ادارے کا کُلاً یا جزواً اتفاق ضروری نہیں

خط و کتابت کا پتہ:

محمد احمد اندرابی

ایڈیٹر، شیرازہ (اردو)

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

لال منڈی سرینگر ۱۹۰۰۰۸

# فہرست


● ــــــ حرفِ آغاز — محمد احمد اندرابی — ۵

● ــــــ اُردو تحقیق کے گزشتہ پچاس سال — اکبر حیدری کاشمیری — ۷

● ــــــ کشمیر کی بعض ادبی صحبتیں
ــــــ (ریڈیو دستاویزی فیچر) — سید قیصر قلندر — ۳۱

● ــــــ ریاست میں صحافت کا پچاس سالہ سفر — جان محمد آزاد — ۶۶

● ــــــ کشمیر کی علاقائی زبانیں اور اردو — موتی لال ساقی — ۸۲

● ــــــ لداخ میں اردو
ــــــ ۱۹۴۷ء — ۱۹۹۷ء — عبد الغنی شیخ — ۹۳

● ــــــ کشمیر میں اردو شاعری کے پچاس سال — غلام نبی ناظر — ۱۱۵

● ــــــ جموں و کشمیر میں اردو نثر
ــــــ مختصر جائزہ — نشاط انصاری — ۱۶۶

● ــــــ جموں و کشمیر میں اردو ناول
ــــــ ۱۹۴۷ء کے بعد — منصور احمد منصور — ۱۷۶

● ــــــ جموں و کشمیر میں اردو ڈرامہ
ــــــ ۱۹۴۷ء کے بعد — بجود سیلانی — ۱۸۹

● ــــــ جموں و کشمیر میں سفر نامے کی روایت — ضیاء الدین — ۲۰۲

د


● ـــــــ ۱۹۴۷ء کے بعد کی چند یادگار ادبی محفلیں — نور شاہ — ۲۱۹

● ـــــــ جموں میں اردو افسانہ
ـــــــ ۱۹۴۷ء ـ ۱۹۹۷ء — نصرت چودھری — ۲۲۷

● ـــــــ اقبالیات میں ریاستی ادیبوں کا حصّہ — محمد اسد اللہ وانی — ۲۴۲

● ـــــــ کشمیر میں خطاطی کا احیائے نو
ـــــــ ۱۹۴۷ء کے بعد — محمد اشرف ٹاک — ۲۶۱

● ـــــــ ریاستی کلچرل اکادمی اور اردو زبان — ضیاء الدین — ۳۰۸

● ـــــــ اردو تنقید میں ریاستی ناقدین کا حصّہ — مرزا عبدالحق نعیمی — ۳۲۰

● ـــــــ اردو کے تئیں ریاست کے ادبی اداروں کا رول — پریمی رومانی — ۳۳۶

● ـــــــ اردو زبان اور جموں و کشمیر — عبدالرشید فدا راجوروی — ۳۵۵

● ـــــــ کشمیر میں اردو ادب
ـــــــ سرسری جائزہ — سیما صغیر — ۳۶۶

● ـــــــ چند نوشتے — موتی لال ساقی / بشیر اختر — ۳۷۳

اِس خصوصی اشاعت میں ہم نے جموں وکشمیر میں اُردو زبان وادب کے حوالے سے اُس کام کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے جو گزشتہ پانچ دہائیوں کے دوران ریاست کے اُردو ادیبوں، شاعروں، محققّوں اور نقادوں نے اس کی ترقی اور ترویج کے سلسلے میں انجام دیا ہے۔ نصف صدی میں تخلیق کئے گئے ادب کا احاطہ کرنا کوئی معمولی کام نہیں، ہم اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں اِس کے بارے میں بہر حال قارئین کی رائے مقدم ہے۔

اُردو زبان، جیسا کہ قارئین جانتے ہیں، ریاست کی سرکاری زبان ہے۔ سرکاری زبان کہتے ہی، ۱۹۴۷ء میں شخصی راج کے خاتمے اور عوامی نمائندوں کے ہاتھوں اقتدار کی منتقلی کا خیال آتا ہے اور اکثر لوگوں کا دھیان اِس طرف نہیں جاتا کہ اُردو زبان کا چلن ریاست میں اس سے کوئی ۵۰ سال قبل سے رہا ہے۔ سال ۱۹۴۷ء پورے برِصغیر میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ فقط اِس لئے نہیں کہ اگست کے مہینے میں اس خطے میں سینکڑوں چھوٹی بڑی ریاستوں اور راجواڑوں کا وجود ختم ہوا اور دو آزاد اور خودمختار مملکتیں وجود میں آئیں یا جغرافیائی اور سیاسی سطح پر جو تبدیلیاں رونما ہوئیں اُن سے بھی انکار ممکن نہیں۔ عوامی سطح پر بھی سماجی، ثقافتی اور ادبی اعتبار سے ۱۹۴۷ء کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے کہ یہ بڑے ہی دُور رس نتائج اور انقلابی تبدیلیوں کا محرک بنا۔ ہند وپاک کی اکثر ریاستوں میں، ۱۹۴۷ء تک مختلف زبانوں میں جو ادب تخلیق ہو رہا تھا اُسے بحیثیت مجموعی روایتی ہی کہا جا سکتا ہے۔ جدید ادب کی طرف حقیقتاً اس کے بعد ہی توجہ دی جانے لگی۔ جموں وکشمیر میں بھی بشمول اُردو جتنی بھی زبانیں بولی جاتی ہیں اور جنہیں ریاستی آئین میں شامل کر کے تحفظ دیا گیا ہے، ان سبھی میں اگرچہ کافی شعری

سرمایہ موجود تھا لیکن نثری ادب کی طرف بہت کم توجہ دی جارہی تھی۔ تفصیلات میں پڑے بغیر ہم کہہ سکتے ہیں کہ پوری ریاست میں ۱۹۴۷ء سے قبل اردو میں فکشن کے نام پر جو کچھ لکھا جارہا تھا اُسے فکشن کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے یا نہیں، اس کے متعلق کچھ کہنا ناقدین کا کام ہے۔

اس خصوصی شمارے کو پیش کرتے ہوئے ہمیں یہ اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ اس میں بہت سے موضوعات پر مضامین شامل نہیں، گو کہ ہم نے ان کے حصول کیلئے کافی تگ ودو کی تھی اور فاضل مقالہ نگار حضرات سے تحریراً بارہا استدعا کی تھی لیکن ہماری کوششیں بارآور ثابت نہیں ہوسکیں۔ ہم اپنے قلمی معاونین سے یہ گلہ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ اُن کی طرف سے ہمیں اس مرتبہ وہ تعاون نہیں ملا جس کی ہمیں ان سے توقع تھی۔ ہمیں اس بات کا بھرپور احساس ہے کہ بعض اہم موضوعات پر مواد شاملِ اشاعت نہ ہونے کی وجہ سے قارئین کو کچھ کچھ تشنگی سی محسوس ہوگی جس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔ ہم اور انتظار کے متحمل نہیں تھے کہ بعض انتظامی اور مالی دشواریوں کی بنا پر یہ خصوصی شمارہ اگست کے ہی مہینے میں چھپ کر آنا تھا۔

گزشتہ پچاس برسوں میں اکادمی کی طرف سے اردو میں کُل ہند مشاعرے، کانفرنسیں، سیمنار، محفل مقالات، ادبی نشستیں اور اردو کے حوالے سے کئی تقاریب منعقد کی گئیں۔ اس پورے سفر کی روئیداد تصویروں کی زبانی "شیرازہ" اور اکادمی کی دیگر مطبوعات میں پیش کی جاچکی ہے۔ اس خصوصی شمارے میں ان تصاویر سے انتخاب پیشِ خدمت ہے۔

ہمیں حسبِ سابقہ اس شمارے کے بارے میں قارئین کی قیمتی آراء کا انتظار رہے گا۔

● ——— محمد احمد اندرابی

اکبر حیدری کاشمیری*

# اُردو تحقیق کے گزشتہ پچاس سال

مجھے اس بات پر فخر و امتیاز حاصل ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد میں نے پہلی مرتبہ جناب راجہ صاحب محمود آباد قیصر باغ لکھنو نادر الوجود کتب خانے کو کھنگالا۔ اور ایسے ایسے گوہر نایاب اس بحر ذخّار سے دریافت کیے جو کلاسکی ادب میں اپنی مثال آپ ہیں۔ کتب خانے میں جو بیش بہا مخطوطات دستیاب ہوئے ان کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے، میں نے ان کی فہرست اس طرح مرتب کی ہے۔

دواوین ۔ مثنویات ۔ تذکرے ۔ مرثیے ۔ تواریخ ۔ متفرقات

مخطوطات میں جو غیر مطبوعہ کلام اور نئی چیزیں دریافت ہوئیں ان کی نشاندہی اور بازیافت سے اُردو ادب میں قابلِ قدر اضافہ ہوا ہے۔ ان کی تفصیلات طایرانہ نظر میں درج ذیل ہیں۔

۱۔ **کلیات میر** ——— مکتوبہ سنہ ۱۲۰۳ ہجری، مخطوط غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اور غالباً یہ خود میرؔ کا انتخاب کیا ہوا ہے۔ اس کی تائید میرؔ کی ایک غیر مطبوعہ غزل سے ہوتی ہے۔ اس میں نو شعر ہیں، ایک شعر اس طرح ہے ؎

* ہمدانیہ کالونی ۔ بمنہ ۔ سرینگر

تذکرے سب کے پھر رہیں گے دھرے
جب میرا انتخاب نکلے گا

دیوان میں سینکڑوں شعر غیر مطبوعہ ہیں۔ صرف ایک شعر نمونے کے طور پر درج کیا جاتا ہے ؂

اس فصل میں کہ گل کا گریباں بھی ہے ہوا
دیوانہ ہو گیا سو بہت ذی شعور تھا

انتخاب میں میر کا وہ کلام ہے جو انہوں نے دہلی میں ۱۱۶۵ ہجری (۱۷۵۲ء) تک ترتیب دیا تھا۔

۲۔ میر کا دیوان چہارم ــــــــ راجہ صاحب مذکور کے کتب خانے میں میر کے متعدد دیوان ہیں۔ ان میں دیوان چہارم قابلِ ذکر ہے یہ میر نے اپنے ہمشیر زادا اور داماد میر حسن علی تجلی (متوفی ۱۲۱۴ھ) مرحوم کو دیا تھا۔ انہوں نے پورا دیوان اپنے قلم سے لکھا صفحہ ۱۴۱ پر "سوانح محمد تقی میر" درج ہیں۔ یہ "نوادر الکملا" سے اخذ کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کا نام ونشان اب کہیں نہیں ملتا ہے۔ میر کے انتقال کے بعد مخطوطہ مرزا محمد محسن کے عظیم الشان کتب خانے کی زینت بن چکا تھا۔ اس کی ابتدا میں سادہ ورق پر انہوں نے میر کی وفات کے بارے میں ایک تاریخی دستاویز اپنے قلم سے تحریر کی اور وہ یہ ہے :۔

"بروز جمعہ ستم ماہ شعبان المکرم وقت شام ۱۲۲۵ھ یکہزار دوصد بست و پنجم ہجری بودہ میر محمد تقی صاحب میر تخلص صاحب ایں دیوان چہارم در شہر لکھنؤ در محلہ سٹیلی بعد طے نہ عشرہ عمر بجوار رحمت ایزدی پیوستند و روز شنبہ بست و یکم ماہ مذکور سنہ الیہ وقت دو پہر در اکھاڑہ بھیم کہ قبرستان مشہور است نزد قبور اقربائے خویش مدفون شدند و چہار دیوان خود را کہ ایں دیوان چہارم از آں جملہ است۔ بمحرر سطور محمد محسن المخاطب بزین الدین احمد تجاوز اللہ

عن سیانۃ درعین حیات خویش بکمال رغبت بحل کرد بخشیدند۔ خدا ایشں بیامبرزاد۔ حررہ۔ محمد محسن عفی عنہ روز جمعہ بست و ہفتم ماہ شعبان سنہ الیہ بوقت چہار گھڑی روز باقی ماندہ۔ ایں دیوان از دستخط میر حسن علی تجلی داماد میر مغفور است"۔

اس کے بعد مرزا محسن تخلص محسن نے میر کی تاریخ وفات کے دو قطعات بھی درج کئے ہیں۔ یہ نسخہ شاہی کتب خانوں میں بھی رہ چکا ہے۔ پہلے نصیر الدین حیدر کے کتبخانے میں اور پھر امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے یہاں مرزا محمد محسن کی تحریر کے اوپر امجد علی شاہ اور نیچے نصیر الدین حیدر بادشاہ کے کتب خانوں کی مہریں ہیں۔

| سنہ ۱۲۶۳ واجد علے سلطان عالم | خوش است مہر کتب خانہ سلیماں جاہ مہر کتاب مزین و نقش بسم اللہ ۱۲۴۴ ہجری |
| --- | --- |

صفحے کے داہنی طرف یہ عبارت درج ہے۔ "بتاریخ دہم ربیع الاول سنہ ۱۲۶۲ ہجری بجائزہ رسید"۔ آخری صفحے پر بھی تینوں شاہی کتب خانوں کی مہریں ہیں۔ امجد علی شاہ کی بیچ میں گول دائرے کے اندر دو مچھلیوں کے بیچ میں تاج شاہی ہے اور اس کے نیچے مہر کی عبارت یہ ہے۔

| ۱۲۶۰<br>ناسخ ہر مہر چوں باشد مزین بر کتا<br>خاتم امجد علی شاہ زمان عالیجنا |
| --- |

دیوان میں میر کا غیر مطبوعہ کلام بھی ہے جس کی نشاندہی میں نے نقوش لاہور کے میر تقی میر نمبر ۲ میں تفصیل سے کی ہے۔

۳ - دیوانِ میر ——— نسخہ ادارہ ادبیات اُردو، حیدرآباد۔ میر کے جتنے بھی قلمی دیوان نظر سے گزرے ہیں ان میں یہ سب سے قدیم نسخہ ہے۔ یہ میر کا دیوان دوم ہے اس میں متعدد مثنویاں اور ایک قصیدہ ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔ قیامِ حیدرآباد کے زمانے میں میں نے اس کا مکمل عکس حاصل کیا، اب کراچی میں عنقریب شائع ہوگا۔ ابتدا میں سارے ورق پر یہ عبارت ہے "۶۲ ورق۔ دیوان حال الجزء الاوّل من دیوان میر تقی بتاریخ یازدہم شہر شوال ۱۱۹۲ ہجری شروع نوشتن کردن نمود۔"

ورق ۵۵ ب کے آخر میں ذیل کا ترقیمہ ہے۔

"تمام شد بتاریخ دوئم روز یکشنبہ شہر ذی قعدہ ۱۱۹۲ سنہ ہجری نبوی بحسب فرمائش شیخ محمد شاکر جیو سلمہ ربہ بدست میر محمد علی تحریر پذیرفت سنہ ۲۰ شاہ عالم بادشاہ۔"

ورق ۶۲ ب میں "مخمس در ہجو بلاس رائے" کے آخر میں یہ ترقیمہ ہے:-

"تمت تمام شد، دیوان میر تقی میر بتاریخ چہارم شہر ذی قعدہ روز سہ شنبہ بحسب فرمائش میاں محمد علی رضوی موافق سنہ ۱۱۹۲ ہجری تحریر یافت سنہ ۲۰ شاہ عالم بادشاہ غازی۔"

پورا دیوان ورق ۷۵ اب پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ اس کے بعد ذیل کا ترقیمہ ہے:-

"تمت تمام شد، دیوان میر تقی میر بتاریخ بست و نہم شہر شوال روز پنجشنبہ سنہ ۲۰ حکومت شاہ عالم مطابق سنہ ۱۱۹۲ ہجری بحسب فرمائش میاں محمد شکر اللہ منتقام دارالخلافہ شاہ جہاں آباد بخط احقر العباد رادھا کشن کاتب تحریر یافت۔"

دیوان کا تعارف ہم نے رسالہ "غالب" کراچی بابت ۱۹۹۰ میں شائع کرایا۔ غالب کے ایڈیٹر مشفق خواجہ ہیں۔

۴۔ **غالب** ——— نور الاسلام نام منتظر تخلّص کا انتقال ۱۲۲۱ھ میں لکھنؤ میں ہوا۔ مصحفی کے سرگرم اور پرجوش شاگرد تھے۔ ان کا دیوان ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔
رجب علی بیگ سرور (م۔ ۱۲۸۴ھ) نے فسانۂ عجائب کے آغاز داستان میں "لا اعلم" کے تحت یہ شعر درج کیا ؎

یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ
سن رکھو تم فسانہ ہیں ہم لوگ

شعر مرزا غالب کو بہت پسند آیا۔ چنانچہ اس کے بارے میں منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:۔ "رجب علی بیگ سرور نے جو فسانۂ عجائب لکھا ہے۔ آغاز داستاں کا شعر اب مجھکو بہت مزا دیتا ہے ؎

یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ
یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ

مصرعۂ ثانی کتنا گرم ہے اور "یاد رکھنا" فسانہ کے واسطے کتنا مناسب ہے"۔
یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سرور کو معلوم نہ ہو سکا تھا کہ شعر کس کا ہے۔ مرزا غالب نے سرور سے منسوب کیا۔ دراصل شعر منتظر کا ہے اور ان کے دیوان میں موجود ہے۔ اس میں نو شعر ہیں۔ مقطع یہ ہے ؎

منتظر شکل بلبل دشتی
دشمنِ آشیانہ ہیں ہم لوگ

دیوان میں مختلف اصناف شامل ہیں۔ آخری ورق ۲۳۵ ب میں ترقیمہ ہے:۔
" دیوان میاں منتظر شاگرد میاں مصحفی صاحب بتاریخ ہفتم شہر شوال

۱۲۳۹ ہجری"۔

۵ دیوانِ نظر ——— نام مرزا علی تخلص نظر، باشندۂ لکھنؤ۔ صاحب دیوان تھے کسی نے ان کے دیوان کا ذکر نہیں کیا ہے۔ یہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے اور اس کا ایک عمدہ نسخہ مجھے دستیاب ہوا۔ غالباً یہ واحد نسخہ ہے۔ غزلیں ورق ۱۶۷ اب پر ختم ہوتی ہیں۔ اس کے بعد مخمس ہیں۔ ان کی تعداد ۴ ہے، ورق ۱۷۵ اور ب میں تاریخیں ہیں۔ ان میں سے چند تاریخیں یہ ہیں۔ محمد تقی خان ترقی (م۔ ۱۲۴۶ھ) شیخ عظام مرثیہ خوان۔ ۱۲۴۳ھ تاریخ بادشاہ باغ (بنا کردہ نصیر الدین حیدر بادشاہ ۱۲۴۴ھ۔ مصحفی کی تاریخ وفات کا آخری شعر یہ ہے ؎

می گفت سروش از سر جان

فردوسی وقت از جہاں شد = ۱۲۴۰ ہجری

نظر قادر الکلام شاعر تھے۔ بقولِ مصحفی:-

"کلامش از غلطی پاک و در فن شاعری چالاک واز احوال و مبادی شعر ماہر۔ غرض شاعر مسلم الثبوت است۔ در کمال راسخ الاعتقاد تا الی آلان می بینمش و عمرش بست و شش سالہ خواہد بود۔"

پہلے ورق پر اس طرح کی مہر ہے۔

| ۱۲۵۶ |
|---|
| یار حسن |

آخری صفحہ ترقیمہ کے دائیں بائیں بھی یہ مہر ہے۔ مخطوط، نستعلیق، جدول مطلّا۔

ترقیمہ یہ ہے:-

"تمام شد دیوان مرزا علی متخلص بہ نظر بتاریخ دوازدہم

جمادی الاوّل ۱۲۳۹ ہجری بوقت سہ پہر روز شنبہ بخط خام بیاز آہنگ امر سنگھ، امیدوارِ فضل وکرم"۔

ابتداء:
بندھا تھا بسکہ مضموں بیشتر زلف پریشاں
ہوا یاروں کو مشکل جمع کرنا میرے دیواں کا

نظرؔ کو لکھنؤ میں ناقدروانی کی شکایت تھی۔ دکن دور نہ ہوتا تو وہیں جاتے

پورب میں نظرؔ قدر کسی فن کی نہ دیکھی
جاتا ہیں دکھن کو جو دکھن دور نہ ہوتا

دیوان نظرؔ کا تعارف 'صحیفۂ لاہور'، مجلس ترقی ادب لاہور مطبوعہ' جولائی ستمبر ۱۹۹۴ء (شمارہ ۱۴۱) میں شائع ہوا ہے۔

۶- **دیوانِ تجلّیؔ** ـــــــ (غیر مطبوعہ) میر حسن علی تجلّیؔ، میر تقی میرؔ کے ہمشیر زادہ اور داماد تھے۔ ان کے ضخیم دیوان کا غالباً واحد نسخہ کتب خانہ آصفیہ (حیدرآباد) میں موجود ہے۔ قیامِ حیدرآباد کے زمانے میں میں نے اس کا مطالعہ کیا اور عکس حاصل کیا۔ کچھ مختصر سا کلام مخطوط کی صورت میں اُردو کے ممتاز محقق ڈاکٹر نثار الدین احمد کے پاس تھا' اس کا بھی عکس حاصل کیا اس کا تعارف علی جواد زیدی صاحب کے رسالہ "العلم"، بمبئی میں شائع ہوا۔

۷- **دیوانِ رقتؔ کشمیری** ـــــــ (غیر مطبوعہ) رقتؔ تخلص، نام مرزا قاسم علی۔ میرؔ، سوداؔ، میر حسنؔ، جرأتؔ اور حسرتؔ وغیرہ کے ہمعصر تھے۔ مصحفیؔ نے رقتؔ کا حال اپنے تذکرہ میں لکھا ہے۔ اس کا اُردو ترجمہ یہ ہے:۔

"مرزا قاسم علی رقتؔ۔ قوم مغل (یعنی ایرانی الانسل)، لقب عراقی' بزرگوں کا وطن مشہد مقدس' ان کے اکثر بزرگ خطۂ کشمیر میں بھی اقامت کرتے تھے' لیکن خود رقتؔ شاہ جہاں آباد (دلی) میں پیدا ہوئے۔ فیض آباد میں سن شعور کو پہنچے۔ چودہ سال کی عمر میں شعر و شاعری کی طرف ہمہ تن راغب ہوئے۔ آخر شعر کہتے کہتے پُرگو ہوئے۔ ان دونوں میاں

قلندر بخش جرأت سے مشق سخن کرتے تھے لیکن زباں ایسی تھی کہ "من از جعفر علے حسرت کہ استادِ جرأت است استفادہ کردہ ام"۔ (یعنی جرأت سے انحراف کر کے حسرت سے استفادہ کرنے لگے)۔

مخطوط کے سادہ ورق کے اوپر ابتدا میں لکھا ہے کہ

"تا حال نسخۂ دیگر جز ایں بنظر نہ رسیدہ"

نیچے میں ذوالفقار علی خان تخلص صفا شاگرد میر تقی میر کے بارے میں ایک یادداشت بھی ہے :-

"ذوالفقار علی خان متوطن لکھنو، در حیدر آباد آمدہ، جان بحق سپردند"

معلوم ہوتا ہے کہ دیوان، رقت کا انتخاب ہے۔

ابتدا ؎ آہ میری ہے نمونہ مدِ بسم اللہ کا
بس ہے اس شیرازۂ دیوان کو رشتہ آہ کا

خاتمہ ؎ رقت کہی ہے زورِ طبیعت سے یہ غزل
اوروں کے واسطے یہ کیسی زمین ہے

ایک غزل میں فیض آباد کی تعریف کی گئی ہے، مقطع یہ ہے ؎

یہ وصیت ہے مرے رقت
گاڑیو تم کنارِ فیض آباد

دیوان رقت پر ہمارا تعارفی مضمون صحیفہ لاہور بابت جولائی۔ دسمبر ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا ہے۔

۸۔ **مخطوطات کلیاتِ ولی** ——— کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں ولی کے سات دیوان میری نظر سے گزرے ہیں ان میں کچھ ناقص بھی ہیں۔ ایک مخطوط زیر نمبر ۹۲۷ ہے۔ کل اوراق ۱۱۲ الف، کاتب غیر محتاط۔ سالِ کتابت ۱۱۵۹ ہجری۔ اس کا تفصیلی

ذکر کسی نے نہیں کیا۔ غزلوں کی تعداد ۱۴۱ ہے۔ اس میں متعدد غزلیں غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کی نشاندہی کسی نے نہیں کی ہے۔ ورق ۱۱۲ الف پر ترقیمہ ہے:۔

"بتاریخ ہفتم شہر ذی الحجہ ۱۱۵۹ھ قلمی گشت۔ تمت تمام شد"۔

۹۔ کلیاتِ ممنون۔ بخطِ ممنون ——— (غیر مطبوعہ) میر ممنون (متوفی ۱۲۶۰ ہجری) ملک الشعراء میر قمر الدین تخلص منت (متوفی ۱۲۰۸ھ) کے صاحبزادے تھے۔ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں ان کا کلیات محفوظ ہے۔ ابتداء میں "کلیات ممنون نوشتۂ خود" لکھا ہوا ہے۔ داخلہ رجسٹر پر "بخط مصنف" درج ہے۔ کلیات کے اندر اصلاحات و ترقیمات سے بھی بخط مصنف ہونی کی تائید ہوتی ہے۔ کل اوراق ۳۷۲ ہیں۔ ابتدا میں متعدد قصیدے اور بہت سی تاریخہائے وفات ہیں۔ صفحہ ۲۰۰ سے ۲۴۸ تک مثنویاں ہیں۔ پھر ترکیب بند اور واسوخت ہیں۔ اس کے بعد ورق ۳۷۲ تک مخمس رباعیات ہیں۔ غزلوں کی تعداد ۳۴۲ ہے۔ تفصیلات سہ ماہی اردو جنوری تا جون ۱۹۹۴ء میں درج ہیں۔

۱۰۔ دیوانِ خان ——— غیر مطبوعہ۔ آصفیہ: کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں کلیات خان کا ایک نادر و نایاب مخطوط موجود ہیں جس پر ۱۲۳۲ ہجری کی تاریخ کتابت ہے۔ اس کے کسی دوسرے نسخے کے بارے میں تاحال کوئی اطلاع نہیں ہے۔ خان تخلص اور اشرف علی نام تھا۔ افغان ختک قوم سے تھے۔ مصحفی کے شاگرد تھے۔ فن سپاہ گری اور نیزہ بازی میں یکتائے روزگار تھے۔ خان لکھنو میں پیدا ہوتے تھے۔ بقول مصحفی "در مشق چہار پنج سال از ہمراں خود گوئے سبقت بردہ۔ حق تعالیٰ زندہ دارد۔ یقین کہ بے مثل خواہد بود"۔ دیوان خان میں غزلوں کے علاوہ مثنویاں وغیرہ بھی ہیں۔ ہم نے اس پر تعارفی مضمون لکھا جو صحیفہ لاہور بابت جنوری ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔ آصفیہ میں دیوان صفا، دیوان حنا اور دوسری غیر مطبوعہ اور نایاب چیزیں بھی میری نظر سے گزری ہے۔

۱۱۔ کلیاتِ میر حسن۔ نسخہ راجہ صاحب محمود آباد ——— میری نظر سے میر حسن کا کوئی مرتب کردہ

نسخہ نہیں گزرا ہے۔ کتب خانے میں میر حسن کا یہ نسخہ نہایت خوشخط اور دیدہ زیب مطلا جدول میں موجود ہے۔ جہاں تک معلوم ہو سکا یہ ۱۱۹۲ ہجری سے قبل کا مکتوبہ ہے اور غالباً ۱۱۸۸ھ میں مرتب کیا ہوگا۔ جس اہتمام سے یہ ترتیب اور آراستہ کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید مصنف نے اسے سالار جنگ (متوفی ۱۲۰۱ھ) برادر بہو بیگم یا ان کے صاحبزادے مرزا قاسم علی کے لئے مخصوص کیا ہو۔ اس میں مثنوی سحر البیان (سال تصنیف ۱۱۹۹ھ) یا گلزار ارم (۱۱۹۲ھ) موجود نہیں ہیں۔ البتہ مثنوی قصر جواہر اور مثنوی شادی (نواب آصف الدولہ) موجود ہیں۔ مثنویوں کے علاوہ "قصیدہ لمعۂ نور در منقبت جناب امیر المومنین، قصیدہ در منقبت حضرت امام حسنؑ، قصیدہ در مدح نواب سالار جنگ، قصیدۂ نواب آصف الدولہ، قصیدۂ آفرین علی خان وغیرہ شامل ہیں۔ دیوان کی ابتدا میں دو مہریں اس طرح ثبت ہیں:۔

| | |
|---|---|
| اسد جنگ ۱۲۳۰<br>بہادر<br>الملک میرزا محمد علیخاں<br>مُفخر الدولہ افتخار | ۱۲۵۸<br>بہادر<br>جاں پا نمر |

میرزا محمد علی خان لکھنو کے رئیس اعظم میرزا محمد تقی خان ترقی کے بیٹے تھے۔ دیوان میں میر حسن کا غیر مطبوعہ کلام بڑی تعداد میں موجود ہے۔ اس پر ہمارا مضمون اردو ادب علی گڈھ شمارہ نمبر ۱، ۳، ۱۹۷ء میں شائع ہوا ہے۔

۱۲۔ کلیاتِ انشاء ـــــ انشاؔ (متوفی ۱۲۳۳ھ) کے دو مستند نسخے نظر سے گزرے ہیں۔ نسخۂ اول کا ترقیمہ یہ ہے۔

"تمت تمام شد کلیات میر انشاء اللہ خان بتاریخ دوازدھم شہر جمادی الثانی

۱۲۳۴ھ در عہد نواب غازی الدین حیدر بہادر بحر سخا و کرم بے بہادر"۔

دوسرے نسخے میں ترقیمہ نہیں ہے۔ یہ مصنف کے مسودے کی نقل ہے۔ آخری صفحہ پر لکھا ہے۔

"نقل مسودہ ہائے خان موصوف۔ تمت بالخیر"۔

دونوں نسخوں میں انشا کی طویل ترین مثنوی "مرغ نامہ" درج ہے۔ جو ۱۲۱۰ھ میں تصنیف ہوئی اور اس میں ۲۳۹ شعر ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین کے مطابق طویل ترین مثنوی "فیل" ہے، جو میری تحقیق کے مطابق درست نہیں ہے۔ کلیات انشا پر ہمارا تعارفی مضمون نقوش لاہور میں شائع ہو چکا ہے۔ مضمون میں مثنوی مرغ نامہ (مکمل) اور غیر مطبوعہ کلام شامل ہے۔

۱۳۔ کلیات سودا ـــــ کلیات سودا کے متعدد نسخے راجہ صاحب مذکور کے کتب خانے میں میرے مطالعہ میں رہے ہیں۔ آج تک جن لوگوں نے سودا پر کام کیا ہے انہوں نے سودا کے الحاقی کلام کی نشاندہی نہیں کی ہے۔ بعض لوگ نسخہ رچرڈ جانسن کو مستند نسخہ قرار دیتے ہیں اسے ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے ۱۹۶۹ء میں جوں کا توں شائع کیا۔ اس میں بھی الحاقی کلام موجود ہے اس کے ۲۷۰ صفحہ میں مثنوی "در ہجو فدوی" ہے۔ اس میں ۱۱۴ شعر ہیں اور یہ سودا کے نام سے درج ہے۔ یہ سودا کی نہیں بلکہ سودا کے ایک شاگرد میر فتح علی شیدا کی ہے۔ مقطع میں شیدا تخلص موجود ہے ؎

بس چل اب آگے نہ کہہ کچھ انہیں شیدا خموش

کیجئے اس سے سخن ہوتے جسے عقل و ہوش

مثنوی "تذکرہ شعرائے ہندی" بخط میر حسن (۱۱۸۸ھ) مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری تذکرہ گلزار ابراہیم ص ۱۹۰ اور تذکرہ مسرت افزا (سال تصنیف ۱۱۹۴ء) میں شیدا کے نام سے درج ہے۔ ہم نے ۳۷ سودا کی الحاقی غزلوں، ۹ شعر، ۱۲ مثنویوں اور ۷ رباعیوں کی

نشاندہی کی ہے۔ ان کے علاوہ سوداؔ کے الحاقی مرثیوں اور ان کے غیر مطبوعہ اشعار کو بھی پہلی مرتبہ جمع کر کے شائع کیا ہے۔ مضمون اردو اکادمی لکھنؤ کے دوماہی میں کئی قسطوں میں علی جواد زیدی صاحب نے شائع کیا۔ افسوس اس بات پر ہو رہا ہے کہ یونیورسٹیوں میں بی۔ اے اور ایم۔ اے کے نصاب میں بجائے سوداؔ کے قائمؔ کا کلام سوداؔ کے نام سے پڑھا جاتا ہے۔

۱۴۔ دیوانِ خلیلؔ ــــ غیر مطبوعہ۔ اوراق ۱۰۷: دوست علی خان تخلص خلیلؔ، خواجہ آتشؔ کے نامور شاگردوں میں تھے۔ ایک جگہ فخر سے کہتے ہیں ؎

شاگرد خلیلؔ آپ بھی آتشؔ کے ہیں شاید
کچھ ان میں بہت ملتا ہے انداز تمہارا

دیوان ہم نے پہلی مرتبہ دریافت کیا ہے۔

ابتدا ؎

| | |
|---|---|
| بحر کرم ہے جوش میں ربِّ غفور کا | حیلہ ہی چاہتا ہے وہ عذر قصور کا |
| ہو دل سے عذر خواہ جو انساں قصور کا | کر دے حضور قلب تقرّب حضور کا |

خاتمہ ؎

| | |
|---|---|
| گھر گھر شباب یار سے مشہور شور ہے | حسن اس کا آفتاب قیامت کا نور ہے |
| پوشیدہ وہ ہے خلق میں اسکا ظہور ہے | بدلی میں آفتاب زمانے میں نور ہے |

دیوان میں صرف غزلیں ہیں۔

۱۵۔ دیوانِ افسوسؔ ــــ ڈاکٹر اشپرنگر نے اودھ کیٹلاگ مطبوعہ ۱۸۵۴ء (صفحہ ۸۲) میں دیوان افسوس کا ذکر کیا ہے۔ اس کی ابتدا میں بغیر نام کے کسی نے دیباچہ بھی لکھا تھا۔ اس کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے:۔

○ خدائے را ستائش سزاوار لیست کہ نظم دیوان موجودات نمونۂ قدرت کامل

اوست وعطیۂ قوتِ شاعر از نشانہا فیض شامل او نوازش خود را از مطلع وجود تا مقطع آن ردیف حال بندگان فرمود۔"

راجہ صاحب کے یہاں افسوس کا ایک مستند مخطوطہ ہے۔ پہلے ورق پر "ہنہم ربیع الاول ۲۶۳اھ بجائزہ رسید" ہے۔ یعنی یہ اسی تاریخ کو شاہان اودھ کے کتب خانے میں درج کیا گیا تھا۔ یہ خطِ شکستہ میں ۱۹۵ اوراق پر مشتمل ہے، اس کے پہلے اور آخری صفحے میں شاہان اودھ (نصیر الدین حیدر ۱۲۴۳ھ، امجد علی شاہ ۱۲۶۰ھ، واجد علی شاہ ۱۲۶۳ھ) کے کتب خانوں کی مہریں بھی ہیں۔ جب یہ نسخہ ڈاکٹر سید ظہیر احسن مطبوعہ ادارۂ تحقیقات پٹنہ کے نسخے سے ملایا گیا تو دونوں میں زمین آسمان کا فرق نظر آیا۔ نسخہ محمود آباد بہت ہی پرانا ہے اس میں افسوس کا کلام ۱۲۰۰ ہجری تک ہے۔ ورق ۱۹۲ میں مرزا جواں بخت کے سفر شکار کا ایک قطعہ ۹ شعر پر مشتمل ہے۔ مادہ تاریخ یہ ہے۔

ع "ہو مبارک سدا شکار سفر" = ۱۲۰۰ ہجری

دیوان میں بعض مقامات پر حواشی میں شعر لکھے گئے ہیں۔ ان میں کانٹ چھانٹ اور ترمیمیں بھی کی گئیں۔ غالباً مصنف کے ہاتھ کی ہیں دیوان میں غیر مطبوعہ کلام بھی ہے۔ اسکی نشاندہی کی گئی ہے۔

**۱۶۔ دیوانِ نوازش ——— غیر مطبوعہ** : اس کا ایک عمدہ اور نادر نسخہ راجہ صاحب کے کتب خانے میں محفوظ ہے اس میں کئی مقامات پر اشعار میں اصلاحیں اور ترمیمیں بھی ہیں غالباً یہ مصنف کے ہاتھ کی ہیں۔ اکثر و بیشتر تذکروں میں نوازش حسین خاں نوازش کی عرفیت "مرزا خانی" ہے۔ لیکن زیرِ نظر نسخے میں "مرزا جانی" لکھا ہے، جیسے کہ ؎

میاں اک ذرا تو جھنجھلاہٹ کے کہنا
مرا چھوڑ دے مرزا جانی دوپٹا

دیگر ؎

اب تم جو اس قدر ہو بیمار ہو مرزا جانی
کیا عشق کا ہوا ہے آزار مرزا جانی

اس کی مزید تائید نوازش کے دوست شاہ کمال کے تذکرہ "مجمع الانتخاب" ورق ۶۱، الف) اور تذکرہ ذکا (بحوالہ ڈاکٹر اشپرنگر "اودھ کیٹلاگ" ص ۲۷۲ مطبوعہ ۱۸۵۴ء) سے بھی ہوتی ہے۔ مخطوطے میں غزلوں کے علاوہ دیگر اصناف سخن اور دو مثنویاں بھی ہیں۔

آغاز ؎

یونہی اگر جدا رہے گا ایک روز نہ جی مرا رہے گا

خاتمہ ؎ • ____ (ورق ۲ الف)

یارو یہ سلام آخری ہے یہ اپنا پیام آخری ہے
لو ہم تو چلے مسافری کو کہیو سلام عاشقی کو

۱۷۔ دیوانِ برق ____ (فارسی و غیر مطبوعہ) مرزا محمد رضا برق (متوفی ۱۲۷۴ ہجری) شاگرد ناسخ اردو کے مشہور شاعر تھے ان کے فارسی دیوان کا ذکر کہیں نہیں ملتا ہے۔ مجھے ایک نادر و نایاب نسخہ دریافت ہوا۔ سائز ۱ × ۸، مسطر ۱۵، خط نستعلیق، اوراق ۵۹، مکتوبہ ۱۲۴۸ھ ابتدا میں ۳ اوراق کا دیباچہ مصنف ہے۔ ابتدا اس طرح ہے۔

"زہے صانعی کہ آئینہ سویدائے دل خیال و زدیدہ وہم و دوربینان چوں آفتاب رونق افروز۔ نظارہ تماشائے جلوہ شاہد صورت الفاظ اجسام ممکنات از نیرنگ صنعت اوست"

آغاز ؎

اے تجلی مشرق خورشید وصفت نامہ ہا
برق حمدت شعلہ افروز زبانِ خامہ ہا
دل شد از برق خیالت شمع فانوس فلک
سر بہ سودائے ایاغت گرمیٔ ہنگامہ ہا

خاتمہ ہے

بصحرائے جنونم گرددبادگرم جولانی
جو سروآہ بلبل از چمن برچیدہ دامانی
نیست چوں برق زگلدام فلک آزادی
جستہ از چنگل باز قفس صیادی

ترقیمہ "تمام شد، بتاریخ دہ ماہ جمادی الثانی سنہ ۱۲۴۸ ہجری تحریر یافت و دیوان ہذا یک ہزار و پانصد و پنجاہ ابیات دارد۔ بدیں تفصیل اشعار دیوان یکہزار و دو صد و بیست و سہ و متفرقات را سہ صد و دہ عدد و اشعار مثنوی کہ بر ختم دیوان ریختہ خامہ برق نفس برق گشتہ ہفدہ است"۔

۱۸۔ دیوان حاتم زادہ ——— (غیر مطبوعہ) : یہ حاتم (متوفی ۱۱۹۷ھ) کا دیوان مختصر غالباً بخط مصنف ہے۔ حاتم کا شمار دورِ اول میں کیا جاتا ہے، انہیں سودا کا استاد ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ دیوان میں ہر غزل کی ابتدا میں بحر کا نام اور تاریخ لال روشنائی سے سرخی کے طور پر درج ہے۔ یہ تاریخیں ۱۱۳۲ھ سے ۱۱۶۷ھ تک ہیں۔ حاشیے پر ایک غزل ہے اس پر ۱۱۷۰ھ کی تاریخ ہے۔ غالباً اس کا اضافہ بعد میں کیا ہو۔ دیوان سنہ احد بادشاہ عزیز الدین عالمگیر ثانی یعنی ۱۱۶۸ھ مطابق ۱۷۵۳ء میں مرتب کیا گیا تھا اور یہ مثنوی فقہ ورق ۶۸ ب پر ختم ہوتا ہے، اس کے بعد ذیل کا ترقیمہ ہے :۔

"تمت تمام شد۔ بتاریخ بست و یکم جمادی الثانی سنہ ۲ عالمگیر وقت دو پہر تمام شد"۔

دیوان کے آخر میں چار مہریں ہیں۔ دو مکرید پرشاد اور دو شیو سہائے کی اور اس طرح ہیں :۔

| ۱۲۱۳ھ<br>مکرید پرشاد | شیو سہائے<br>۱۲۱۴ھ |
|---|---|

دیوان کی ابتدا میں دیباچہ ہے، اس کے بعد دیوان کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

"فی الحمد زمین طرحی در ۱۱۶۱ھ فی بحر رمل مدس مشعث فاعلاتن فاعلن مفعولن۔ ردیف الالف"۔

جنے آدم کنیں جان بخشا
خضر کوں چشمہ حیواں بخشا

دیواں زادہ حاتم پر میر التعار فی مضمون اردو ادب علی گڈھ شمارہ ۲ ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔

۱۹۔ دیوان صد غزل ـــــــ یہ سید حسین علی رضوی تخلص تاسف کا خود نوشتہ دیوان ہے۔ تاسف اُردو کے مشہور شاعر اور نثر نگار میر شیر علی افسوس کے نواسے تھے۔ افسوس کی تاریخ وفات عموماً ۱۲۲۴ھ مطابق ۱۸۰۹ء مانی جاتی تھی۔ تاسف سے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ افسوس کا انتقال ۱۲۲۳ھ میں ہوا تھا۔ دیوان صد غزل میں ۱۲ شعر میں افسوس کی تاریخ وفات اس عنوان کے تحت درج ہے "قطعہ در تاریخ وفات جناب ناناصاحب مغفور" آخری شعر یہ ہے ؎

سال ماتم میں اس جناب کے ہے
مج تاسف کو بار بار افسوس (۱۲۲۳ھ)

دیوان تاسف واحد نسخہ ہے۔ اس میں سو غزلیں ہیں۔ اشعار کی تعداد ۲۱۳۴ ہے۔ ابتدا میں ۲۲ صفحوں میں طویل مقدمہ ہے۔ اس میں اساتذہ اُردو پر تنقید کی ہے۔ تاریخ پر بے تحاشا چوٹیں کیں ان کے کانپور بھاگنے کی تاریخ "ہدہد گریختہ" ۱۲۵۲ھ وغیرہ

لکھی ہیں۔ دیوان ۱۲۴۸ھ میں ترتیب دیا گیا تھا لیکن بعد میں اضافے کئے گئے ہیں۔

۲۰۔ دیوانِ مصحفی ______ مصحفی (متوفی ۱۲۴۰ھ) کے متعدد قلمی دیوان میری نظر سے گزرے ہیں ان میں دو مخطوطے یعنی دیوان سیوم اور دیوان ششم غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ اوّل الذکر شیخ پیر بخش مسرور شاگرد مصحفی کے ہاتھوں لکھا ہوا ہے اس کی کتابت ۱۲۴۳ھ میں ہوئی تھی اور یہ شاہان اودھ کے کتب خانوں کی زینت رہ چکا تھا۔ ابتدا میں امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے کتب خانوں کی مہریں ہیں۔ مہر کے نیچے یہ الفاظ ہیں:۔

"۱۱ ذی قعدہ ۱۲۶۲ سنہ ہجری بجائزہ رسید محسن الدولہ سردار الملک راجہ امداد علی خان بہادر خوب جنگ، جلد دیوان سیوم میاں مصحفی العمر جز"

اس کے بعد مسرور کی مہر اس طرح ہے۔

| ۱۲۲۱ |
|---|
| شاعر |
| مسرور |
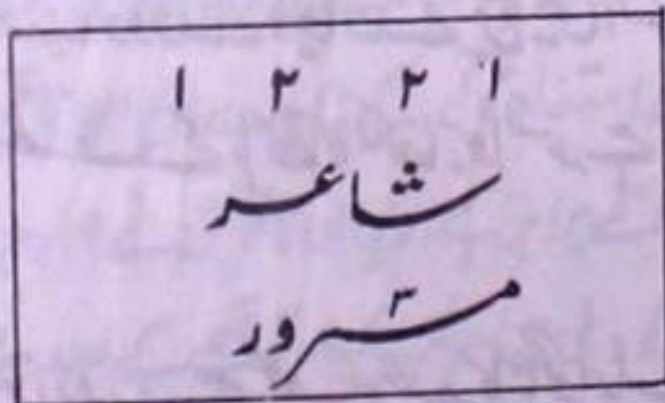
دیوان کے ورق ۱۵۲ الف میں مسرور کا ترقیمہ لال روشنائی سے اس طرح درج ہے:۔

"تمام شد دیوان سیوم میاں مصحفی صاحب بتاریخ بیست و پنجم شہر جمادی الاوّل ۱۲۴۳ سنہ بخط حام مسرور شاعر شاگرد رشید مولانا مصحفی مرحوم بعد وفات میاں مصحفی بعد از چہار سال منقضی شدہ بود در عہد جہان پناہ نصیر الدین بہادر خلف رشید غازی الدین حیدر بہادر، دار السلطنت لکھنو بوقت یکپاس روز برآمدہ بروز یکشنبہ اتمام رسید، داین عاصی کہ تخلص مسرور دارد، شاعر پایہ بارگاہ سلطنت خلیفۂ زمان برگزیدۂ رحمان خاقان ابن الخاقان

والی ملک ہندوستان مرزا سلیماں شکوہ بہادر است"۔

دیوان ششم ۱۲۳۱ ہجری کا مکتوبہ ہے۔ اس میں معلوماتی دیباچہ بھی ہے جس کے آخر میں مصحفی کی ۱۹ تصانیف کی فہرست ہے۔ اس میں کچھ کتابیں اب عنقا کے برابر ہیں۔ مصنف نے یہ دیوان ۱۲۲۴ھ میں ترتیب دیا تھا۔ اس وقت مصحفی کی عمر ۶۰ سال سے تجاوز کر گئی تھی۔ خود ان کا یہ جملہ قابل توجہ ہے:۔

"تولدِ من در احمد شاہیست تا الیوم عمر از شصت متجاوز خواہد بود"

اس حساب سے ان کی ولادت ۱۱۶۱ھ۔ ۱۱۶۴ھ قرار دی جا سکتی ہے۔

۲۱۔ دیوانِ آتش ــــــ دیوانِ آتش کے قلمی نسخے کمیاب ہیں۔ مجھے اس کے تین مخطوطے دستیاب ہوئے۔

نسخۂ اوّل:۔ سائز ۹½ × ۶"، سطر ۱۱، اوراق ۲۱۷، خط نستعلیق۔ یہ بڑا خوبصورت اور خوش خط ہے۔ کسی صاحب ذوق نے دیوان کے بیچ میں اکثر مقامات پر کچھ اصلاحیں اور ترمیمیں کی ہیں۔ غالباً مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ ہے۔ اصلاح کی چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

تعلق روح سے مجھ کو حسد کا ناگوارا ہے
زمانہ میں چلن ہے چار دن کی آشنائی کا
اصلاح ؎ تعلق روح کو بھی جسم کا اب ناگوارا ہے

یہ حال ہوا اس کے فقیروں سے ہویدا
آلودۂ دنیا سے بیگانہ ہے اس کا
اصلاح ؎ یہ حال ہویدا آزادوں سے اس کے

ورق ۱۴۵ الف پر "محمد یوسف" کی مہر ہے جس پر ۱۲۹۱ ہجری کندہ ہے۔ ورق ۲۱۶ الف پر فارسی کے تین شعر ہیں۔ ان کے بعد طالب علی خان عیشی کے رسالہ

"چراغ بے دود" (۱۲۳۰ھ) کی نثر ہے۔

دوسرا نسخہ بھی بڑا اہم ہے۔ اس کے صفحہ ۲۶۴ میں خاتمے کی عبارت ہے۔ ترقیمہ "تمام شد دیوان خواجہ حیدر علی آتش بموجب فرمائش مرزا غلام عماد الدین عرف مرزا کاشو خلف الصدق مرزا علی بخش صاحب بتاریخ چہارم شہر ربیع الثانی ۵ سنہ جلوس محمد بہادر شہ بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ کاتب الدیوان فقیر حقیر محمد عالی بخت قادری و چشتی عفی اللہ عنہ بروز دوشنبہ"۔

۲۲۔ دیوان مرزا حسام الدین خان ——— تخلص نامی مرزا غالب کے بزرگ دوستوں میں تھے۔ انہوں نے ہی غالب کو شاہان اودھ اور انگریزوں سے متعارف کرایا اور یہ نامی ہی تھے جن کے ذریعہ سے غالب کو قرضہ ملتا تھا۔ نامی کے بیٹے حسین میرزا عرف ناظر جی غالب کے بہترین دوستوں میں تھے۔ انہوں نے اپنے والد کا دیوان ترتیب دیا۔ اس پر مرزا غالب نے دیباچہ لکھا۔ دیوان کے دو نسخے مجھے دستیاب ہوئے۔ ان سے استفادہ کر کے میں نے دیوان نامی مرتب کر کے ۱۹۷۲ء میں شائع کیا۔ یہ اب عنقا کے برابر ہے۔ دیوان ناظر جی نے ۱۹ رجب ۱۲۸۸ھ مطابق ۵ اکتوبر ۱۸۷۱ء بروز پنجشنبہ کو دہلی میں مرتب کیا۔ ترقیمے کے بعد یہ مہر ہے۔

| ۱۲۵۱ھ |
| --- |
| جنگ خان بہادر ذوالفقار |
| الملک سید ذوالفقار الدین حیدر |
| معین الدولہ صفدر |

۲۲۔ کلیات شہید ——— غیر مطبوعہ: مولوی محمد بخش تخلص شہید (متوفی ۱۲۷۷ھ) شاگرد ناسخ و دیگر۔ شہید کے حالات خوش معرکۂ زیبا نسخۂ پٹنہ اور تذکرۂ ابن طوفان

مرتبہ قاضی عبدالودود مرحوم میں قدرے تفصیل سے ملتے ہیں۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم نے جس دیوان شہیدؔ کا ذکر "نگارشاتِ ادیب" میں کیا ہے اس میں کوئی مثنوی نہیں ہے۔ زیرنظر نسخے میں دیگر اصناف سخن کے علاوہ ایک طویل مثنوی "در مدح محمد علی شاہ بادشاہ وتعریف سڑک وغیرہ" کے عنوان سے موجود ہے۔ اس میں ۳۴۸ شعر ہیں۔ مثنوی سنہ ۱۲۵۳ھ میں تصنیف کی گئی تھی۔ تاریخ کا آخری شعر یہ ہے

از پئے شاہ شہیدان بعد مرگ

"اے خدا در کربلا تربت بدہ"

قطعہ تاریخ کے بعد ترقیمہ ہے۔

"بتاریخ شب دوازدہم ماہ ذی قعدہ سنہ ۱۲۸۰ھ مثنوی ہذا بخط خام احمد حسن تحریر یافت"۔

۴۔ مجموعہ سخن ــــــ قلمی وغیر مطبوعہ: یہ نادرالوجود واحد نسخہ بخط مصنف غلام مہدی تخلص مہدیؔ سرائے معلی خان لکھنو کا ہے جو ۱۲۴۰ھ میں مرتب کیا گیا تھا۔ اس کی ابتدا میں سید مسعود حسن رضوی کی ایک تحریر بھی انہی کے قلم سے اس طرح موجود ہے۔

"مجموعہ سخن۔ جس کو غلام مہدی لکھنوی نے نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کے عہد سلطنت میں مرتب کیا" اور خود اپنے ہاتھ سے لکھکر یکم صفر ۱۲۴۰ ہجری کو تمام کیا۔ مولف کتاب جرنیل اقبال الدولہ قطب الملک محمد عباس مبارز علی خان بہادر مظفر جنگ کی سرکار میں داستاں گوئی اور بذلہ سنجی کی خدمت پر مامور تھا۔ یہ باتیں خود مولف مجموعہ نے کتاب کے آخر میں لکھی ہیں" ● ـــ سید مسعود حسن رضوی

یہ ہے اس تحریر کا خلاصہ جو مولف کتاب نے مجموعہ سخن میں ورق ۱۳۱ الف پر درج کی ہے۔ اس کے آخر میں مصنف مہدیؔ نے ذیل کے قطعے میں اپنی تاریخ ولادت

بھی درج کی ہے ؎

یارب غلام مہدی یابد سنِ طبیعی
بہرِ امام ہادیؑ، بہرِ امام مہدیؑ
ایں پیر طفلِ سیرت چوں در وجود آمد
تاریخ گفت ہاتف "مہدی غلام مہدی" = ۱۱۸۹ھ

مجموعۂ سخن عرصے تک میرے مطالعہ میں رہا تھا۔ تفصیلات یہ ہیں:۔

سائز ۲۶ × ۱۷ اسم، تعداد اوراق ۴۳۱ ورق، تعداد صفحات ۸۶۲، تعداد شعرا ۶۶، تعداد غزلیات ۱۳۲۱، تعداد اشعار ۹۴۴۰ + ۵ بند مخمس۔

مجموعۂ سخن میں آتش، افسوس، اقبال، انشا، حسن (میر حسن)، جرأت، حسرت، خلیق، بادشاہ (نصیر الدین حیدر بادشاہ) وغیرہ کی سینکڑوں غزلیں ہیں جن میں بہت سا کلام غیر مطبوعہ ہے۔ کتاب میں آتش کی ۵۰ غزلیں، اقبال ۹۷، الہی ۵۱، انشا ۵۰، جرأت ۹۸، حسرت ۵۴، حسن ۱۴۵، خلیق ۱۴، درد ۵۲، سودا ۱۳۳، سوز ۶۳، عیشی ۵۷، مصحفی ۳۱۰، میر ۸۵، ہوس ۱۲۴ کی نادر و نایاب غزلیں ہیں۔

۲۵۔ کلیاتِ ہوس ——— غیر مطبوعہ: نواب مرزا محمد تقی خان ہوس کا انتقال ۱۲۵۱ھ میں ہوا۔ اس میں غزلوں کے علاوہ مثنوی لیلی مجنوں بھی ہے۔ دوسری مثنوی "گل و صنوبر" میں نے شائع کی، اس میں تقریباً ایک ہزار شعر ہیں۔ کلیات پر میرا مضمون "تخلیقات حیدری" میں شائع ہوا ہے۔

۲۶۔ کلیاتِ جرأت ——— یہ میاں جرأت لکھنوی کا نادر الوجود مخطوطہ ہے۔ اس میں غزلوں کے علاوہ ۱۱ مثنویاں اور متعدد مرثیے ہیں۔ ایک مثنوی "خواجہ حسن و بخشی طوائف" (سال تصنیف ۱۱۹۵ھ) کی ہے۔ کلیات میں تین مہریں ہیں۔

۱۔ ناظم جنگ بہادر الملک مرزا سعادت علی خان ۱۲۵۹ھ

۲۔ سلطان محمد سلیمان مرزا المرتضوی المصطفوی الحسینی

۳۔

| نظام الملک ــــ منیر الدولہ |
|---|
| خادم حسین خان بہادر ناصر |
| جنگ ۱۲۱۹ھ |

• مثنویاں: راقم الحروف کو متعدد غیر مطبوعہ مثنویاں دریافت ہوئیں جن کا ذکر پہلی مرتبہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ مثنوی مہر پیکر ـــــــ ایک طویل عشقیہ مثنوی ہے۔ ۶×۱۰ سائز کی ۱۲۲ اوراق پر مشتمل ہے۔ مصنف کا نام غلام حسین ہے۔ سال تصنیف ۱۲۲۶ ہجری (۱۸۱۱ء) ہے۔ مادۂ تاریخ یہ ہے۔

"ہے یہ مثنوی جلوہ گر دلفریب"

مخطوطہ ۲۷ ربیع الاول ۱۲۲۸ کا مکتوبہ ہے۔ غالباً واحد نسخہ ہے۔ اس میں نواب منیر الملک دکن، آصف ثانی نظام علی خان، راجہ چندو لال، نواب میر موسیٰ خاں وغیرہ کی تعریفیں ہیں۔ مثنوی کا سبب تالیف یہ ہے کہ میر موسیٰ خان کی شادی ذی الحجہ ۱۲۲۱ھ میں ہوئی۔ مثنوی نگار نے ایک تہنیتی قصیدہ پیش کیا۔ موسیٰ خان کو پسند آیا پھر خلعت سے نوازا اور فرمائش کی کہ کوئی دلچسپ قصہ نظم کیا جائے جو یادگار جہاں رہے مثنوی میر حسن کی ٹکر کی ہے اور اس میں تاریخی واقعات لکھی ہیں۔

۲۔ مثنوی بحر الحقیقت ـــــــ غیر مطبوعہ: اوراق ۱۰۳، مصنف میر محمد حسن تخلص حسن۔ حسن اندھے تھے، ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

میں ہوں اندھا گر نہ بخشے تو بصر
تو مجھے آوے بلا کیوں کر نظر

مثنوی ۱۲۵۰ ہجری میں تصنیف ہوئی، اس کی تاریخ یہ ہے ؎

ہجرت نبوی کے تھے اے خوش خصال
یک ہزار و دو صد و پنجاہ سال

۳ ۔ مثنوی شمشاد و صنوبر ــــــ غیر مطبوعہ: مصنف نامعلوم، مثنوی کا سال تصنیف ۱۲۱۷ ہجری ہے۔ مادہ تاریخ ع ۔ "بہار بوستان عشق بازی" ہے اور سال کتابت ۳ محرم سنہ ۱۲۴۹ھ ہے۔ مثنوی محمد میر خان نواب مختار کے نام معنون ہے اور عبد الرسول کی تعریف پر ختم ہوتی ہے۔ خاتمہ میں عبد الرسول کے علاوہ عمر خان اور فضل الحسین کے نام ہیں۔ انکا وطن سازنگپور شہر مالوہ تھا۔ یہ لوگ عرصے سے عادل پور میں رہتے تھے۔ چند شعر ؎

| | |
|---|---|
| عطا کر عشق کے دل کو تباہی | الٰہی یا الٰہی یا الٰہی |
| اسیر طایرہ شمشاد ہونا | صنوبر شاہ کا برباد ہونا |
| صنوبر کی ہوا میں دل کا کھونا | فدا شمشاد کا اس گل پہ ہونا |

۴ ۔ مثنوی مظہر العجائب ــــــ میر ضمیر لکھنوی اس کے مصنف ہیں۔ اس کے ابتدا اور آخر میں کئی مہریں ہیں ان پر لکھا ہے۔

۱۲۳۲ھ
پسر شیر محمد باقر

ترقیمہ ــــــ "نسخۂ مظہر العجائب تمام شد بوقت سہ پہر یوم سہ شنبہ شوال تاریخ بستم سنہ ۱۲۷۵ھ بدست آغا محمد باقر کربلائی"

ان مثنویوں کے علاوہ میرے مطالعہ میں جو غیر مطبوعہ مثنویاں رہی ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

۵ ۔ مثنوی کتخدائی، نواب وزیر علی خان ــــــ یہ وہم کی غیر مطبوعہ مثنوی ہے جو

۱۲۰۸ھ میں تصنیف کی گئی۔

۶۔ چراغ الیقین ـــــ از فاضل خاں سال کتابت ۱۲۴۷ھ۔

۷۔ حدیقۂ ہندی ـــــ غلام حسن ۱۲۰۸ھ غیر مطبوعہ

۸۔ رشکِ بوستان ـــــ شوقؔ کی زہر عشق کے رنگ میں ہے۔ مصنف نامعلوم

۹۔ دیوان برہمن ـــــ غیر مطبوعہ میں ۲ دو مثنویاں ہیں۔ مصنف کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ انشاءاللہ! ان مثنویوں پر تفصیلی روشنی آئندہ ڈالی جائے گی۔

۱۰۔ تذکرے ـــــ میں نے تذکرہ میر حسن بخط میر حسن، تذکرہ ہندی بخط مصحفی، تذکرۂ گردیزی مکتوبہ ۱۱۴۷ھ تذکرۂ بہارِ بے خزاں اور تذکرۂ قدیم شاعرات اُردو مرتب کیے ہیں۔

۱۱۔ مراثی ـــــ راقم حروف اس پر بھی نازاں ہے کہ اس نے سید مسعود حسن رضوی، راجہ صاحب محمود آباد اور سید محمد رشید صاحب کے ذخیرۂ مراثی کی فہرستیں مرتب کی ہیں اور ان سے افسردہؔ، گداؔ، احسانؔ، ناظمؔ، حیدریؔ، سکندرؔ، خلیقؔ، فصیحؔ، ضمیرؔ، دلگیرؔ، انیسؔ، انسؔ اور دبیرؔ وغیرہ کے غیر مطبوعہ مرثیوں کو شائع کیا۔ باقیات انیسؔ میں ۲۹ اور باقیات دبیرؔ میں ۳۶ غیر مطبوعہ مرثیے شائع ہو چکے ہیں۔ آجکل کراچی پاکستان میں میر خلیقؔ کے مراثی کی جلد اوّل زیر طبع ہے اس چالیس غیر مطبوعہ مرثیے ہیں۔

سید قیصر قلندر ⊛

# کشمیر کی بعض ادبی صحبتیں

## (ریڈیو دستاویزی پروگرام)

(سنتور پر مقامِ نوا کی دُھن ــــــ چند سیکنڈ کیلئے)

آواز ۱ : ادیب اور شاعر ہی نہیں بلکہ دوسرے فنکاروں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اُن کے تخلیقی عمل سے صرف انہی کی سی صلاحتیں رکھنے والے افراد ہی آگاہ نہ ہوں بلکہ بیشتر لوگ روشناس و واقف ہوں۔ مگر دیکھا گیا ہے کہ یہ آرزو بہت کم پایۂ تکمیل تک پہنچتی ہے۔ ایسی صورت حالات کے تین سبب ہیں۔ ایک یہ کہ ترسیل و ابلاغ کی دقتیں، دوسرے ناخواندگی اور تیسرے یہ کہ صاحبِ شعور اور صاحبِ ذوق کا فقدان۔ یہی وجوہ ہیں کہ عوام النّاس تک ادیب و شاعر اپنی نگارشات پہنچانے میں کامیاب نہیں ہوتا رہا ہے۔

آواز ۲ : برِ صغیر ہند و پاک کے دوسرے علاقوں کی طرح کشمیر بھی اسی قسم کی صورت حال سے دو چار رہا۔ یہاں بھی تعلیمی پسماندگی بہت دیر تک

---

⊛ قیصر صاحب کچھ عرصہ قبل انتقال کر گئے۔ ہمیں افسوس ہے کہ یہ مضمون اُنکے جیتے جی شائع نہیں ہو سکا۔ (ادارہ)

حاوی رہی۔ مختلف ادوار میں مختلف حکومتیں قائم ہوتی رہیں۔ مگر بہت ہی کم حاکموں نے عوام کی اس پسماندگی کو دور کرنے میں کوئی نمایاں کام کیا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ ادبی صحبتوں کا دائرہ محدود رہا۔ چند انے گنے صاحبِ علم لوگ ان میں شریک ہوتے اور تخلیقات سے محظوظ ہوتے رہتے۔

آواز ۱: جوں جوں ناخواندگی کی تاریکی چھٹتی رہی، علمی اور ادبی سرگرمیوں کا سلسلہ بڑھنے لگا۔ شاعر اور ادیب کو شعر فہم اور صاحبِ ذوق سامعین ملتے رہے اور جب ترسیل کے نئے ذرائع وجود میں آئے یا یوں کہا جائے کہ کشمیر میں ان سے استفادہ کرنے کا عمل جاری ہونے لگا تو شعری اور نثری تخلیقات چھپنے لگیں۔ یہ عمل فوراً اور ایک آنِ واحد میں وجود میں نہیں آیا بلکہ محرومیوں اور کشمکش کی طویل گھڑیوں کے بعد مختصر ادبی نشستوں سے نکل کر سامعین اور قارئین کا وسیع حلقہ میسر ہوا جو زمانے کے ساتھ ساتھ وسیع تر ہوتا رہا۔

آواز ۲: رسائل اور اخبارات کا سلسلہ اس صدی کی دوسری دہائی کے اخیر میں شروع ہوا۔ اظہار نے ایک نئی راہ تلاش کی۔ حالانکہ حکومتِ وقت نے اس پر بھی کئی پابندیاں عائد کیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دلوں کی گھٹن چنداں دُور نہیں ہوتی رہی بلکہ تڑپ تیز تر ہوتی گئی۔ محرومی اور گھٹن نے ادیبوں اور شاعروں کے حوصلے پست نہیں کیے۔ بلکہ وہ برابر اپنی تخلیقی کاوشوں میں مصروف رہے۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اُن کے سامعین و حاضرین بہت ہی کم ہوتے۔ یوں کہا جائے کہ خود ہی سامع بھی تھے اور خود ہی تخلیق کار!

آواز ۱: ریاست کشمیر میں اس صدی کے آغاز کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی ارتباط کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا جبکہ ریاستی تخلیق کاروں اور غیر ریاستی

قلم کاروں کے درمیان تبادلۂ خیال کے ذرائع ڈھونڈے گئے۔ یوں ہوتا کہ سیر و تفریح کی خاطر ملحقہ پنجاب سے ادیب، شاعر اور صحافی کشمیر آتے اور یہاں کسی نہ کسی دوست یا صاحبِ قلم کی شناسائی سے استفادہ کرتے تو مقامی صاحبانِ سخن تک رسائی ہو جاتی۔ ادبی نشستوں کی راہ نکل آتی اور مقامی ادیبوں اور شاعروں میں ایک نئی اُمنگ، ایک نیا جوش اور ایک نیا ولولہ جاگ اُٹھتا۔

آواز ۲: مگر یہ سارے سلسلے ——— علمی و ادبی، بڑے محدود ہوتے۔ بالکل اسی طرح سے جیسے کہ ایسی صحبتیں اور نشستیں درباروں اور اہلِ ذوق رؤسا کے گھروں میں منعقد و آراستہ ہوا کرتیں، جہاں تخلیق کاروں کی سرپرستی ہوتی اور رتبہ اور روزی کی سبیل نکل آتی ظاہر ہے کہ اظہارِ حق، عصری اور معاشی تقاضوں کا پابند رہتا۔ آنکھ جو کچھ دیکھتی لب تک کم کم ہی آسکتا تھا۔ یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ ایک حساس دل مجبوراً اپنے جذبات و محسوسات کو کھلے عام ظاہر کرنے میں پس و پیش کرتا تھا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ شعر کے قالب میں مختلف اصناف سخن کی وساطت سے رمز و کنایہ کے سہارے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کی جسارت کرتا اور اکثر یہ ہوتا کہ تاویلات میں معانی چھپ جاتے۔

آواز ۱: کشمیر میں بھی ملک کے دوسرے حصوں کی طرح ادبی صحبتوں کا سلسلہ چھوٹے پیمانے پر شروع ہوا۔ مگر اس کی نوعیت قدرے جدا تھی۔ اس سلسلے میں ہم نے ریاست کے ایک بزرگ عالم، دانشور اور شاعر میر غلام رسول نازکی سے بات کی جو پچھلی نصف صدی سے زیادہ عرصہ سے کشمیری، اردو

اور فارسی زبانوں میں شعر کہتے* ہیں۔ انہوں نے گفتگو کے دوران میں کئی گوشوں پر روشنی ڈالی اور ابتدائی ادبی صحبتوں کے بارے میں اہم اور مفید باتیں کیں جن سے ادبی تحریکوں کی اوّلین سرگرمیوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔

میر غلام رسول نازکی:

کشمیر کی ادبی صحبتوں کے بارے میں اگر بات کریں تو ہمیں بہت پیچھے زمانے کی طرف جانا پڑے گا۔ وہ جب موجودہ طریقے کی ادبی تحریک رائج نہیں تھی۔ وہ زمانہ تھا جب مختلف درس گاہوں میں عالم و فاضل لوگ درس و تدریس میں مصروف و مشغول ہوا کرتے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اب بھی بڑی بڑی درس گاہوں میں ادبی صحبتیں جاری ہیں۔ ان درس گاہوں میں اگر فارسی کی شہرہ آفاق تصنیف "خمسہ نظامی" سے "ہفت پیکر" وغیرہ زیر درس ہوتے تو ایک ایک شعر پر دس دس دن تک بحث و تمحیص جاری رہتی۔ شعری محاسن کے علاوہ فکری برتری زیرِ غور آجاتی۔ وہ زمانہ ایسا تھا کہ طالب علموں کی تعداد پندرہ[۱۵] بیس[۲۰] ہوا کرتی۔ دورانِ تجزیۂ شعر طالب کے اعتراض کے جواب اُستاد دیا کرتے اور اُستاد اپنے محاسن و معانی طلب شاگردوں کو مطمئن کرتے۔ اگر یوں کہا جائے کہ ہر درس گاہ ایک ورک شاپ ہوا کرتا تو بیجا نہ ہوگا۔ ایسی درس گاہوں میں ابتداء میں فارسی زبان و ادب زیر تدریس ہوا کرتے۔ پھر جب زبانِ فارسی دھیرے دھیرے سرکاری سرپرستی اور عوامی دلچسپی سے محروم ہوتی گئی تو فارسی کے بعد اردو کا چلن ہُوا۔

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ عدالتوں کے سمن اور حجوں کے

---

* قیصر صاحب کی وفات سے کچھ عرصہ قبل نازکی صاحب کا انتقال ہوگیا۔ — (ادارہ)

فیصلے فارسی زبان ہی میں ہوا کرتے ۔ اب بھی اس کے آثار مختلف سرکاری حکمناموں وغیرہ میں موجود ہیں جو تاریخی نوعیت پا چکے ہیں ۔

فارسی کے بعد اُردو زبان کی طرف توجہ مبذول ہوئی ۔ پہلے پہلے مشاعرے ہوتے رہتے ۔ پھر باقاعدگی سے مختلف ادبی تحریکیں ادبی صحبتوں سے آگے بڑھتی گئیں ۔ اُردو مشاعروں میں عموماً بیرونِ ریاست کے شعراء کی تعداد زیادہ ہوا کرتی ۔ مگر ریاستی شعراء بھی اپنا کلام پیش کرتے ۔ اس سلسلے میں مجھے ایک ایسے ہی ابتدائی مشاعرے سے ایک کشمیری اُردو شاعر کی غزل کا ایک شعر یاد آتا ہے ۔ دیکھئے زبان و بیان کس قدر خوبصورت ہے ؎

نامہ بر اپنا کوئی لوٹن کبوتر چاہیئے
تاکہ کھل جائے مرے دل کی حقیقت یار پر

لوٹن کبوتر کا کس طرح استعمال ہوا ہے ۔ دیکھئے ۔ اس اوّلین مشاعرے میں مقامی اُردو شاعروں کو خوب داد ملی ۔

(سنتور پر دُھن ———— چند سیکنڈ کے لئے)

آواز ۲: یہ صحیح ہے کہ درس گاہوں اور پاٹھ شالاؤں سے ادبی صحبتوں کا آغاز ہوا ۔ یہ سلسلہ بہت پرانا ہے ۔ آنند وردھن سے یوسف شاہ چک تک مہاراجوں اور سلطانوں کی سرپرستی میں شاعر و ادیب اور فن کار اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا حسبِ مقدور مظاہرہ کرتے رہے ۔ شعر، رقص، ڈرامہ اور موسیقی کے فنکاروں کی حوصلہ افزائی ہوتی رہی ۔ مگر ایک تحریک کے طور پر یہ سلسلہ اس صدی کی تیسری دہائی سے پہلے جاری نہ ہو سکا ۔

آواز را: جب تعلیمی درس گاہیں جدید طرز پر قائم ہوتی گئیں تو ان میں صاحبِ فن طلباء کو اظہار کا ایک نیا وسیلہ ملا۔ ان درس گاہوں کے میگزین چھپتے تھے اور ان میں اُبھرتے ہوئے شاعروں اور ادیبوں کی ادبی کاوشیں بھی نظر آنے لگیں۔ یوں کہا جائے کہ محدود محفلوں اور درباروں سے نکل کر صاحبِ قلم لوگوں کے لئے ایک اور پلیٹ فارم مل گیا۔ مقامی اور بیرونی قلم کاروں کے اختلاط کا ایک اور سلسلہ شروع ہوا جو موجودہ دور تک آتے آتے مختلف مراحل سے گزرا۔ کالجوں میں کس طرح سے جوہر نکھر آتے تھے، انکا ذکر بزرگ شاعر مرزا کمال الدین شیداؔ نے ایک ملاقات کے دوران میں کیا جب وہ اس صدی کی دوسری دہائی میں سری پرتاپ کالج میں طالب علم کی حیثیت میں داخل ہوئے تھے۔

مرزا کمال الدین شیداؔ:

پروفیسر صاحبان سے ابتدائی ملاقاتوں میں پتہ چلا کہ کالج میگزین کے مختلف حصّوں ـــــــ انگریزی، ہندی، اردو اور کشمیری کیلئے بعض ذہین طلباء کو ایڈیٹروں کی ذمہ داری سونپی جانے والی ہے۔ دھیرے دھیرے باہمی اختلاط کی بدولت چند طالب علموں کی کسی نہ کسی زبان سے دلچسپی اور دست رس دیکھ کر ان میں سے ایڈیٹر چُن لئے گئے اور مجھے کالج میگزین کے اردو حصّے کی ادارت کا کام تفویض ہوا۔ نگران پروفیسر صاحبان بھی اپنے اپنے حصّے کی تکمیل میں بڑی دلچسپی لیتے رہتے۔

(سنتور پر ہلکی سی دُھن)

آواز ۲ : کشمیر اگرچہ سیاسی کشمکشوں کی آماجگاہ بنا رہا ہے مگر پھر بھی ادبی و فنی عمل کبھی رُک نہ سکا۔ کبھی کوئی بزم آراستہ ہوتی تو کبھی کسی اور ادبی انجمن کی تشکیل ہوتی۔ ایک بزم یا انجمن معدوم ہوتی تو ریاست کے کسی نہ کسی شہر میں نئی بزم جنم لیتی۔ کبھی استادوں نے انجمن سازی کی تو کبھی جوشیلے نوجوانوں نے نئی طرح ڈالی۔ غرض یہ سلسلہ اب بھی اسی طرح سے جاری ہے۔ جیسے کہ رسائل، جرائد یا اخبارات کچھ دیر چھپنے کے بعد کچھ مالی مشکلات یا کچھ قارئین کی سرد مہری کا شکار ہو کر نابود ہو جاتے ہیں۔ لیکن تاریخِ ثقافت میں محفوظ ہو جاتے ہیں تاکہ آنے والی نسلیں سبق حاصل کریں یا عبرت!

آواز ۱ : جس طرح سے رسائل و جرائد کا وجود و عدمِ وجود معاشی، سماجی اور سیاسی حالات سے منسلک رہتا ہے۔ اسی طرح سے ادبی انجمنوں کی زندگی کبھی کسی نہ کسی ذہین ذہن سے وابستہ رہتی ہے۔ ریاستِ کشمیر میں بھی اسی طرح کا عمل رہا۔ جوں جوں معاشی و سماجی زندگی میں بہتری آتی گئی، شعور نکھرنے لگے۔ اہلِ فن کی حوصلہ افزائی بڑھتی گئی اور انہیں وسیع تر ادبی دنیا میں اپنی ذہانت اور اپنے فن کے نقش ثبت کرنے اور اپنی ہُنروری سے ملک کو روشناس کرانے کا موقعہ ملتا رہا۔ وہ مخصوص محفلوں اور نشستوں کے روایتی ماحول سے نکل آئے اور وسیع تر دنیائے ادب و فن میں ان کی قدر و منزلت بڑھنے لگی۔

آواز ۲ : عجیب اتفاق ہے کہ ادبی انجمن سازی کی ابتدا کا سہرا ایک ایسے باشعور

شخص کے سر رہا جو انگریزوں کی ملازمت میں تھا یا یوں کہا جائے کہ پہلا پتھر ایسے دُور رس اور صاحبِ بصیرت شخص نے رکھا جو مہاراجہ کی حکومت سے وابستہ نہیں تھا بلکہ ریاست میں انگریزوں کی ریزیڈنسی میں میر منشی کے عہدے پر فائز تھا۔ ان کے ساتھیوں میں کئی دوسرے منشی بھی علم و ادب سے شغف رکھتے تھے۔ مہاراجہ کے زمانے میں تحریر و تقریر کی آزادی نہیں تھی۔ اسی لئے ادبی محفلوں کا رواج بہت زیادہ نہیں تھا۔

آوازِ عام: مگر ریزیڈنسی کے میر منشی حالصاحب سراج الدین احمد نے فرنگیوں کی چھتر چھایا میں ادبی سرگرمیوں کی نئی طرح ڈالی اور ادبی شعور میں ایک انقلاب کی نشاندہی ہوئی۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے مقامی یا ریاستی ادیبوں اور شاعروں کی بھرپور حوصلہ افزائی کی مگر وہ فارسی دان اور کشمیری خوان طبقے سے بھی دُور نہیں رہے۔ نئی ادبی انجمن کے لئے انہوں نے بڑا دلچسپ نام تلاش کیا جس سے اُن کی باغ و بہار طبیعت کا پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے انجمن "مفرح القلوب" قائم کی جو ایک اچھا ثقافتی ادارہ بن گئی اور ان کے انتقال تک یعنی ۱۹۴۱ء تک کام کرتی رہی۔ جہاں شاعر اور ادیب کے ذوق کو تسکین اور دل کو راحت ملتی۔ ان کے زمانے میں جو علماء، ادیب اور شاعر، سیاحت کی غرض سے کشمیر آتے تو یہ انجمن ان کے اعزاز میں جلسے کیا کرتی چنانچہ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، سر شیخ عبدالقادر، سر محمد شفیع، جسٹس شاہ دین ہمایوں، سر تیج بہادر سپرو، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی۔ مولانا شبلی نعمانی، خواجہ الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد، میر ولی اللہ ایبٹ آبادی اور

دوسرے کئی مشاہیرِ شعر و سخن اور فکر و فن خانصاحب کی انجمن کی نشستوں میں آ کر اپنے فن پارے پیش کرتے اور ریاستی تخلیق کاروں سے آگاہ ہو جایا کرتے۔ بیرونِ ریاست سے آئے ہوئے مہمان مفکروں سے مقامی اور دیگر صاحبِ ذوق مستفید ہوا کرتے تھے۔

آواز ۲: انجمن "مفرح القلوب" کے بارے میں ملک نصراللہ عزیزؔ نے رسالہ "ایشیاء" کے ۱۹۳۰ء کے ایک شمارے میں یوں لکھا تھا:

آواز ۳: میں جاتے ہی اس انجمن کا عارضی ممبر بن گیا، مجھے غالبؔ، حسرتؔ اور اقبالؔ کی غزلیں ترنم کے ساتھ پڑھنے کا شوق تھا اور اس انجمن کے ارکان اُن کے دلدادہ تھے۔

آواز ۲: ملک نصراللہ عزیزؔ نے اس انجمن کی گوناگوں دلچسپیوں کا ذکر کیا ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے مشاغل صرف شعر و ادب تک ہی محدود نہ تھے۔ بلکہ یہ زندہ دلانِ کشمیر کی ایک انجمن تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

آواز ۳: عید کی نماز ہم نے عیدگاہ میں پڑھی جو بعد میں تحریکِ آزادیٔ کشمیر کی جلسہ گاہ بن گئی اور نماز کے بعد انجمن "مفرح القلوب" کا اجلاس منشی سراج الدین احمد خان کے مکان پر منعقد ہوا۔ تفریح و مسرّت کا ہنگامہ برپا تھا۔ غمِ عشق تھا نہ غمِ روزگار، لطائف، نظمیں اور قہقہے جاری تھے۔

(سازوں پر لوک دُھن)

آواز ۱: اس انجمن کے سرگرم ارکان میں پیرزادہ محمد حسین عارفؔ، چودھری خوشی محمد ناظرؔ اور مرزا سعدالدین سعدؔ بھی شامل تھے۔ اس انجمن نے نوجوانوں میں شعر و ادب کا مذاق پھیلانے اور اسے نکھارنے میں کافی

مدد کی۔ اس کے علاوہ سب سے نمایاں کام یہ ہوا کہ انجمن کے ادبی جلسوں کی بدولت سیاسی، سماجی، تعلیمی اور ثقافتی اداروں کی راہ ہموار ہو گئی۔

آواز ۲: منشی سراج الدین احمد کے ۱۹۱۳ء کے ایک نوٹ کے مطابق انجمن کا نام بدل دیا گیا تھا۔ یہ نوٹ انہوں نے رسالہ "مخزن" (لاہور) میں خوشی محمد ناظر کی ایک نظم کے ساتھ بھیجا تھا اور یوں لکھا تھا:

آواز ۳: بندہ حاضر۔ بیاض برادرِ انجمن "مفرح الارواح" یادش بخیر۔ انجمن "مفرح الارواح" کا زمانہ تھا۔ ناظر۔ حاضر۔ صادق۔ کاذب۔ مشک و عنبر کی مشک افشانی سے کشمیر معطّر تھا۔ اربابِ ذوق کے رشحاتِ فیض سے آبِ ڈل پر سحابِ سخن اور بارانِ سرود برستا تھا۔ لدرویلی اور سندھ ویلی کے سبزہ زاروں اور نسیم و نشاط اور شالامار کے گلزار اوراقِ مخزن کو گلرنگ کرتے تھے۔ مگر دورِ ایّام نے اس مجمع کو پریشان کر دیا اور آبِ ڈل پر سکون کا عالم چھا گیا۔ کچھ عرصے بعد حضرت ناظر کا ورود کشمیر جنّت نظیر میں ہوا۔ مناظرِ کشمیر کی نگرانی اُن کے سپرد ہوئی۔ سبزہ و گلزار نے شکرانہ ادا کیا اور سرو و چنار نے خیر مقدم!

آواز ۱: اس نوٹ میں دو باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ "مفرح القلوب" انجمن کا نام بدل کر انجمن "مفرح الارواح" رکھا گیا تھا یا منشی صاحب انجمن "مفرح القلوب" کے ساتھ اسے انجمن "مفرح الارواح" کہنا پسند کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ اس کی نشستیں منشی صاحب کے گھر بشیر آباد (نادہ پورہ سری نگر) تک ہی محدود نہیں ہوتیں بلکہ باغات، جھیل ڈل لدر ویلی اور سندھ ویلی کے منتخب مقامات میں بھی آراستہ ہوا کرتیں۔

اس ضمن میں ہمیں حبیبؔ کیفوی کے ایک مضمون جموں وکشمیر کی شعری محفلوں کا حوالہ دینا پڑے گا۔ جو "صحیفہ" لاہور میں ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا تھا۔ ایک اقتباس یہ ہے:

آواز ۳: معمول یہ تھا کہ ہفتے کو اس کے اراکین ڈونگوں میں سامان خورد ونوش لے کر ڈل کی طرف نکل جاتے۔ رات ڈونگوں میں ڈل کے کنارے بسر کرتے۔ صبح کو نشاط، شالامار، نسیم باغ یا چشمہ شاہی میں ڈیرے لگا لیتے اور تمام دن ہنسی مذاق اور شعر خوانی میں گزار دیتے۔

آواز ۱: حبیبؔ کیفوی بھی ان محفلوں میں شریک ہوتے۔ ان کے علاوہ قمرؔ کمرازی، ڈاکٹر عماد الدین سوزؔ، سالگ رام سالکؔ، غلام جیلانی اثرؔ، قیسؔ شیروانی اور دیگر نو فکر شعراء بھی ان صحبتوں سے بہرہ یاب ہوا کرتے۔

آواز ۲: منشی سراج الدین احمد کے "مخزن" والے نوٹ کے علاوہ حبیبؔ کیفوی نے اپنے مضمون میں ڈل میں منعقدہ محفلوں کا ذکر کیا ہے۔ ایسی ہی ایک "سحابِ سخن اور بارانِ سرود" شام میں "سیلانی مشاعرہ" یا تیرتے ہوئے مشاعرے میں خوشی محمد ناظرؔ نے اپنی ایک مشہور نظم سنائی تھی جس کی ردیف "پانی میں" ہے۔ اس کے کچھ شعر حاضر ہیں ؎

(ترنم کے ساتھ) اللہ اللہ ہے کیا حسنِ چمن پانی میں
سبزۂ و لالہ و گل سرو و سمن پانی میں

تودۂ سیم ہے یہ ڈل کے خزانے میں نہاں
برفِ کہسار ہے یا عکسِ نگن پانی میں

اِک طرف کوہ پہ ہے تختِ سلیمان قائم
اک طرف سبز پری کا ہے وطن پانی میں

جلوۂ برق سے ہے نور کا عالم شب کو
طور منظر ہے مہاراج بھون پانی میں
ہیں شکارے میں سیہ چشم بتانِ کشمیر
یا اُترتے ہیں غزالانِ ختن پانی میں
لب ڈل آپ بھی کاشانہ بنالیں ناظرؔ
موسمِ گل میں رہے لطفِ سخن پانی میں

آواز ۲۱: مقطع میں جو آرزو ناظرؔ نے پیش کی تھی وہ اُس وقت پوری ہوئی جب وہ انتقال کر گئے اور لبِ ڈل ان کی اپنی قیام گاہ میں ہی سپردِ خاک کئے گئے۔
بہر حال "مفرح القلوب" یا "مفرح الارواح" کا ایک اور ادبی ادارہ "بزم اخوان الصفا" تھا جس کے بانی مولانا سیّد مبارک شاہ فطرت گیلانی رہے ہیں۔ اس بزم کا دائرہ عمل نسبتاً کچھ وسیع تر تھا کیونکہ اس میں کشمیری، فارسی اور اردو شعراء اپنا کلام پیش کیا کرتے اور دادِ تحسین پاتے۔ مولانا فطرت ۱۹۸۶ء میں اپنی عمر کی نوّے ۹۰ بہاریں دیکھ چکے تھے اور بفضلِ خدا برابر مطالعہ اور مشقِ سخن میں مصروف رہتے انہوں نے ایک ملاقات کے دوران "بزم اخوان الصفا" میں کہا تھا:

مولانا فطرت:
ہماری قائم کردہ ادبی محفل میں ایک دفعہ پروفیسر علم الدین سالک آئے۔ وہ ہسٹری کے عالم تھے۔ انہوں نے کہا کہ اس ادبی محفل کا نام بزمِ "اخوان الصفا" رکھیئے۔ کیونکہ اسی نام کی ایک اہم سوسائٹی بغداد میں قائم ہوئی ہے۔ لہٰذا ہم نے اس بزم کا نام یہی رکھا۔

ق ق : گویا سالک صاحب نے نام کی مشکل حل کر دی۔

مولانا فطرت :

ہم نے تو پہلے اپنے طور سے نام رکھا تھا۔ سالک صاحب نے اس کی تصدیق کی۔ کئی مشاہیر ادیب و مفکر ریاست سے باہر آتے تو اس بزم کی نشستوں میں ضرور شرکت کرتے۔ کچھ نام یاد آئے ہیں۔ محمد الدین فوقؔ، روش صدیقی، احسان دانش، اثر عسکری، اثر صہبائی، حفیظ جالندھری، جگر مراد آبادی آتے رہے۔

اس بزم میں عجب طرح کا مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ ان دنوں کے ایک مشاعرے کی بات کروں گا جو بڑا ہی خاص طرح کا تھا۔

ق ق : کوئی طرحی مشاعرہ ہوا کرتا تھا؟

مولانا فطرت : ایک دفعہ باہر سے آئے ہوئے مہمان شعرا نے خود تو طرحی مشاعرہ میں شرکت کی۔ مگر ہمیں کہا۔ یعنی مجھے اور مولانا حیرت کاملی کو کہ ہم اردو شاعر ہیں لیکن آپ کے لئے فارسی کی طرح ہے۔ انہوں نے کہا ہم طرح ڈالیں آپ کے لئے۔ قشقہ کے موضوع پر فارسی شعر کہیئے۔

ق ق : قشقہ کو ٹیکہ کہتے ہیں۔

مولانا فطرت : جی ہاں۔ ماتھے کا ٹیکہ۔ تلک۔ تو حیرت صاحب نے فی البدیہہ اور برجستہ ایک شعر کہا ؎

مہرِ تکمیل بہ سرِ خط جمال
قشقہ نسبت بہ پیشانی آل

ق ق : ایک ایرانی سفیر آئے تھے۔ ایک دفعہ ایک محفلِ سخن آراستہ ہوئی تھی۔

کیا نام تھا ـــــ آغا حکمت ۔ آغا علی اصغر حکمت ۔

مولانا فطرت: جی ہاں! علی اصغر حکمت ایرانی سفیر آئے تھے ایک بار۔ ان کے لئے ایک مشاعرہ بھی ہُوا تھا۔ اس میں میں نے ایک غزل پڑھی تھی۔ وہ اُردو غزل تھی۔ فارسی غزلیں بھی پڑھی گئیں۔ وہ اُردو غزل مجھے اب بھی یاد ہے کچھ شعر سناتا ہوں ؎

واہ رے خوش رنگ ہے بزم گلستانِ بہار
ذرّہ ذرّہ باغ کا ہے بُلبلستانِ بہار

ہیں حسینانِ چمن پیمانۂ گلگوں بکف
خونِ گُلشن سے ہوا رنگین دامانِ بہار

اِک نئی مستی سی چھائی ہے فضائے تیرہ پر
صبحِ محشر در بغل ہے شامِ مستانِ بہار

چہچہاتے جھومتے ہیں طائرانِ خوش نوا
ٹولیاں درّاج کی ہیں نغمہ سنجانِ بہار

شامِ غربت میں پتنگوں کا چمن آباد ہے
کرمکِ شب تاب ہے شمعِ شبستانِ بہار

آوازِ ۱: مولانا فطرت فارسی، عربی، اُردو اور کشمیری کے جیّد عالم تھے۔ ان کا شمار بزرگ ترین دانشوروں میں ہوتا رہا۔ کشمیر میں ان کے ہم عصروں میں مولانا شمس الدّین حیرت کاملی، مرزا کمال الدین شیدا، میر غلام رسول نازکی منشی امیر الدّین امیر، منشی صادق علی خان، پروفیسر نندہ لال کول طالب، پروفیسر مفتی جلال الدّین، پروفیسر محمد طیّب صدیقی صیغم، سالگ رام سالک،

حبیبؔ کیفوی، قیسؔ شیروانی، شہ زورؔ کاشمیری اور کئی دیگر اہلِ قلم رہے ہیں۔

(رباب پر کوئی لوک دُھن ـــــ چند سکینڈ کے لئے)

آواز۲: "بزم اخوان الصفا" کے علاوہ ایک اور پرانی انجمن رہی ہے۔ جو یوں تو درس و تدریس کے کام میں منہمک رہتی رہی ہے۔ مگر ابتدائی دور میں اس انجمن کے سالانہ جلسے ہوا کرتے تھے جہاں سربرآوردہ شعراء اپنی نظمیں پیش کیا کرتے۔ کچھ اسی طرح سے جیسے کہ لاہور کی انجمن حمایت الاسلام۔ کشمیر کی اس انجمن کا نام ہے "انجمن نصرت الاسلام" جس کے بانی میر واعظ رسول شاہ مرحوم تھے۔ اس انجمن کے ادبی جلسوں میں اساتذہ شعراء میں منشی امیرالدین امیرؔ اور منشی صادق علی خان کے علاوہ منشی محمدالدین فوقؔ، منشی غلام محمد صادقؔ، منشی غلام محمد خادمؔ، منشی ہرگوپال خستہؔ نظمیں سنایا کرتے۔

آواز۱: انجمن نصرت الاسلام کے بعد انجمن معین الاسلام ۱۹۱۵ء میں قائم ہوئی مگر اس انجمن کے تحت گاہ بگاہ ادبی مجالس ہوتیں کیونکہ اس کی زیادہ تر توجہ بچّوں کی دینی اور مروجہ تعلیم پر مرکوز رہتی[1]۔ اسی کی طرح کئی اور انجمنیں خاص مقصد کے لئے وجود میں آئیں۔ مگر شعر و ادب کی آبیاری دوسروں کے لئے رکھ چھوڑی۔ البتہ ان انجمنوں سے صاحب شعر و سخن منسلک ضرور تھے جو مختلف ادبی مجالس میں اپنی نگارشات پیش کیا کرتے۔

آواز۲: کشمیر میں آزادی برصغیر سے پہلے کچھ اور ادبی تنظیمیں کام کرتی تھیں جو کسی نہ کسی شاعر یا دانشور کی مساعی جمیلہ سے چند برس پوری تندہی سے اردو

---

[1] اس کے بانی اور روحِ رواں جید عالمِ دین مولانا سیّد میرک شاہ اندرابی تھے اور یہ کمرانہ میں سرگرمِ عمل رہی خصوصاً سوپور (کشمیر) میں۔ ـــ (ادارہ)

ادب کی خدمت کیا کرتیں اور پھر نامساعد حالات کا شکار ہو جایا کرتیں۔
پھر کشمیر میں کوئی نہ کوئی نئی بزم یا ادارہ وجود میں آتا۔ ایسی انجمنوں کا
ذکر کرنے سے پہلے جموں کی بات کریں جہاں اُردو شعر و سخن سے دلچسپی
رکھنے والے کئی نوجوانوں نے ایک بزم کی طرح اور نام رکھا "بزمِ سخن" جس
کے سرکردہ اراکین میں مرزا مبارک بیگ، غلام حیدر چشتی، قیس شیروانی،
حبیب کیفوی، ڈاکٹر عماد الدّین سوز، کشن سیمیلپوری، نرسنگھ داس نرگس
اور دوسرے کئی جواں فکر اور جواں سال تخلیق کار شامل تھے۔ یہ انجمن
۱۹۴۷ء تک قائم رہی۔ عام طور سے اس کی شعری نشستوں کے لئے
مصرعۂ طرح دیا جاتا۔ اس بزم نے اُردو شعر و ادب کے ذوق کو پھیلانے کی
ایک اور طرح ڈالی۔ ہفتہ وار محفلوں کے علاوہ سالانہ مشاعرے ہُوا کرتے۔
اور سینکڑوں لوگ مشاعرے سُننے آتے۔ پہلے سالانہ مشاعرے میں اُردو کے
مقتدر سخنور شامل ہوئے جن میں حفیظ جالندھری، سیماب اکبرآبادی،
تاجور نجیب آبادی، ہری چند اختر، سوہن لال ساحر، اثر صہبائی، امین حزیں
عابد علی عابد اور ریاست کے کئی ممتاز ہم عصر شاعر شامل تھے۔ اسی طرح
سے دوسرے مشاعروں میں چودھری خوشی محمد ناظر، پنڈت برج موہن
دتاتریہ کیفی، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، یاس یگانہ چنگیزی، جوش ملیح آبادی،
جوش ملسیانی، حکیم طغرائی، اختر شیرانی، پروفیسر علم الدین سالک،
جگر مرادآبادی، احسان دانش، عبدالحمید عدم، ڈاکٹر محمد دین تاثیر،
نواب جعفر علی خان اثر، عبدالمجید سالک، فیض احمد فیض اور غلام رسول
مہر بھی شریک ہوتے رہے۔

آواز ۱ : کچھ وقت گزرنے کے بعد اسی بزمِ سخن کا دائرۂ عمل وسیع تر کیا گیا اور اس کی سرگرمیاں کشمیر میں شروع ہوگئیں تو اس کا نام بدل کر بزمِ اردو جموں و کشمیر رکھا گیا اور اسی کے تحت ۱۹۳۹ء میں سرینگر میں ایک بے مثال اردو مشاعرہ منعقد ہوا جس میں مشاہیرِ تعلیم و علم و ادب نے شرکت کی۔ جن میں ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، سرتیج بہادر سپرو، ڈاکٹر امرناتھ جھا، روش صدیقی، میاں بشیر احمد اور پنڈت دتاتریہ کیفی کے علاوہ ساغر نظامی، حفیظ جالندھری، منشی سراج الدین، وشوا ناتھ درماہ، دینا ناتھ مست، قیس شیروانی، حبیب کیفوی، ڈاکٹر عماد الدین سوز، شہ زور کاشمیری اور دیگر بیشتر اہلِ قلم تھے۔ غرض انجمن سازی کا سلسلہ جاری رہا۔ جہاں صنعتِ سخن گوئی کی مشق ہوتی رہی، وہاں صاحبِ ذوق کی طبیعت کے موافق روحانی غذا میسر آتی رہی۔

آواز ۲ : بزمِ اردو جموں و کشمیر کے علاوہ جموں میں مولانا عبدالحق نے ایک مشاعرے کے بعد انجمن ترقی اردو ہند کی اوّلین شاخ کے قیام کا اعلان فرمایا اور جموں کے ہی ایک صاحبِ ذوق فرد بہاری لال بھاگڑی صدر مقرر ہوئے۔ حبیب کیفوی سیکریٹری۔ گویا ۱۹۴۰ء کے بعد انجمن ترقی اردو ہند کی باقاعدہ طور پر سرگرمیاں اور مصروفیتیں شروع ہوئیں۔ اس سے پہلے بزمِ مشاعرہ کے نام سے ایک اور ادبی تنظیم تھی جس کے سرکردہ اراکین میں صاحبزادہ محمد عمر نور الٰہی، شیخ غلام نقشبند، سردار وزیر محمد خان، شیخ غلام قادر، ملک محی الدین قمر، غلام علی حسرت، غلام حیدر خان غوری، پنڈت امرناتھ شہید، غلام نبی مسکین اور دیگر ادیب و شاعر شامل تھے۔ یہ بزمِ مشاعرہ

صاحبزادہ محمد عمر اور سردار وزیر محمد خان کی ذاتی کوششوں کے نتیجے سے وجود
میں آ کر مصروفِ عمل رہی۔ اس کے سرپرستوں میں گورنر جموں پنڈت اودھے
چند، پنڈت تھپال کشن در (افسرِ خزانہ) اور پنڈت بہاری لال بھاگڑی
(سیشن جج) تھے جنہیں اردو زبان و شعر سے کافی لگاؤ اور دل چسپی تھی۔
چونکہ اس بزم کے زیادہ تر اراکین سرکاری عہدہ دار تھے۔ اس لئے بقولِ
حبیب کیفوی (مصنف: "کشمیر میں اردو") یہ بزم دو چار برس ہی قائم
رہی۔ ایک یادگار مشاعرے کا تھوڑا سا حال حبیب کیفوی نے یوں لکھا ہے:

حبیب کیفوی:

"سہا جموں کے مشاعرے میں اتفاقاً آ پہنچے۔ یہ مشاعرہ بڑے اہتمام
سے عجائب گھر میں منعقد ہوا تھا۔ اس میں حفیظ جالندھری بھی شریک ہوئے
تھے۔ مشاعرے کے دوران میں جب سامعین کو یہ معلوم ہوا کہ سہا بھی
مشاعرے میں موجود ہیں تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ جب ان کے پڑھنے
کی باری آئی تو ان کے لئے سٹیج پر ایک میز رکھی گئی۔ جس پر کھڑے ہو کر
انہوں نے اپنا کلام سنایا۔ اس مشاعرے میں ان کے بعد پھر کسی کا
رنگ نہ جما۔ ۔ ۔ ۔"

آواز ۱: یہ بتانا ضروری ہے کہ سہا بہت پست قد کے انسان تھے اور اسی لئے
ان کے لئے ایک میز کا انتظام کیا گیا تاکہ دُور دُور تک سامعین اُن کی
صورت دیکھ پائیں اور اُن کے کلام سے لُطف اندوز ہوں۔

آواز ۲: جموں میں شعر و ادب کے ذوق کی آبیاری میں کئی دیگر اہلِ قلم کا ہاتھ
ہے۔ جن میں اللہ رکھا ساغر کا نام سرِفہرست ہے۔ وہاں بزم آرائیوں

کا پرانا سلسلہ ۱۹۴۷ء تک جاری رہا اور پھر آزادیٔ برِ صغیر کے بعد نئی انجمنوں اور اداروں نے جنم لیا۔ جن میں بزمِ فروغ اُردو، انجمنِ ادب اور بیٹھک سبھا زیادہ نمایاں طور پر مصروفِ عمل رہی ہیں۔ اُن کی ہفتہ وار نشستوں میں اُردو کے علاوہ گاہ بگاہ دوسری زبانوں کے شعراء بھی اپنا کلام پیش کیا کرتے تھے۔

(سازینہ دُھن ــــــ چند سکینڈ کیلئے)

آواز ۱: مولانا عبدالحق کے ایماء پر کشمیر میں انجمن ترقیٔ اُردو کی ایک شاخ ۱۹۴۴ء میں قائم کی گئی جس کے پہلے سیکریٹری جنرل ڈاکٹر نذیرالاسلام (عربی کے پروفیسر) مقرّر ہوئے۔ اس انجمن کے تحت جہاں مشاعرے ہوتے رہتے وہاں سیمینار بھی منعقد کئے جاتے جن میں ڈاکٹر ہادی حسن، ڈاکٹر رضی الدّین، خواجہ غلام السیّدین، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر تارا چند اور ملک کے کئی دوسرے دانشور شرکت کیا کرتے۔ یہ انجمن بھی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔

آواز ۲: برصغیر کی آزادی سے ذرا پہلے ہی کشمیر میں مولانا صلاح احمد مدیر "ادبی دنیا" کی تحریک پر حلقۂ اربابِ ذوق کی شاخ قائم ہوئی جس سے پریم ناتھ درؔ، پریم ناتھ پردیسیؔ، سیّد قیصر قلندر، عبدالحق برقؔ، سوم ناتھ زتشیؔ، مہندر ناتھ رینہؔ، مرزا غلام حسن بیگ عارفؔ اور کئی دوسرے نئے پرانے قلم کار منسلک ہوئے۔ یہ بزم بھی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی اور پھر ملک گیر ترقی پسند تحریک نے کشمیر کے اُردو ادیبوں اور شاعروں کو اپنی طرف متوجّہ کیا۔ غالباً وقت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ بدلتے

ہوئے رجحانات اور میلانات کے اہلِ فکر و فن بھی متاثر ہوئے اور انجمن ترقی پسند مصنّفین کی ایک شاخ سرینگر میں قائم ہوئی جس کے پہلے جنرل سیکریٹری پریم ناتھ پردیسی تھے اور اُن کے بعد سیّد قیصر قلندر، سوم ناتھ زتشی اور علی محمد لون نے باری باری جنرل سیکریٹری کا کام سنبھالا اور ایک ایک سال یہ کام انجام دیتے رہے۔ اس انجمن کی ہفتہ وار نشستوں میں مہمان اہلِ قلم میں خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، بلراج ساہنی اور رامانند ساگر جیسے کچھ نام یاد آتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد انہی ہفتہ وار نشستوں میں رامانند ساگر نے اپنا مشہور ناول "اور انسان مرگیا" کئی قسطوں میں سنائی۔ اس ناول کا مرکزی موضوع برِّ صغیر کے ہندو مسلم فسادات تھے اور اُن کے چشم دید حالات کی بڑی صفائی سے عکاسی کی گئی تھی۔ اسی طرح سے سری پرتاپ کالج کے انگریزی کے پروفیسر شیخ محمود احمد نے علامہ اقبالؔ کے جاوید نامہ کا انگریزی شعری ترجمہ قسط وار سنایا تھا۔

(ساروں پر ایک دُھن)

آواز ۱: جس زمانے میں کشمیر میں برج لال نہروؔ وزیر تھے تو ان دنوں ان کی بیگم رامیشوری نہرو (سوشل ورکر) خاص طور سے ادبی اور ثقافتی محفلوں کا انتظام کیا کرتی تھی۔ اکثر و بیشتر اُن ہی کے گھر پر نشستیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ دونوں میاں بیوی اُردو ادب سے بے حد لگاؤ رکھتے اور مقامی اور مہمان شعراء اور ادباء کو دعوتِ سخن و فن دیتے رہتے۔ اُن کی نظر مقامی کالجوں کے اُردو ادیبوں اور شاعروں پر ہوتی اور وہ بھی اُنکی قیام گاہ پر آراستہ محفلوں میں شمولیت کے لئے بلائے جاتے۔

آواز ۲: ۱۹۴۷ء سے کچھ پہلے ایک اور بزم قائم ہوئی تھی جس کا نام "سیماب لٹریری سوسائٹی" تھا۔ یہ بزم اردو سیماب اکبر آبادی کے فارغ التحصیل شاگرد غلام قادر شہ زور کاشمیری اور خموش سرحدی کی دل چسپیوں اور کوششوں کے نتیجے میں وجود میں آئی تھی۔ یہ بزم بھی چند برس پورے آب و تاب سے مصروفِ عمل رہی اور اس کا بھی وہی انجام ہوا جو دیگر اس قسم کی ادبی انجمنوں کا ہوا کرتا ہے۔ اس سلسلے میں شہ زور کاشمیری نے ایک گفتگو کے دوران میں کہا تھا۔

شہ زور کاشمیری:

حضرت سیماب اکبر آبادی کے مشورے پر خموش سرحدی کے اشتراک سے جو لٹریری سوسائٹی بنائی تھی اس کا مقصد یہ تھا کہ مقامی اردو شاعروں اور ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم مل جائے تاکہ اپنی نگارشات پیش کرسکیں جن پر غور و خوض ہو تاکہ اگر کوئی کوتاہی، فنی، عروض وغیرہ کی ہو تو باہمی مشورے سے دور کی جاسکتیں ——— ایسا بہت کم ہوا۔ مگر ایک دوسرے کے تخلیقی عمل کو جاننے کے اچھے مواقع ملے۔ حضرت سیماب کو اس ادبی انجمن سے روشناس بھی کراتے رہتے اور وہ اطمینان کا اظہار کرتے تھے۔

(سازینہ ——— دھن)

آواز ۱: ۱۹۴۷ء کے بعد ہی کشمیر میں نیشنل کلچرل فرنٹ کے قیام سے ایک نئی راہ کی نشاندہی ہوئی۔ اس کا قیام ریاست کے نہایت نازک دور میں ہوا اور اس کے بانی اہلِ قلم و فن میں پریم ناتھ پردیسی، پروفیسر محمود ہاشمی،

سیّد قیصر قلندر، سوم ناتھ زتشی، علی محمد لون، پران کشور، موہن لال ایمہ اور صلاح الدین احمد کے نام نمایاں طور پر لئے جاسکتے ہیں۔ پھر اسی مختصر سی جماعت میں دیگر اہلِ فکر وفن شامل ہونے لگے۔ جن میں دینا ناتھ نادمؔ، مرزا غلام حسن بیگ عارفؔ اور غلام احمد مہجورؔ کاشمیری بھی نئے ممبروں کی صورت میں مصروفِ عمل رہے۔ دھیرے دھیرے ایک بہت بڑے نمائندہ اور معتبر کاروانِ ادب وفن کی صورت میں محوِ تخلیق وعمل رہے۔ ترقی پسند مصنّفین کی انجمن نے جہاں کام چھوڑ دیا تھا وہیں سے ایک نئے ولولہ اور جوش اور نئے نصب العین کے ساتھ فن کار مصروف کار رہے۔ اُردو اور کشمیری اہلِ قلم کے علاوہ موسیقی اور ڈرامہ کے ماہر بھی اس کارِ خیر میں شامل ہوئے۔

آواز ۲: یہ تو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ کشمیر میں بیرون ریاست سے شاعر، ادیب اور فنکار آیا کرتے تو مقامی انجمنوں کی محفلوں اور نشستوں میں اپنے فن پارے پیش کیا کرتے۔ مگر اکثر ان انجمنوں کی سرگرمی مشاعروں تک ہی محدود رہا کرتی تھی۔ کبھی کبھی نثری تخلیقات بھی زیرِ بحث آیا کرتی تھیں۔ لیکن آزادی کے بعد اکثر تنقید، افسانے، ناول اور رپورتاژ بھی ان نشستوں میں پیش کئے جانے لگے۔ یہ بات صحیح ہے کہ عوامی حکومت کی سرپرستی میں یہاں کئی مشاعرے ہوئے، جشن منائے گئے۔ ادبی محفلیں آراستہ ہوتی رہیں۔ مشاعرے سرینگر یا جموں تک ہی محدود نہیں رہ پائے بلکہ بارہمولہ، اسلام آباد، سوپور، بانڈی پورہ، پونچھ، ڈوڈہ، کشتواڑ اور دیگر شہروں اور قصبوں میں بھی ادبی نشستیں

کا اہتمام و انصرام ہونے لگا۔ بزم و انجمنیں بنائی جانے لگیں۔ غرض اردو شعر و سخن کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

آواز ۱: سری نگر میں کلچرل لیگ اور دوسری انجمنیں صرف کشمیری زبان کی ترویج کے لئے وقف تھیں بالکل اُسی طرح سے جیسے کہ جموں میں ڈوگری سنستھا تھی۔ لیکن پھر بھی سیّد قیصر قلندر نے ایک فعال بزم، بزمِ اردو کے نام سے پانچویں چھٹی دہائیوں کے درمیان قائم کی تھی جس میں مقامی اہل قلم حضرات کے علاوہ جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر سیّد محی الدین زورؔ، پروفیسر عبدالقادر سروری، حبیب تنویر۔ پروفیسر آل احمد سرورؔ، ٹھاکر پونچھی، موہن یاورؔ، عرش صہبائی اور کئی دوسرے مہمان قلم کاروں نے کشمیر میں قیام کے دوران میں شرکت کی اور اپنی تخلیقات مقامی اردو شاعروں اور ادیبوں کی نگارشات کے ساتھ پیش کیں۔

آواز ۲: آزادیٔ برِصغیر کے بعد یہاں کئی اور یادگار مشاعرے منعقد ہوئے جن میں وہ مشاعرہ اب بھی اہلِ سخن اور اصحابِ ذوق یاد کرتے ہیں جس کی صدارت کے فرائض پنڈت جواہر لال نہرو نے انجام دیئے۔ یہ مشاعرہ شیرِ کشمیر پارک (ریزیڈنسی روڈ سرینگر) کے وسیع سبزہ زار میں ۱۹۴۹ء میں آراستہ ہوا اور شاعروں میں مقامی سخن گو حضرات کے علاوہ جوش ملیح آبادی، فراقؔ گورکھپوری، روشؔ صدیقی، ساغرؔ نظامی، جگر مراد آبادی، اسرار الحق مجازؔ، وامقؔ جونپوری، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، سکندر علی وجدؔ، انورؔ صابری، ہری چند اخترؔ نے پوری رات بے شمار اہل ذوق کو اپنی غزلوں اور نظموں سے محظوظ کیا۔ اس مشاعرہ کے بارے میں بزرگ دانشور میر غلام رسول نازکی

نے کہا تھا:

میر غلام رسول نازکی :

اہلِ ذوق اور اصحابِ فہم کے اشتیاق کی وجہ سے شعرا اپنی نمائندہ غزل یا نظم سناتے رہے اور دل کھول کے داد پاتے رہے۔ پارک کے سبزہ زار، چناروں کی قطاروں اور مہکتے ہوئے پھولوں نے مشاعرے میں دلآویز رنگ بھر دیا تھا۔ اندازہ کیجئے کہ آدھی رات کے بعد تک یہ بزمِ شعر جاری رہی۔ مجال ہے کہ سامعین میں سے کوئی اٹھ کھڑا ہوتا اور اس خوشگوار ماحول کو چھوڑ جاتا۔ جب رات کا ایک بج گیا تو فراق گورکھپوری نے اپنی شہرۂ آفاق نظم "رات کا ایک بج گیا ہوگا" سنائی۔

آوازِ۲ : ایک اور مشاعرہ کچھ مدت کے بعد منعقد ہوا تھا جس میں ممتاز مقامی اردو شاعروں کے علاوہ بیرونِ ریاست سے آئے ہوئے کئی شعرائے کرام نے اپنے کلام بلاغت نظام سے سامعین کو نوازا۔ اسی مشاعرے سے دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ پہلے اسرار الحق مجاز کی ایک معروف نظم سے کچھ شعر سنئے ؎

اسرار الحق مجاز :

اب میرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو
میں نے مانا کہ تم اِک پیکرِ رعنائی ہو
چمنِ دہر میں روحِ چمن آرائی ہو
طلعتِ مہر ہو فردوس کی برنائی ہو
جنسِ مہتاب ہو گردوں سے اتر آئی ہو
مجھ سے ملنے میں اب اندیشۂ رسوائی ہے
میں نے خود اپنے کئے کی تو سزا پائی ہے

آوازع۲ : اب رئیسِ تغزّل جگرؔ مرادآبادی کی ایک غزل کے چند شعر سُنئے۔

جگرؔ مرادآبادی ؎

وہ سبزہ ننگِ چمن ہے جو لہلہا نہ سکے
وہ گُل زخمِ بہاراں جو مُسکرا نہ سکے

یہ آدمی ہے وہ پروانہ شمعِ دانش کا
جو روشنی میں رہے روشنی کو پا نہ سکے

زہے خلوصِ محبّت کہ حادثاتِ جہاں
مجھے تو کیا مرے نقشِ قدم مٹا نہ سکے

نہ جانے آہ کے ان آنسوؤں پہ کیا گزری
جو دل سے آنکھ تک آئے مژہ تک آ نہ سکے

(سازینہ —— چند سکنڈوں کیلئے)

آوازع۱ : ہم عصر کشمیری زبان کے شاعروں اور ادیبوں نے پہلے پہل اُردو میں ہی اپنی نگارشات پیش کرتے ہوئے اپنے تخلیقی عمل کا آغاز کیا تھا۔ مگر پھر انہوں نے دھیرے دھیرے اکثر و بیشتر کشمیری زبان کو ہی اظہارِ سُخن کے لئے چُنا۔

آوازع۲ : اردو بدستور سرکاری اداروں میں رائج رہی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ علاقائی زبانوں کی ترویج و تشہیر کا چلن شروع ہوا —— لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اب بھی اردو زبان اظہار، ترسیل اور تخلیق کا محبوب ذریعہ بنی ہوئی اور ریاستی اُردو سخنوروں اور ادیبوں کو وسیع تر دائرۂ قارئین اور سامعین میسر ہوا ہے۔

آواز ۱: ۱۹۵۸ء میں سرکاری طور پر ریاست میں کلچرل اکادمی قائم کی گئی۔ حالاں کہ
نجی طور پر کئی ادبی ادارے مصروفِ عمل تھے۔ ۱۹۵۳ء کے بعد حلقۂ علم و ادب
ایک فعال ادبی انجمن کی شکل میں اُبھرا۔ اس سے کچھ لوگ الگ ہوئے
تو انہوں نے حلقۂ اربابِ ذوق کی بنا ڈالی۔ اور پھر کئی دیگر ادبی انجمنیں اردو
زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لئے سرگرمِ عمل رہیں۔ اس دوران کئی اور
انجمنیں بنیں اور ماضی کا حصّہ بنتی گئیں۔ آج کل کشمیر میں زیادہ تر انجمنیں
اگرچہ کشمیری زبان کے فروغ کیلئے کام کر رہی ہیں، لیکن پھر بھی اُن
میں سے کچھ اُردو کے تئیں اپنا فرض سنبھالتے ہوئے مقدور بھر حصّہ ادا کر رہی ہے۔

آواز ۲: اُردو کی ترویج و ترقی کے لئے جموں اور کشمیر میں بڑے خلوص و اشتیاق سے
نجی ادارے سرگرمِ عمل ہیں اور بقولِ مولانا عبدالحق —— بابائے اُردو۔
(۱۹۴۰ء کے خطبے سے لیا گیا ہے):

"شاید ہندوستان کے کسی صوبے میں اُردو اِس قدر
مقبول اور رائج نہیں جس قدر کشمیر میں ہے۔"

آواز ۱: اس کے ساتھ یہ دستاویزی پروگرام ختم کرنے کی اجازت چاہتے ہیں اور
توقع کرتے ہیں کہ اُردو مختلف مراحل طے کر کے ترقی کی ضروری منزل
پا سکے گی اور ریاست میں اُردو زبان میں تخلیقی عمل بلندیوں کی سمت
لے جائے گا۔

(سازینہ پر دُھن)

جان محمد آزادؔ
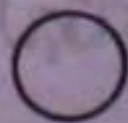
# ریاست میں صحافت کا پچاس سالہ سفر

جموں وکشمیر میں فارسی زبان سالہا سال تک ثقافتی سفیر کی حیثیت سے مقبول رہی۔ شہنشاہیت کی ترجمان اس زباں کا جلال اور وقار یہاں لگ بھگ چھ سو سال تک قائم رہا لیکن بیسویں صدی کے طلوع ہوتے ہی اس شیریں زباں کا ستارہ جموں وکشمیر کے آسمانِ ادب سے ڈوب گیا۔ اُردو زبان سرحدوں کو روندتی ہوئی آگہی کا نور بنکر ریاست میں داخل ہوئی اور اس نے یہاں کے اطراف میں دیکھتے ہی دیکھتے فارسی کی ذی شان جانشیں کا رتبہ حاصل کرلیا۔

کُہر زدہ ماہ وسال میں ایک نئے ادبی عہد کی کرنیں پھوٹنے لگیں۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ۱۸۵۶ء میں ہی نئے رجحانات کی دستک سنی تھی۔ آپ نے "بدیا بلاس" جاری کر کے ریاست میں اُردو کی صحافت کا باقاعدہ آغاز کیا۔ درباروں کے سائے میں پروان چڑھنے والا یہ ہفت روزہ آٹھ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس کے دائیں کالم پر اُردو زبان اور رسم الخط کا استعمال ہوتا تھا جبکہ اس کے بائیں کالم پر دیوناگری رسم الخط میں خبریں تحریر ہوتی تھیں۔

---

* آروٹ رفتح کدل سرینگر

وہ مطلق انسانیت کا تاریک ترین دور تھا۔ ریاست میں تحریر و تقریر کی آزادی مفقود تھی۔ صحافت کی صلاحیت اور اس کا جنون رکھنے والے بعض ریاستی باشندے ہجرت کر کے ملک کے مختلف حصوں سے اخبارات جاری کرتے رہے۔ لاہور ایسے پُرجوش عاشقوں کی محبوب منزل ہوتی تھی۔ اخبار عام، خیر خواہ کشمیر، غنچہ کشمیر، گلشنِ کشمیر، مراسلہ کشمیر، کشمیر پرکاش، کشمیر درپن، کشمیری گزٹ، کشمیری مخزن، صبحِ کشمیر، سفیر کشمیر، بہار کشمیر، کشمیر اور کشمیری مسلمان جیسے اخبارات میں ریاستی معاملات پر خوب بحث ہوتی تھی لیکن بامعنی صحیفہ نگاری کی ابتدا لالہ ملک راج صراف کے "رنبیر" سے شروع ہوئی۔ صراف نے ریاست کی اردو صحافت کو ہجرتوں کے کہرے سے نجات دلانے کا مستحسن فریضہ انجام دیا۔ ۱۹۲۴ء میں اس اخبار کے جاری ہونے سے مکتب صحافت کو استحکام حاصل ہوا۔ رنبیر کی پالیسی حکومت نواز تھی یہ ویسے بھی حکومت پر تنقید کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا تاہم یہ کبھی کبھی حکومت پر نہایت لطیف انداز سے تنقید بھی کیا کرتا تھا۔ رنبیر بھلے ہی اہلِ سیاست کے لئے پانی پت کا میدان ثابت نہ ہوا ہو تاہم اس کے طفیل نوخیز زبان کو اظہار و ابلاغ کو وسیع امکانات اجاگر کرنے کا موقع ملا۔ اس کے ادبی دبستان کو چند برسوں میں ہی ملک گیر حیثیت حاصل ہوئی۔ ادھر کشمیر میں پریم ناتھ بزاز نے وتستا اور پھر ہمدرد جاری کر کے صحافت میں ایک جہت ساز تبدیلی کی سعادت حاصل کر لی۔ ان کے صحافتی معرکوں کی جھنکار بہت دیر تک اور بہت دور تک سنائی دیتی رہی۔ لفظی معجزات کے سچے پارکھ محمد علی جناحؒ نے ۱۹۴۴ء میں بزاز کے ہمدرد کا تذکرہ کرتے ہوئے یہاں تک کہا "میں ہمدرد کو ٹائمز لندن کی قبیل کا اخبار سمجھتا ہوں" یہ بزاز کی صحافتی خدمات کا زبردست اعتراف تھا۔

۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے بعد ریاست جموں و کشمیر کی صحافت سیاست

کے دلدل میں پھنس کے رہ گئی۔ سیاست معاشرے کا سب سے طاقتور شعبہ قرار دیا گیا۔ صحافت کے لئے یہ ساعتیں نہایت سفاک تھیں۔ قلم کے شجاع صحافت کے نقش پائے جستجو میں ٹوٹ پھوٹ کے رہ گئے۔ وُلر کے گہر منتشر ہو گئے۔ وقت نے اُن کے ہار کا دھاگا کاٹ دیا۔ سارے موتی بکھر گئے۔ گو فضا میں ابھی مولانا محمد سعید مسعودی، پنڈت کیشپ بندھو، نرسنگھ داس نرگس اور اللہ رکھا ساغر جیسے سخت کوش اور نثریت پر خلاقانہ گرفت رکھنے والے زیرک ناقدین کی دلکش پھلجھڑیاں جگمگا رہی تھیں۔ تاہم بابِ عظمت کے اِن آخری اوراق کی درخشندگی بتدریج دُھندلاتی رہی۔ رات سنگین تھی سفر سنگلاخ پتھریلا اور بے ثمر تھا۔ اس طویل اور دل آزار سفر میں صحافت کبھی کبھی محض نعرہ بازی اور تشہیر و ترغیب کا ذریعہ بن کر رہ گئی۔ صحافیانہ عجلت پسندی کے اِس غالب رجحان نے اصول اور دلیل سے انحراف کر کے تعمیل و تسلیم کو اپنا معیار بنایا۔

مارتنڈ ۱۹۳۵ء کے آس پاس جاری ہوا تھا لیکن یہ لگ بھگ تین دہائیوں تک ریاست میں اُردو صحافت کی مشعل فروزاں رکھنے میں کامیاب رہا۔ اس کے صفحات پر برسہا برس تک سیاسی مناظر و معاشرتی مظاہر ڈوبتے ابھرتے رہے۔ یہ حالات و واقعات کو ایک خاص مکتبِ فکر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ مارتنڈ کے بعض ضخیم اور شاندار نمبر اُس زمانے کے فکری موسم کی توانائیاں سمیٹے ہوتے ہیں۔ مارتنڈ کا معاصر "دیش" بھی لگ بھگ اکتیس سال تک مسلسل شائع ہوتا رہا۔ کیشپ بندھو کے بعد گنگا دھر دیہاتی اس کی ادارت کرتے رہے۔ ادھر خواجہ صدر الدین مجاہد دہقان کے بند ہونے کے بعد اخبار خالد نکالنے لگے جو ۱۹۳۸ء سے ۱۹۵۳ء لگ بھگ پندرہ سال تک شائع ہوتا رہا۔ اس دوران آپ نے "خدمت" جاری کیا لیکن بعد میں آپ نے اسے غلام رسول عارف نے نام منتقل کیا۔ عارف

نے کئی ماہ بعد خدمت نیشنل کانفرنس کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

یہی ایام تھے جب جھلستے صحرا میں نند لال واتل کاغذ کے سائبان تلے شیشے کے کنول اُگانے لگے۔ خدمت، واتل صاحب کی ادارت میں برسہا برس تک پابندی سے شائع ہوتا رہا۔ کلاسیکی طرزِ اظہار کے ساتھ احتیاط و اعتدال آپ کا شعار رہا۔ آپ افعال کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند کرتے تو اُس کے اظہار میں بھی خلوص و شائستگی کو ملحوظ رکھتے۔ جہانگیر، وکیل، نور، خالد جدید، ذوالفقار، مسلم، رہبر، روشنی، کشمیر، جیوتی، اپ لفٹ، اپنا سنسار، نئی لہر، جمہور، پیام انقلاب، مشعل اور الحق کے علاوہ البرق اُس دور کے بعض اہم اخبار تھے۔ البرق کے ایم اے صابر کی تحریریں تیر و نشتر لیے ہوتی تھیں۔ ایسی تحریریں اُن ایام میں بہت کم پڑھنے کو ملتی تھیں۔ بعض اخبارات کی تحریریں روکھے پھیکے بے رنگ انداز میں لکھی جاتی تھیں۔ بعض مہربان تو سُرخی لگانے اور مجمع جمانے کے ہتھکنڈے کو ہی صحافت سمجھتے تھے۔ روشنی کے مدیر عبدالعزیز نے اپنے اخبار کو ہر بلند و پست میں زندہ رکھا۔ ۱۹۵۳ء کے دوران اِس اخبار کے کئی یادگار نمبر شائع ہوئے۔

۱۹۵۳ء کے بعد صحافت کا سفر انتشار اور افتراق کی راہوں میں بھٹکتا رہا۔ معروف صحافی موہن چراغی اپنی کتاب 'برف میں آگ' کے ابتدائی صفحات میں اُن ایام کی یادیں تازہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نئے ان پڑھ اور جاہل صحافیوں نے سرکردہ کشمیری صحافیوں کا دامن پکڑ لیا اور اُن کی انگلی تھام کر رینگنے لگے۔ گدھوں کے ہاں شادی تھی اونٹ براتی تھے محفل سج گئی!"

اسی ہجوم تیرہ شبی میں آفتاب طلوع ہوا۔ یہ گویا تمنا کی تکمیل تھی۔ آفتاب کی شعاعوں سے اُردو کے قارئین کو تازگی تنوع اور تازہ کاری کا احساس ہوا۔ ۱۹۵۸ء

میں آفتاب کے منظر عام پر آنے کے ساتھ ہی یہ اخبار وقت کا ساز و آواز بن کر دلوں کے تار چھیڑنے لگا۔ صحافت پر اب تک جو خوف کا غلبہ تھا وہ اس سے نکل آئی۔ آفتاب کے مدیر خواجہ ثناء اللہ بٹ اپنی غیر رسمی سلاست اور پُر قوت عبارت سے قارئین میں مقبولیت اور اعتباریت حاصل کرنے لگے۔ "خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے" کے طنزیہ کلام اور اُس کے شوخ رنگوں نے رنگِ فصاحت کو اور بھی نکھار بخشا۔ اُدھر غلام رسول عارف نے روزنامہ ہمدرد کی تجدید کی۔

اس سے قبل ۱۰ مئی ۱۹۵۰ء کو رنبیر ۲۶ سال کے بعد بند ہو گیا تھا۔ یہ بلاشبہ ریاست میں اُردو صحافت کے لئے نہایت آزمائش کی گھڑی تھی۔ اس کے بعد جموں سے امر، وطن، پربھات، گلاب، شمشیر، نیا کشمیر، سویرا، دیش سیوک، نیا سماج، لوک راج، انقلاب، نوائے قوم، اُجالا، شیر ڈُگر، نوائے ڈُگر، مساوات اور سچ شائع ہونے لگے۔ سچ کو بنیادی طور راجہ محمد اکبر خان نے جاری کیا تھا لیکن پھر تر لوک چند اس کے مدیر بنے۔ چاند بھی سچ ہی کی طرح جموں سے شائع ہونے والا ایک معیاری پرچہ تھا۔ ممتاز ادیب نرسنگھ داس نرگس برسوں تک اس کی ادارت مستحسن طریقے پر انجام دیتے رہے۔ موہن یاور جیسے ایک اور صاحب طرز ادیب نے جموں سے روزنامہ سندیش نکالا۔ بعد میں روزنامہ رفتار بھی آپ کی ادبی صحافت کا غماز رہا۔ آزاد، ادبی صحافت کی ایک اور سوغات تھی۔ یہ ماہوار ادبی جریدہ بدری ناتھ کول نے ۱۹۵۳ء میں جاری کیا تھا۔ اس جریدے میں منتشر ادبی شیرازہ کو منظم کرنے کی کوشش کی گئی۔ فن کار ایک اور پندرہ روزہ جریدہ تھا۔ اُدھر پونچھ کی اُردو خیز سرزمین نے مسلسل کئی مقتدر صحافی پیدا کئے۔ پربھات اور المجاہد یہاں کے دو معروف اخبار ہیں۔ بعد میں سورن کوٹ سے ایک اور اخبار نکالا گیا۔

یہ اخبار ستاروں کے آگے' ایوب شبنم کی ادارت میں برسوں تک نکلتا رہا۔
ادھر موتی لال مصری نے غلام محمد صادق' ڈی پی در اور سید میر قاسم کی معاونت سے ہفت روزہ کشمیر جاری کیا۔ میر غلام محمد راجپوری نے ۱۹۵۵ء کے اُن ہی ایام کے دوران جہان نو جاری کیا۔ سٹیٹ سنٹرل لیبر یونین کا ترجمان روزنامہ مزدور نو واردانِ صحافت کی تجربہ گاہ بنا۔ اس اخبار کے کالموں میں قارئین نے پہلی بار مقبول حسین اور صوفی محی الدین جیسے نوخیز قلم کاروں کی تحریروں کو پڑھا۔ رہنما' دہقان' کشمیر سماچار' نوائے قوم' لوک سندیش' نوائے ڈوگر' اکالی یودھا' خورشید' جموں پتریکا' رنجیت اور گاندھی مشن اُس دور کے بعض دوسرے اخبار رہے۔ ان میں سے بیشتر کسی ہنگامی اور وقتی مصلحت کے تحت نکالے گئے تھے۔ ان کی اشاعت میں ایک بے تاب مقصدیت کار فرما تھی۔ بعض اخبار حکومتِ وقت کے حاشیہ بردار بن کر بے روح تھکا دینے والی تحریروں سے اپنے روزناموں کا پیٹ بھرنے کے جتن کرتے تھے۔ پھر ۱۹۶۶ء میں ریاست میں مرکزی پریس ایکٹ کے نفاذ سے صورتحال میں قدرے بہتری محسوس کی جانے لگی۔ اب صحافت کا سفر ایک نئے پڑاو پہ تھا۔ یہاں قلم ہاتھ میں لئے ایک بندۂ گستاخ کھڑا تھا جس نے برسوں کے منجمد لاوے کو پگھلا کر مضامینِ نو کے انبار لگا دیئے۔!
یہ بت شکن شمیم احمد شمیم تھا جس نے ہفت روزہ آئینہ کو منظر عام پر لا کر وظیفہ خوار مدیروں اور شاطر سیاست دانوں کی نیندیں حرام کر کے رکھ دیں۔ آئینہ کے اجراء کے ساتھ ہی شمیم نے جہاں وقت کے ساتھ ایک انتھک جنگ کا آغاز کیا وہاں اُس نے اُردو صحافت کو بازیچہ اطفال کے تماشوں سے بھی نجات دلائی۔ اُس کا انداز محض صحافیانہ نہیں تھا بلکہ وہ اپنے عہد کی اصل روح کو پہچان کر اسے اپنی تحریروں میں بقائے دوام بخشتا وہ اپنے اخبار میں برسوں تک چراغ بیگ

کا جو کالم تحریر کرتا رہا وہ کسی لحاظ سے محض اخباری کالم نہیں تھا۔ اس کی حیثیت ایک ادب پارے سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ اس میں اس دور کی سیاسیات اور سماجیات اپنی تمام تر عریانی کے ساتھ نظر آتی ہے۔ اس اخبار کی تحریروں کے ہر لفظ سے وہ عہد، اس کا ہر لمحہ صاف جھانکتا دیکھائی دیتا ہے۔ شمیم کا لہجہ نشتر کی طرح کاٹتا ہے اُس کے لفظ کانٹوں کی طرح چبھتے ہیں۔ ان شوخ اور بے ساختہ تحریروں نے آئینہ کو قارئین کے وسیع حلقوں میں اعتماد اور اعتبار بخشا چنانچہ یہ اسی بے پناہ مقبولیت کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۷۵ء میں آئینہ روزنامے کی صورت میں سامنے آیا۔ اُردو کے مقتدر ناقد محمد یوسف ٹینگ شمیم کے ساتھ اپنی آشنائی کے ان ماہ و سال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اُن کی تحریر کی خوشبو اس طرح آہستہ آہستہ کھلتی تھی کہ جب صبح کو اخبار طباعت کی بھٹی سے نکل کر میرے ہاتھوں میں آجاتا تو میں حیران رہ جاتا تھا۔ یہ بات جیسے سچی لگتی ہی نہ تھی کہ یہ اخبار ہمارے دور افتادہ شہر سے نکلتا ہے اس کی میٹھی اور کڑوی کراری اور کسیلی شوخ و خستہ CRISP اور برجستہ تحریریں پڑھکر مجھے اپنے اوپر رشک آنے لگتا کہ برصغیر کے دوسرے شہروں کے اخبار بھی اتنے تیز و طرار طوفان بدوش اور شرربار اخبار سے اپنی آنکھوں اور ذہنوں کی ضیافت نہیں کرسکتے۔"

شمیم احمد شمیم اور محمد یوسف ٹینگ جیسے معتبر اور ممتاز ادبی سورماؤں کی ادارت میں ماہنامہ تعمیر کی باز یافت ہوئی تھی۔ ان اصحاب کے افکار و عقاید نے اس رسالے کے وقار کو چار چاند لگائے اور اس کی نگارشات کو ملک کے اطراف و اکناف میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس رسالے کے کئی خاص نمبر آج بھی

لوگوں کے اذہان میں شگفتہ ہیں جیسے مہجور نمبر، آزاد نمبر اور جموں وکشمیر میں اُردو ادب نمبر جواب سند اور حوالے کی دستاویزات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شیرازہ کا طلوع اور اس کا ارتقا ملک میں اُردو ادب کی پیش رفت کے لئے نہایت خجستہ ثابت ہوا۔ ریاستی کلچرل اکادمی میں سیکرٹری کے عہدے پر متعین ہونے سے قبل محمد یوسف ٹینگ ۱۹۷۳ء سے قبل تک شیرازہ کے ایڈیٹر رہے۔ یہ وابستگی اُردو کے ساتھ اُن کے پیہم جواں عشق کی ایک منہ بولتی تصویر ہے۔ چنانچہ اس رسالے کے متعدد خاص نمبر ٹینگ صاحب کی بے پناہ عرق ریزی کے عدیم المثال نمونے ہیں۔ ثقافت نمبر اور کئی یادگار نمبروں کی اہمیت مسلّمہ ہے۔ ٹینگ صاحب کے بعد جناب رشید نازکی نے شیرازہ کی ادارت سنبھالی اور پچھلے پندرہ سولہ سال سے یہ محمد احمد اندرابی کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ آپ نے مصور خبرنامہ اکادمی بھی جاری کیا۔ اس مستحسن کاوش کا سلیقہ اور فنی اسلوب ادبی حلقوں میں سراہا جاتا رہا۔ اپریل ۱۹۷۵ء میں آپ کو ناظم اطلاعات مقرر کیا گیا۔ آپ نے تعمیر کو برسوں بعد پھر جاری کیا۔ کشمیر ٹوڈے بھی شائع ہونے لگا۔ آپ کی نگرانی میں یہ ڈوبے ہوئے تارے ایک بار پھر پوری آب وتاب سے آسمان صحافت پر چمکنے لگے۔ پندرہ روزہ مکتوب میں سیاسیات کے علاوہ ادبی اور ثقافتی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ جموں سے سنگم، نور، چھم چھم، دھنک اور ادبیات نام کے رسائل ادبی حلقوں میں مقبول تھے۔ وید بھسین اور فاروق مظفر نے درجنوں نئے قلم کار متعارف کئے۔

اس عرصہ میں بھی کئی یادگار خصوصی شمارے شائع ہو چکے ہیں جن میں عجائبات نمبر، اقبال نمبر، مہجور نمبر، پریم چند نمبر، لل دید نمبر، مغل اور کشمیر نمبر، شاہ ہمدان نمبر، اور صوفیانہ موسیقی نمبر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۹۷۰ء کے آس پاس جو دوسرے اخبارات جاری ہوئے اُن میں غلام نبی خیالؔ کا اقبال، رشید تاثیر کا ہفت روزہ محافظ، عبدالرحمٰن آزاد کا ہفت روزہ چشمۂ حیات، طاہر ہمدانی کا ہفت روزہ نیا دور، جی ایم ڈار کا ڈاکٹر، شیخ تجمل الاسلام کا شاہی ٹائمز، فاروق اندرابی کا انڈین ٹائمز، بشیر نوشاد کا مارننگ ٹائمز، عبدالرحمٰن میر کا سرینگر ایکسپریس، نذیر احمد کا جہلم اور عبدالعزیز کا روشنی قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے بیشتر دشتِ طلب میں دو گام تک راہنمائی کے بعد صحرائے وقت کے ریگ زاروں میں کھو گئے۔ بعض ڈوبتے ہوئے سورج ہیں لیکن بعض شجرِ صحافت کو اپنے خونِ جگر سے سینچنے کا عزم پیہم جواں رکھے ہوئے ہیں۔ صوفی غلام محمد صحافت کے ایک ایسے ہی امین ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں روزنامہ سرینگر ٹائمز کے منظرِ عام پر آنے کے ساتھ ریاست میں اُردو صحافت کو ایک نئی جہت حاصل ہوئی" اس اخبار کے کارٹونسٹ بشیر احمد بشیر محض چند خفیف لکیروں سے جذبات اور واقعات کی فنکارانہ عکاسی کرنے لگے۔ یہ مصوّر مزاح کا انداز قارئین میں بے حد مقبول رہا۔ صوفی محی الدین کے تحریر کردہ کالم خبر کو افکار و اقدار کی نئی کائنات سے روشناس کرنے لگے۔ ان تحریروں میں ایک تخلیقی کالم نویس کے خونِ جگر کی نقش گری جھلکتی ہے۔

اس دوران جموں سے جو نئے اخبارات جاری ہوئے اُن میں "عوامی دور" امتیازی خصوصیت رکھتا ہے۔ اس اخبار کے جو ضخیم اور یادگار نمبر قابلِ ذکر ہیں اُن میں شیخ محمد عبداللہ نمبر اس لحاظ سے قابلِ ستائش ہے کیونکہ اسکی کتابت و طباعت کا معیار جموں کے دوسرے پرچوں سے بہتر تھا۔ ناقدین نے اسے محاذ کے شیرِ کشمیر نمبر کی سستی نقل قرار دیا۔ یہ نمبر خیالؔ صاحب اور اُن کے بعض رفقا کی ادارت میں شائع ہوا تھا اور اس نے ریاست میں اُردو صحافت کو معیار و میزان کی نئی بلندیاں بخشی تھیں۔ دریں اثنا محاذ، حرّیت، ہمدرد، رہبر اور زمیندار کی اشاعت پر

پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ جو دوسرے اخبار جموں سے شائع ہوتے لگے ان میں بے تاب جے پوری کا فروغ وطن اور نند گوپال باوا کا عوامی لہر بھی شامل ہیں۔ پیغام، عوامی عدالت، دیہاتی سماچار، جدوجہد، تسکین اور البیان اُس دور کے بعض دیگر اخبارات ہیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ریاست جموں وکشمیر میں اخبارات کے ساتھ رسائل وجرائد بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ یہ سلسلہ زنبیر اور رتن نے شروع کیا تھا۔ پھر پریم اور فردوس نے ریاست میں اُردو کے دبستان کو معرض وجود میں لاتے کے لئے ناقابل فراموش رول ادا کیا تھا۔ یہ رسائل ایک چوتھائی صدی تک اُردو کا ادبی مزاج بنانے اور اسے نکھارنے میں انتھک کوششیں کرتے رہے۔ پھر برسوں بعد سرینگر کے روزنامہ آفتاب نے نئے قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کی چنانچہ اس کے ادبی صفحات پر دور دراز علاقوں کے ادیب اور شاعر دھندلکوں سے نکل کر آسمان ادب پر جگمگانے لگے۔ آفتاب اپنی ضیاپوش کرنیں بکھیرتا اردو کا ادبی مزاج تشکیل دینے میں اپنا تعمیری رول ادا کرتا رہا۔ اس دوران جو دوسرے ادبی اور تعلیمی پرچے شائع ہوئے اُن میں اعظم انقلابی کا وحدت، سید علی گیلانی کا طلوع، سید قاسم شاہ بخاری کا حنفی، مفتی جلال الدین کا اولیا، سید وجیہہ احمد اندرابی کا ہدایت، محمد فاروق رحمانی کا افلاک، بشیر بن قاسم کا نقشبند، مولانا محمد فاروق کا نصرت الاسلام، فہمیدہ بیگم کا خاتون، وحشی سعید ساحل کا نگینہ، موہن یاور کا سنگم، اقبال عظیم کا گوجر دیس، مولانا عباس انصاری کا سفینہ، میر غلام رسول نازکی کا تعلیم جدید، وید راہی کا سویرا، امین کامل کا وادی، آغا سید یوسف الموسوی کا الارشاد، قاری سیف الدین کا شہادت، غلام الدین گافی کا سنطور، غلام حسن بیگ عارف کا کاروان، تارا چند کا امرت اور نند گوپال باوا کا نوری چھم، خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ یہ سبھی رسائل اپنے اپنے مکتب فکر کے ترجمان بن کر اردو ادب کی خدمت کا فریضہ انجام دیتے

رہے۔ ہفت روزہ ترجمان الحق بھی اپنے مخصوص مکتبِ فکر کے قارئین میں دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔ علمی اور دینی مزاج کے اس ہفت روزہ کے چند خاص نمبر آج بھی یاد کئے جاتے ہیں۔

شیخ محمد عبداللہ اور شریمتی اندرا گاندھی میں "ایکارڈ" کے بعد ریاست میں صحافت کا سفر ایک اور تجرباتی مرحلے سے دوچار ہوا۔ اس دور کے آس پاس جو اخبارات منظرِ عام پر آئے اُن میں ہفت روزہ کنواس، رائے، مادرِ کشمیر، میر کاروان، امر، سرینگر نیوز، کوہ ہمالیہ، پربت، برگ سبز، اور عقاب بھی شامل ہیں۔

روزنامہ نوائے صبح طارق عبداللہ اور غلام محمد شاہ نے سرینگر سے جاری کیا۔ یہ اخبار نیشنل کانفرنس کے مؤقف کی تبلیغ کرتا تھا۔ پہلے دور میں اس کی ادارت طاہر مضطر نے کی، بعد میں کچھ دیر تک غلام نبی رتن پوری بھی یہ فرائض انجام دینے کی کوشش کرتے رہے لیکن وہ ایک تنظیمی اخبار کی میکانکیت کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس دوران اخبار کا شیر کشمیر نمبر اور یوم شہدا نمبر شائع ہو کر اپنے حلقہ قارئین میں پسند کئے گئے۔ مقامی اخبارات اب آفسیٹ کی جدید طباعت سے استفادہ کرنے لگے۔ طاہر مضطر نے اپنے ہفت روزہ پولیٹیکل ٹائمز کا فاروق عبداللہ نمبر نکالا جو نہایت جاذبِ نظر تھا۔ نئے انقلاب کی دستک کے ساتھ جو دوسرے روزنامے سامنے آئے، اُن میں عبدالرشید ہلال کا ہلالِ نو، قاسم سجاد کا شہاب نکے علاوہ جے کے پوسٹ، تجلی، علمدار، شاہین، صحافی، کشمیر نما، اخبارِ کشمیر، دورِ جدید، الرجال، شہمیر اور نوائے قوم قابلِ ذکر ہیں۔ اِن کے علاوہ جو ادبی پرچے اور ماہنامے جاری ہوئے اُن میں کوثر سلطانہ کا لالۂ صحرا، ٹاک زینہ گیری کا گلشنِ کشمیر، الطاف حسین کا نصرۃ الاسلام، زاہد مختار کا لفظ لفظ، اقبال فہیم کا "لا" ظفر فاروق صلاتی کا قاشیں، قاضی نثار صاحب کا اسلام آباد، سلام الدین کا ظہورِ اسلام، غلام نبی شاہ نورانی کا تبلیغ الاسلام، محمد یٰسین ہمدانی کا ہمدان، راجہ

نذر بونیاری کا عقاب، اعجاز رسول کا فن کار، پیر غیاث الدین کا علم و دانش اور عبدالرشید شاہین کا سیر بین اپنے اپنے انداز سے ترسیل و ابلاغ کا فریضہ انجام دیتے رہے۔

جموں سے بھی بعض نئے راہ روان صحافت میدانِ عمل میں کود پڑے۔ بے کفن جنازہ، پسماندہ عوام، دیدار، لوگوں کے حقوق، لازوال، راجوری ٹائمز، ضمیر خلایق، مادرِ ہند، نوائے جموں اور پونچھ وادی ایسے بعض اخبارات ہیں جو ۱۹۸۰ء کے آس پاس صوبۂ جموں سے جاری ہوئے۔ یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ صحافت کا سفر اب ایسے مقام پر آگیا تھا جہاں تحریر سے زیادہ صحافی کا نام سکہ رائج الوقت سمجھا جاتا تھا۔ تاہم بعض رسائل کے ہمائے ہمت برابر محوِ پرواز رہے اور انہوں نے اپنے معیار و میزان کے ساتھ اکثر سمجھوتہ نہیں کیا۔ کلچرل اکیڈمی کا ترجمان "شیرازہ" اس دور میں بھی اپنا امتیاز برقرار رکھ کر ادبی صحافت کی نئی منزلیں سر کرتا رہا۔ محمد یوسف ٹینگ کے بعد رشید نازکی اور پھر محمد احمد اندرابی کی قابلِ قدر ادارت میں اس رسالے کے متعدد یادگار نمبر شائع ہوئے جن کی ترتیب و تہذیب میں خونِ جگر کی نقش گری شامل رہی ہے۔

جن دیگر سرکاری پرچوں کی اشاعت ہوئی اُن میں محکمہ ہینڈی کرافٹس کا نقش بھی شامل ہے جو محمد رفیع شائع کرتے تھے۔ شاہد بڈگامی کی ادارت میں ماہنامہ صنعت و حرفت نکلتا تھا۔ اس کا کُل ہند مجلس ادب نمبر آج بھی یاد کیا جاتا ہے۔ محکمہ اطلاعات کا رسالہ تعمیر اب تیسرے دور میں آکر خالد بشیر کی ادارت میں شائع ہونے لگا۔ اس دور میں رسالہ نئی جہتوں سے ہم کنار ہوا۔ اس کا مہجور نمبر اور اردو ادب نمبر دبستانِ ادب کے طلبہ کے لئے سوغات کا درجہ رکھتے ہیں۔ اُدھر شمیم کے بے مثال قلمی جہاد کے بعد ظفر معراج نے آئینہ کے کئی یادگار نمبر شائع کئے۔ امداد ساقی نے دبستان کے ادبی نمبر نہایت عرق ریزی سے ترتیب دئے۔ جی ایم ڈار نے پرواز قریشی کے سرگرم تعاون

سے روزنامہ ڈلر کے کئی ضخیم اور کامیاب نمبر نکالے۔

یہی پڑاو تھا جب صحافت کو یوسف جمیل، طاہر محی الدین، وجیہہ احمد اندرابی، منظور انجم، معرفت قادری، نسرین نقاش اور جوہر قدوسی جیسے نوخیز قلمکار نصیب ہوئے۔ یہ اردو صحافت میں ایک نئی زبان کی تخلیق کا دور تھا۔ قارئین اِسے غیر جذباتی علمی نثر کی تولید سے تعبیر کرنے لگے۔ صحافت ان تحریروں کے طفیل تغیرات سے روشناس ہونے لگی۔ خطابت، شخصیت نگاری اور واعظانہ تلقین داستان پارینہ ہوگئے۔ ان شیش محلوں پر پہلا پتھر وجیہہ احمد اندرابی اور طاہر محی الدین نے اس وقت پھینکا جب انہوں نے اپنا ہفت روزہ چٹان جاری کیا یہ اخبار اوائل ہی سے آفسیٹ پر طبع ہوتا رہا، مواد اور معیار کے لحاظ سے یہ اُس نئے شعور کی ترجمانی کر رہا تھا جسمیں صحافی پر زبردست ذمہ داری عائد کی جاتی ہے اُسے اپنی آنکھوں کو خوردبین کے طور استعمال کرنا ہوتا ہے، اُسے گویا سمندر کی تہہ سے موتی نکالنا ہوتا ہے وہ ہر طریقے سے سچائی کا متلاشی رہتا ہے۔ چٹان نے صحافت کے سفر میں شامل ہونے والے باکمال افواہ بازوں پر ہزاروں من مٹی ڈال دی اور صحافت کے نخلستان میں نئے لالہ و گل کھلائے۔ یہ ایک ایسا چمن ہے جس کی شگفتگی پر کہنگی کا کوئی سایہ نہیں۔ طاہر محی الدین کی تحریروں میں انفرادیت کی مہک روش روش خوشبوئیں پھیلاتی رہی ہے، اِن تحریروں میں صحافیانہ عجلت پسندی نظر نہیں آتی ان میں عصر حاضر کا ہر لمحہ جھانکتا رہتا ہے۔ حالات و واقعات یہاں بلا کم و کاست اپنے حقیقی رنگ میں نظر آتے ہیں۔ محمد شعبان وکیل طاہر محی الدین کے ہمعصر رہے۔ آپ نے الصفا فورم کے تطہیری جہاد سے اخبار نویسی کی دنیا میں قدم رکھا۔ روزنامہ الصفا کے جاری ہوتے کے ساتھ ہی ریاست کے صحافتی حلقوں میں تہلکہ مچ گیا۔ میدانِ صحافت کے اس منفرد جانباز نے الصفا نیوز کو نہایت قلیل وقت میں ریاست کا مقبول ترین روزنامہ بنایا۔ انہوں نے اسٹیبلشمنٹ

(ESTABLISHMENT) کے قصیدہ خوان معاصرین کو بھی جھنجھوڑ کے رکھ دیا شعبان صاحب ایک بے رحم جراح کی طرح معاشرے کے مریض جسم پر اپنے قلم کے نشتر چلاتے رہے۔ اُن کی شہادت کا سانحہ ایوانِ صحافت کے یارانِ نکتہ داں برس ہا برس تک فراموش نہیں کر پائیں گے۔ کہنہ مشق صحافی غلام نبی شیدا اسی زمانے میں وادی کی آواز، اپنے عہد کی آواز بنانے کے لئے صحافت کے سفر میں نہایت عزم سے شامل ہوئے۔ آپ کا روزنامہ صداقت کی تفسیر اپنے مخصوص انداز میں رقم کرتا رہا۔ کئی برسوں کی اشاعت کے بعد یہ روزنامہ وقت کی سنگلاخیت سے کرب و بلا میں مبتلا ہو کر وقتی طور نظروں سے اوجھل ہوا۔ محمد یوسف قادری نے اپنے ہفت روزہ آفاق کو روزنامہ بنایا۔ اِسکے صفحات پر قلم کے شجاع اپنی تحریروں کی توانا لہر لیکر اُٹھے اور اپنی پُر قوت عبارت سے ترسیل و ابلاغ کا فریضہ انجام دیتے رہے۔

یہی ایام تھے جب موہن چراغی آندھی طوفان کی طرح کاروانِ صحافت میں شامل ہوئے۔ یہ شمولیت نئی نہیں تھی اِس دشت کی سیاحی میں ان کی عمر کا بڑا حصہ گزر گیا تھا۔ روزنامہ آئینہ کے بعد یہ کانگریس پارٹی کے ترجمان قومی آواز کی ادارت انجام دیتے رہے تھے لیکن اب یہ قومی سطح کے اس اخبار کو سرینگر سے شائع کرنے کا عزم لیکر آگے بڑھے تھے۔ اظہار و ابلاغ کی اُمنگ اور تڑپ موہن چراغی کے وجود میں طوفان کی طرح بپھر رہی تھی، ان کی پشت پر ملک کی ایک بڑی سیاسی تنظیم تھی۔ اس طرح ریاست کی اردو صحافت کی تاریخ میں پہلی بار وُسعت یاب اور جدید ترین سہولیات سے آراستہ روزنامہ جاری ہوا لیکن موہن چراغی کی تیکھی اور تیز و طرار نثر کا یہ قافلہ آگے بڑھنے سے پہلے ہی وقت کے صحرا میں معدوم ہو گیا۔

جوہر قدوسی نے مسعود اور راہی کے ہمراہ تکبیر نو جاری کیا۔ اصلاح و فلاح کا یہ ترجمان ماہنامہ ہر لحاظ سے معیاری تھا، اس کے لب و لہجہ میں طہارت و تازگی تھی۔ یہ

جنس و جرائم کے واقعات کی مبالغہ آمیز خبروں سے اجتناب کرتا تھا۔ اس کے مضامین خبر کے پس پردہ دلآویزیوں اور سیاہ کاریوں کی ساری داستان سناتے تھے۔ تکبیر نو اپنا توازن اور تناسب برقرار نہیں رکھ سکا اور اپنے مدیران کے اختلافات کا شکار ہو کر گرد راہ بن کر رہ گیا۔ اُدھر نسرین نقاش نے ۱۹۸۶ء کے اُن ہی ایام کے دوران اپنا ماہنامہ سر کتا آنچل جاری کیا۔ اس شاعرانہ مزاج کی نرم و نازک خاتون نے بادِ مخالف کی تیز و تند آندھیوں کے باوجود یہ چراغ جلائے رکھا۔ نسرین نقاش نے ہمالیائی ہمت بنکر اپنے ادبی ماہنامے کے کئی ضخیم نمبر شائع کئے۔ ان تحریروں کی عجلت پسندی کو غالباً سر کتا آنچل کی ایک مجبوری بھی قرار دیا جاسکتا ہے تاہم یہ جموں و کشمیر میں اُردو کی ادبی صحافت کے لئے ایک بجلی کا کوندا تھا اس قوس قزح کے رنگوں سے مزین ماہنامے سے گرد و پیش کے منظر اچانک روشن ہو جاتے تھے۔

عرصہ دراز سے ریاست کے تعلیمی اداروں سے میگزین شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان میں باز یافت، پرتاپ، لالہ رُخ، پمپوش، کاروان، ہی مال، کوشر ناگ، زون اور بادام واری قابل ذکر ہیں۔ گزشتہ برسوں کے دوران کئی ایک روزنامے منظر عام پر آئے ہیں، ان میں منظور انجم کا عقاب اور عبد الرشید کا ندائے مشرق قابلِ ذکر ہیں۔ رودادِ جہاں بھی ایک اہم روزنامے کی حیثیت سے اُبھرا ہے۔ اسی طرح حکیم منظور اور وجیہہ احمد اندرابی اپنے ہفت روزے "خبر و نظر" اور "جرأت" جاری رکھے ہوئے ہیں منظور انجم بظاہر ایک معمولی سی خبر کو افکار و اقدار کی نئی کائنات سے آشنا کرتے ہیں۔ آپ کا تحریر کردہ اداریہ لامحدود حقیقت کو محدود الفاظ میں اسیر کر کے اسے گویا بقائے دوام بخشتا ہے لیکن اُردو صحافت کے تئیں غفلت شعاری کی شعاعیں برف پوش ڈھلانوں پر اُبھرنے والے ان نقوش کو معدوم کر رکھ دیں گی۔ ریاست سے اس وقت لگ بھگ پچاس روزنامے شائع ہو رہے ہیں لیکن یہ تعداد محض مقدار کے لحاظ سے ہے۔ معیار کے ہر لحاظ سے

اردو صحافت اپنی آخری ہچکیاں لے رہی ہے۔ اُردو اخبارات اپنی بے کیف یکسانیت اور ذاتی عافیت کی دُھند میں لپٹ گئے ہیں۔ ان کی بے بسی، مایوسی اور بے چارگی انہیں کوئی رجحان ساز قدم اُٹھانے سے باز رکھ رہی ہے۔ یہ اپنی تحریروں کو قارئین کے ستھرے مذاق اور معیار سے ہم آہنگ کرنے میں دشواری محسوس کر رہے ہیں۔ صحافت کا سنگلاخ سفر کہرے کی وادیوں میں دھندلا گیا ہے۔ کبھی کبھی کوئی ستارہ ٹمٹما کر منزلوں کا سراغ دینے کی کوشش کرتا ہے۔ شاید یہ گہری اندھیری رات اور روشن صبح کے مابین جھٹپٹے کی منزل ہے۔!!

## کتابیات


| | | |
|---|---|---|
| ۱ | ڈیولپمنٹ آف اُردو لینگویج اینڈ لٹریچر | ڈاکٹر ظہور الدین |
| ۲ | "برف میں آگ" | موہن چراغی |
| ۳ | جلوۂ صد رنگ | ڈاکٹر برج پریمی |
| ۴ | سٹرگل فار فریڈم اِن کشمیر | پنڈت پریم ناتھ بزاز |
| ۵ | کشمیر | جی ایم ڈی صوفی |
| ۶ | تاریخ ڈوگر دیش | نرسنگھ داس نرگس |
| ۷ | جموں وکشمیر میں اُردو صحافت | صوفی غلام محی الدین |
| ۸ | نقوشِ صحافت | رشید تاثیر |
| ۹ | ففٹی ایرس ایز اے جرنلسٹ | ملک راج صراف |
| ۱۰ | جرنلزم اِن امریکہ | تھامس بیری |
| ۱۱ | پریس اینڈ پالیٹکس اِن انڈیا | پریم نارائن |
| ۱۲ | آدابِ صحافت | جان محمد آزاد |

موتی لال ساقیؔ*

# کشمیر کی علاقائی زبانیں اور اُردو

گزشتہ دو سو سال کے دوران جن زبانوں نے کشمیر میں اپنا دائرہ اثر وسیع سے وسیع تر کیا ان زبانوں میں اُردو کا نام سرِ فہرست آتا ہے، ریاست میں بالعموم اور وادی میں بالخصوص اُردو کوئی پرانی زبان نہیں لگتی اگرچہ یہ یہاں کے لوگوں کی مادری زبان نہیں، اُردو کے ابتدائی نقوش ہمیں مغل دور سے ہی کشمیری شعرا کے کلام میں نظر آتے ہیں، روپہ بھوانی کے واکھیوں میں ہمیں ایسے اشعار ملتے ہیں جو اردو سے لگاؤ دکھاتے ہیں۔ انیسویں صدی کے کشمیری شعراء نے جو ریختے لکھے ہیں وہ اردو اور کشمیری کا مرکب لگتے ہیں، ان شعرا میں پرمانند، محمود گامی، رسول میر، کرشن رازدان اور نعمہ صاحب وغیرہ شامل ہیں، اس نوعیت کے منظومات کا موجود ہونا اس حقیقت کو باور کرانے کے لئے کافی ہے کہ انیسویں صدی میں بھی کشمیر میں اُردو کے شیدائی موجود تھے اور اس زبان کے جاننے اور سمجھنے والوں کی تعداد بالکل محدود نہیں تھی۔ اصل میں مغل دور سے ہی اُردو کا چلن وادی میں شروع ہو گیا ہو گا جو بتدریج عروج پکڑتا گیا، اردو کی خدمت کرنے میں ان کشمیریوں کا رول بہت اہم رہا ہے جو وادی سے نکل کر ملک کے دوسرے حصوں میں آباد ہو گئے تھے، لاہور ہو یا لکھنؤ، دہلی ہو یا الہ آباد کشمیری الاصل لوگوں نے اپنی اُردو دانی کا لوہا ہر کسی سے منوایا، یہ موضوع اتنا پھیلا ہوا ہے کہ اس پر بات کرنے کی یہاں پر گنجائش نہیں۔ ان لوگوں کی دین کا

* ڈی ۱۳/۱۷ سروجنی نگر۔ نئی دہلی ۲۳۔

ذکر کئے بغیر اردو کی کوئی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ اتنا بتا دینا کافی ہے۔ خود وادی میں اُردو کو ذریعہ اظہار بنانے کا سلسلہ کافی پرانا ہے۔ سر تیج بہادر سپرو کی ادارت میں شائع ہونے والے "کشمیر درپن" کے اوراق شاہد ہیں کہ رواں صدی کے اوائل میں بھی کشمیر میں اردو لکھنے والوں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ لاہور سے شائع ہونے والے "بہارِ کشمیر" اور "کشمیری میگزین" وغیرہ بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہی ہیں۔ کشمیریوں کے لئے اُردو نہ صرف رابطے کی زبان رہی ہے بلکہ فکر و سخن، صحافت اور اپنا ما فی الضمیر بیان کرنے کا ذریعہ بھی۔ اردو سے خوشہ چینی کرنا ہمارے لئے کوئی نئی بات نہیں، ڈراموں کے روپ میں نثر نگاری کی جو ابتدائی کوششیں کشمیری میں کی گئی ہیں اُس نثر نگاری اور ڈرامہ نگاری کے پیچھے بھی اُردو کا ہاتھ رہا ہے۔ بھگوت گیتا کے پہلے نثری ترجمے کی بنیاد بھی اس صحیفے کے اُردو روپ پر رکھی گئی ہے (یہ ترجمہ ابھی تک چھپ نہیں پایا ہے۔)

۱۹۴۷ء سے پہلے جتنے بھی رسالے اور اخبار سرینگر سے شائع ہوئے ان اُردو رسائل کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ تحریک آزادی کی آواز کو چاروں اور پھیلانے میں اردو نے نہایت ہی اہم اور کارگر رول ادا کیا ہے۔ قومی مسائل کی تشہیر کے لئے اُردو کو ہی ذریعہ اظہار بنایا گیا۔ اس سلسلے میں جتنے اشتہار، کتابچے، بیانات، وغیرہ شائع کئے گئے ان کی زبان اردو تھی۔

کشمیری اگرچہ عمر میں اردو سے پرانی زبان ہے مگر اُردو نے کشمیر کے علاوہ ڈوگری، گوجری اور پہاڑی کے لئے منبع فیضان کا کام دیا ہے۔ علاقائی زبانوں کو نئی تحریکوں اور فکری نہجوں سے ممیز کرنے میں اُردو نے رہنمایانہ رول ادا کیا ہے۔ اس بات کا اعادہ کرنا مناسب ہوگا کہ بیرونی دنیا کے ساتھ اردو اُس وقت بھی رابطے کی زبان تھی جب اسے سرکاری سرپرستی حاصل نہیں تھی۔

ریاست میں سرکاری کام کاج اردو میں کرنے کا سلسلہ ۱۸۸۸ء سے شروع ہو گیا مگر دربار کی کارروائی کا اردو میں اندراج کیا جانا ۱۹۰۵ء سے شروع ہوا۔ اس طرح ۱۹۴۷ء کے بعد اردو کو ریاست کی سرکاری زبان قرار دینا اُس فیصلے کا تسلسل اور توثیق ہے جو فیصلہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے وقت میں لیا گیا تھا۔

گزشتہ پچاس سال میں وادی میں بولی جانے والی دوسری زبانوں نے بھی بولی کی سطح سے اُٹھ کر اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ کشمیری تو شعری سرمائے کے اعتبار سے کافی پرانی زبان ہے مگر پہاڑی، بلتی اور گوجری کا سرمایہ تو صرف لوک ورثے تک محدود تھا۔ ان میں گوجری کے بغیر دوسری زبانوں کو ریاستی آئین کا تحفظ حاصل ہے۔ ان زبانوں کا اولین مسئلہ رسم الخط کا اختراع کیا جانا تھا۔ نستعلیق تو اُردو کے حوالے سے وادی میں کافی مقبول تھا۔ کشمیری کو اسی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی اگرچہ یہ اس کے صوتی نظام کے تمام تقاضے پورا نہیں کرتا تھا مگر نستعلیق کے قبول عام کی بنا پر کشمیری کے ساتھ گوجری، پہاڑی اور بلتی کے لئے بھی اسی رسم الخط کو اپنایا گیا اگرچہ لسانی تقاضوں کے پیش نظر نستعلیق میں بھی کچھ اضافے کئے گئے تاکہ یہ ان زبانوں کے صوتیاتی نظام کا متحمل ہو سکے۔ نستعلیق کے حوالے سے اس بات کا حوالہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تاتاریوں کے زمانے میں دارالحکومت کو بغداد سے تبریز منتقل کیا گیا یہیں پر ایک نیا خط ظہور پذیر ہوا جو تعلیق کہلایا۔ جو موجودہ نستعلیق کی بنیاد بنا۔ حسن، زیبائش اور جاذبیت کے اعتبار سے نستعلیق کی حیثیت منفرد ہے۔ اس رسم الخط کا امام میر عماد حسینی (۱۰۳۴ء) تھا۔ ہندوستان میں مغل بادشاہوں نے نستعلیق کو مقبول بنایا اور جب اردو زبان کا دور شروع ہوا تو اس کے لئے بھی اس رسم خط کا استعمال کیا گیا۔ ریاست میں ایک وقت ڈوگری کے لئے نستعلیق کا چلن تھا، پنجابی بھی کسی زمانے میں اسی خط میں لکھی جاتی تھی۔

ریاست میں پنجابی سے متعلق تاریخی نوعیت کی کتابیں اردو میں ہی لکھی گئی ہیں کشمیری کے لئے اگرچہ دیوناگری کا بھی استعمال ہوتا رہا ہے کہ مسلمہ طور پر نستعلیق ہی کشمیری کا منظور شدہ خط ہے۔

علاقائی زبانوں کے لئے نستعلیق خط کے قبول کئے جانے نے اردو کے دروازے براہ راست ان زبانوں کے بولنے کے لئے کھول دیئے جس کی بدولت قرابط اور روابط زیادہ مضبوط ہو گئے۔ چنانچہ ان زبانوں نے بھرپور انداز میں اردو سے کسب فیض کیا۔ نظم اور نثر کے میدان میں جہاں کہیں ان زبانوں میں لکھنے والوں کو تیکنکی الفاظ اور اصطلاحات کی ضرورت محسوس ہوئی انہوں نے جانے انجانے میں اردو سے کسب فیض کیا۔ ان زبانوں کے ذخیرہ الفاظ کا تجزیہ کرنے سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ کثیر تعداد میں الفاظ اور اصطلاحات اردو کی وساطت سے ان زبانوں میں جاگزیں ہوئی ہیں۔ اتنا ہی نہیں شعری اور ادبی سانچے بھی اسی زبان کے اثر کے تحت کشمیر کی علاقائی زبانوں میں مروج ہو گئے ہیں۔

گزشتہ پچاس سال میں علاقائی زبانوں خاص کر کشمیر کی علاقائی زبانوں نے کئی مراحل طے کئے۔ گوجری اور پہاڑی میں باقاعدگی کے ساتھ تحلیقات کے شائع ہونے کا سلسلہ شروع ہوا، اپنے مقاصد اور اپنے مراحل طے کرنے کے لئے اردو کو ہی ذریعہ اظہار بنایا گیا۔ کشمیری کی ادبی تاریخ عبد الاحد آزاد نے اردو میں لکھی تھی جسے بعد میں ریاستی کلچرل اکادمی نے شائع کیا، علاقائی زبانوں کا عرفان عام کرنے کے لئے اردو نے ایک اہم وسیلے کا کام دیا، گوجروں کے تہذیبی اثاثے سے غیر گوجروں کو آگاہ کرنے کے لئے گوجر اور گوجری نام سے مطبوعات کا ایک سلسلہ شروع ہوا، اردو کی کئی ایک کتابوں کو علاقائی زبانوں کے شیشے میں اتارا گیا۔ لین دین کے اس مسئلے نے علاقائی زبانوں کے دامن کو بھی کشادہ کیا اور ساتھ ہی اردو زبان کے اثاثے

یں بھی اضافہ ہو گیا، کشمیری، ہندی، ڈوگری اور پنجابی میں لکھے گئے ریاستی
افسانہ نگاروں کی تخلیقات کو اردو روپ دے کر شائع کر دیا گیا اس طرح ریاست
کے علاقائی ادب کی پہنچ کا سلسلہ کشادہ ہو گیا۔ چنانچہ اس کتابی سلسلے کی بدولت
علاقائی ادب ہندوستان کی دوسری علاقائی زبانوں کی دسترس میں آ گیا اور تخلیقات
کے تراجم دوسری علاقائی زبانوں میں بھی شائع ہوئے۔

اردو کے سرمائے میں سے غالب اور اقبال کی تخلیقات کو کشمیری روپ دے کر
باقاعدہ کتابوں کی صورت میں شائع کیا گیا۔ دیوان غالب اور علامہ اقبال کی
تخلیقات کے تراجم نے کشمیری کو نئی سرحدوں سے آشنا کیا۔ یہی حال دیگر
زبانوں کا بھی ہے حضرت شیخ العالمؒ اور لل دید کے کلام کو اردو ترجمے کے ساتھ
شائع کر کے ہمارے بانیانِ ثقافت کی دین سے بیرونی دنیا کو آشنا کرنے کی
بامعنی سعی کی گئی۔ ہاں ایک بات ضرور ہے کہ کسی کسی جگہ ناقص ترجمے نے کلام کی
روح کو مجروح کر دیا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے تفسیر قرآن کا کشمیری ترجمہ ایک قابل قدر اضافے کا
درجہ رکھتا ہے۔ قرآن کریم کے کشمیری ترجمے نے ثابت کر دیا ہے کہ کشمیری گرانقدر
مضامین کا بار اٹھانے کی متحمل ہے اور کشمیری زبان کی زرخیزی کو ثابت کرنے کی بنیاد
اردو ہی ثابت ہوئی۔ اغلب ہی نہیں بلکہ یقینی ہے کہ مولانا محمد یوسف شاہ نے بھی
قرآن حکیم کے کشمیری ترجمے کے دوران ضرور اردو تراجم سے استفادہ کیا ہوگا۔ خلیل
جبران کی شہرہ آفاق تخلیق پیامبر کا کشمیری ترجمہ بھی اردو کے حوالے سے کیا گیا ہے
اس طرح اردو کشمیر کی علاقائی زبانوں کے لئے ہیت، موضوع، مواد، اسالیب
اور فکری اعتبار سے تاثر اور تحریک کا ذریعہ بنی رہی ہے۔ ترقی پسند تحریک کا آغاز
اردو کے ساتھ ہی تمام تر برصغیر میں ہوا، کشمیر میں بھی ترقی پسندی کی بنیاد رامانند ساگر،

پریم ناتھ پردیسی، سومناتھ زتشی اور محمود ہاشمی وغیرہ نے رکھی۔ یہ تمام ادباء اردو کے ادیب تھے اردو کے توسط سے کشمیری میں ترقی پسندی ایک زوردار تحریک کی صورت میں اُبھری اور ایک ڈیڑھ دہائی تک چھائی رہی۔ اسی تحریک کی بدولت کشمیری میں مختلف اصناف ادب نے جنم لیا۔ جدیدیت بھی کشمیری میں اُردو کے براہ راست اثر کا نتیجہ ہے، یہی وجہ ہے کہ طرز فکر کشمیری میں اردو کے بعد شروع ہوا جبکہ مغرب میں اس کا اثر و نفوذ سمٹ کر رہ گیا تھا۔

کشمیر کی تہذیبی وراثت کی ترویج اور توسیع کے لئے اُردو نے ایک موثر ذریعے کا کام کیا، غیر کشمیریوں کو کشمیر کی تہذیبی وراثت کا علم بہم پہنچانے کے لئے اس زبان نے ترسیل کے ایک موثر ہتھیار کا فریضہ انجام دیا ہے، قدیم شعرا کے ساتھ ساتھ جدید شعرا اور ادبا کے کارناموں سے باہر کی دنیا کو جانکاری فراہم کرنے میں اُردو کی اہمیت مسلمہ رہی ہے، گزشتہ سال کے دوران ہمارے یہاں جو تہذیبی اور تمدنی احیا کا سلسلہ جاری رہا اس احیا میں اُردو زبان اظہار کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ اس تمام تر عمل کی ترجمان بھی رہی ہے۔

کشمیری شاعری کو تصوف کے اندرجال سے نکالنے میں مہجور اور آزاد کی دین کو کوئی بھی شخص نظر انداز نہیں کر سکتا، مہجور اور آزاد کے دل میں کشمیری شاعری کو نئی جہتیں عطا کرنے کی اُمنگ پیدا کرنے کا سہرا اردو کے ہی سر ہے۔ آزاد تو اقبال سے زبردست متاثر رہے اور مہجور نے اپنے انداز سے دوسرے اُردو شعرا کے ساتھ ساتھ غالب اور اقبال سے استفادہ کیا اور کشمیری شاعری کو نئے دور تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا، دینا ناتھ نادم نے کشمیری شاعری کی کایا ہی پلٹ دی مگر اُس کے کلام پر جوش ملیح آبادی کے اثرات کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ کشمیری زبان کے ان برگزیدہ شعرا کے بارے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ شعرا ابتدا میں اُردو

اردو میں ہی طبع آزمائی اور مشق سخن کرتے تھے، یہی حال ماسٹر زندہ کول کا بھی رہا ہے۔

گزشتہ نصف صدی میں جتنے بھی نمائندہ کشمیری ادیب، شاعر یا صحافی ابھر کر سامنے آئے ہیں انہوں نے کشمیری کے ساتھ ساتھ اُردو کو بھی ذریعہ اظہار بنایا۔ کئی ادیب اور شاعر تو ایسے ہیں جو اُردو کے ذریعے اقلیم ادب میں داخل ہوئے اور بعد میں کشمیری کو اپنا مسکن بنا دیا۔ میر غلام رسول نازکی، دینا ناتھ نادم، محمد یوسف ٹینگ، رحمان راہی، امن کامل، اختر محی الدین اور علی محمد لون نے تو لکھنے کا آغاز اُردو سے ہی کیا۔ ڈاکٹر حبیب اللہ حامدی اُردو کے مسلّمہ ادیب ہیں۔ انہوں نے اُردو میں درجن بھر سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں جنکی پذیرائی ملکی سطح پر ہوتی ہے۔ وہ ایک مانے ہوئے نقاد ہیں اور انہوں نے اپنی تنقیدی بصیرت سے کشمیری تنقید کو بھی استوار کیا ہے۔ حامدی صاحب اُردو کے علاوہ کشمیری نظم و نثر کے میدان میں اپنی انفرادیت منوا چکے ہیں۔ کشمیری زبان کے ادیبوں اور شاعروں کے لئے اگر اُردو پہلی محبت نہیں رہی ہو مگر دوسری محبت ضرور رہی ہے۔ کشمیری کے مانے ہوئے لکھنے والوں میں شاید ہی ایسا کوئی شخص ہوگا جو اُردو نظم یا نثر میں کچھ بھی نہ لکھ رہا ہو۔

ہمارے یہاں اُردو صحافت کی بھی زبان ہے۔ یہی وجہ ہے جو بھی رسالے یا اخبار کشمیر میں شائع ہوئے ہیں یا شائع ہو رہے ہیں ان کی روایت اردو کی ادبی صحافت کے بالکل مماثل ہے۔

اُردو الفاظ کا استعمال صرف ادب اور صحافت تک ہی محدود نہیں رہا ہے بلکہ اب یہ الفاظ روزمرہ کی گفتگو کا بھی حصہ بن گئے ہیں خاص کر شہروں اور قصبوں میں اُردو الفاظ کا چلن کچھ زیادہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اس حقیقت میں مضمر ہے کہ اردو ہماری تجارت کی بھی زبان ہے اور سیاست کی بھی۔ ہمارے سیاسی لیڈر کشمیری بولتے بولتے یکدم اُردو بولنے پر اُتر آتے ہیں اور

لوگوں کو ان کے کہے ہوئے کے معنی اپنے اندازے سے کرنا پڑتے ہیں۔ سیاحوں کے ساتھ رابطے کا ذریعہ بھی اُردو ہی تو ہے۔ ایک عام ناخواندہ کشمیری بھی اُردو گفتگو سے کچھ نہ کچھ معنی اخذ کرنے کے اہل ہے جس کی بنیاد اس زبان کے ساتھ دیرینہ قرابت ہے۔

اُردو ہمارے یہاں اب لگ بھگ سو سال سے مال اور عدالت کی زبان ہے ان دونوں شعبوں کا دیہات کی زندگی کے ساتھ نہایت ہی گہرا رابطہ ہے۔ چنانچہ ان اداروں میں مروج درجنوں اُردو کے تیکنیکی اور قانونی الفاظ نہ صرف کشمیری زبان کے ذخیرہ الفاظ میں شامل ہو گئے ہیں بلکہ گوجری اور پہاڑی میں بھی جگہ پا گئے ہیں۔ یہ الفاظ تو ایسا لگتا ہے کہ علاقائی زبانوں کے بنیادی الفاظ ہیں۔ الفاظ کی فہرست کافی طویل ہے۔ پھر بھی چند ایک الفاظ کا اندراج مثال کے طور پر کرتا ہوں۔ نوتوڑ (نوتور) کاہچرائی (گاسہ چرائے)، آبیانہ (آبِ یانہ)، مالیہ (مآلیہ) رسوم، مدعی (مُدی) مدعالیہ (مُدالیہ) بٹائی (بٹائے) قانون (قونون) مثل، جمعبندی، روزنامچہ، فرد پڑتال، فرد جرم، مختارنامہ، وصیت نامہ، تہنیت نامہ وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح اردو نے کشمیر کی علاقائی زبانوں کو نہ صرف فکر اور اسلوب کے شعبوں میں متاثر کیا ہے بلکہ ان زبانوں کے ذخیرہ الفاظ میں بھی قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ اردو کے حوالے سے ہی انگریزی کے کافی الفاظ اب علاقائی زبانوں کا اثاثہ بن گئے ہیں۔

اُردو کسی حادثے کی پیداوار نہیں، یہ زبان اُسی طرح تاریخی تقاضوں کی کوکھ سے جنمی ہے جس طرح دوسری علاقائی زبانوں نے جنم لیا ہے۔ یہ زبان کسی فرقے یا عقیدے کی ترجمان نہیں بلکہ تاریخی تسلسل کی ایک منضبط کڑی ہے جس طرح کوئی شخص تاج محل اور لال قلعے کے جلال اور جمال سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اُسی طرح

اردو کو نظر انداز کرنے سے اس تمدنی ورثے کے خد و خال مسخ ہو جائیں گے جس کے نقوش اتہاس کے پنوں پر مرتسم ہیں۔ اُردو کے ضمیر میں وہ سبھی عناصر موجود ہیں جو ایک مخلوط تہذیب کی نشاندہی کرتے ہیں اور اسے سنوارتے ہیں۔ اُردو تہذیب اور شائستگی کی زبان ہے اور اس کی آبیاری کرنا تہذیبی تسلسل کو بنائے رکھنے کی ضمانت ہے۔

یہ بات تکلیف دہ ہے کہ سرکاری زبان ہونے کے باوجود اُردو کو ریاست کے کچھ علاقوں اور خطوں میں پڑھایا نہیں جا رہا ہے۔ ایسا ہی حال انگریزی میڈیم سکولوں کا بھی ہے۔ انگریزی بلاشبہ سائینس کی زبان ہے مگر تہذیب اور احساسات کی زبانوں کو نظر انداز کر کے ہم لوگ ماضی کے ساتھ اپنا رشتہ کاٹنے کے مجرم ثابت ہو سکتے ہیں۔

○

## قارئین سے گذارش

• "شیرازہ" کے بارے میں اپنی رائے بطورِ خاص مرحمت فرمایئے اور اپنے مفید مشوروں سے ہمیں نوازتے رہیئے۔

•• "شیرازہ" کو اپنے دوستوں سے متعارف کرایئے اور خریداری کے لئے توجہ دلا کر اسے زیادہ سے زیادہ اُدب نوازوں تک پہنچانے کی کوشش میں ہمارا ساتھ دیجئے۔

○

عبد الغنی شیخ

# لداخ میں اُردو

——— ۱۹۴۷ء — ۱۹۹۷ء

اُردو لداخ کی تہذیبی اور رابطے کی زبان ہے۔ یہاں مادری زبان کے بعد اُردو پڑھنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ ویسے بھی اُردو ریاست جموں وکشمیر کی سرکاری زبان ہے۔

ریاست میں اُردو ڈوگرہ حکومت کی دین ہے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ (۱۸۵۷-۱۸۸۵ء) کے انتقال کے بعد مہاراجہ پرتاپ سنگھ ۱۸۸۵ء میں تخت نشین ہوئے اور اس کے کچھ عرصہ بعد انہوں نے اُردو کو سرکاری زبان یا اس سے پینتالیس ۴۵ سال پہلے لداخ پر ڈوگرہ حکومت کا پورا تسلط ہو چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ ریاست کی دو۲ اکائیوں کے ساتھ لداخ میں بھی اُردو مروّج ہوئی۔

اس سے پہلے ریاست کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ تاہم اس کا استعمال اعلیٰ طبقہ تک ہی محدود تھا۔ آرکائیوز (محافظ خانہ) ریکارڈ کے مطابق عام لوگوں

---

® شیخ منزل، فورٹ روڈ - لیہہ - لداخ

کے لئے دفاتر میں اُردو اور انگریزی استعمال ہوتی تھی۔ اس طرح اُردو کو سرکاری زبان بنانے کی راہ ہموار ہوئی تھی۔ تاہم حالات بتاتے ہیں کہ اردو کو سرکاری زبان بنانے سے بہت پہلے اُردو لداخ میں مختلف لوگوں کے مابین رابطے کی زبان تھی۔ لیہہ سنٹرل ایشیاء کا ایک اہم تجارتی مرکز تھا۔ بہت سارے ترکی، پنجابی، کشمیری اور تبتی تجارت کے سلسلے میں لداخ آتے تھے۔ اس لئے مقامی آبادی کے ساتھ اظہارِ خیال (Communication) کے لئے یہ زبان ضروری تھی۔

۱۷۱۵ء میں دو پرتگالی پادری فادر ڈیسیزی ڈیری اور فادر فریرے تبت جاتے ہوئے لیہہ میں رُکے۔ فادر ڈیسیزی ڈیری نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے:

"اون (پشمینہ) کی تجارت سے وابستہ بہت سے کشمیری تاجر لداخی قلمرو میں بستے ہیں۔ انہیں مسجدیں تعمیر کرنے اور اپنے مذہب پر چلنے کی پوری آزادی ہے۔"

ظاہر ہے کہ ان سے بات چیت کرنے کے لئے ایک زبان کی ضرورت تھی۔ بہت سارے لداخی ترکی جانتے تھے اور ترکی تاجروں کے ساتھ لداخی ترکی زبان میں بات چیت کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے ۱۹۴۷ء سے پہلے میں اور بہت سارے نوعمر لڑکوں نے ترکی میں سُدھ بُدھ حاصل کی تھی اور اسی زبان میں ترکی تاجروں سے بات چیت کرتے تھے۔ ترکی تاجر بھی فارسی یا اُردو رسم الخط میں لکھتے تھے۔ تاہم کشمیریوں اور پنجابیوں سے آسان اُردو میں بات چیت ہوتی تھی۔ ہم نے اپنے بزرگوں کو بھی اسی زبان میں بات چیت کرتے دیکھا سنا اور کبھی ان سے یہ نہیں سُنا کہ ان کے آباء و اجداد ترکی زبان کی طرح کشمیری یا پنجابی جانتے تھے۔ بقولِ مرزا ہرگوپال تفتہ اُردو پنجابیوں اور کشمیریوں کے رابطے کی بھی زبان تھی۔

۱۸۲۰ء میں جب ایک انگریز ڈاکٹر مورکرافٹ لداخ کی سرحد پار کر کے
اُپشی گاؤں تک پہنچا تو اسے لداخی راجہ نے جب لیہہ آنے کی اجازت نہیں دی تو
ایک صوفی منش بزرگ خواجہ شاہ نیاز نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا۔ خواجہ
صاحب نے کشمیر میں سکھوں کے دورِ حکومت میں ظلم و ستم سے عاجز آ کر لیہہ میں
پناہ لی تھی اور شئے گاؤں میں قیام کرتے تھے۔ خواجہ شاہ نیاز لداخ کے کلون
(وزیر اعظم) لیہہ کے گورنر اور دوسرے حکام سے گفت و شنید کرتے تھے۔ میرا خیال
ہے اور حالات و کوائف سے بھی پتہ چلتا ہے کہ فریقین اُردو میں تبادلۂ خیال
کرتے تھے۔

تبتیوں کے ساتھ ابلاغ و ترسیل کا خاص مسئلہ نہیں تھا۔ کیونکہ دونوں
قوموں کی علمی و ادبی زبان اور لیپی ایک ہے۔ بہت سارے لداخی تبتی بول چال
سے واقف تھے۔

۱۹۴۷ء سے پہلے برطانوی ہند کے انگریز افسر سیاحت، شکار اور سرکاری
کام کے سلسلے میں لداخ آتے تھے۔ ان میں سے اکثر مقامی لوگوں سے ٹوٹی اردو
بولتے تھے کیونکہ مقامی آبادی میں انگریزی جاننے والے خال خال تھے۔

مسلمانوں نے ریاست میں اردو کو سرکاری زبان بنانے سے دو سو سال پہلے
لداخ کو فارسی سے روشناس کیا تھا۔ لداخ مغلوں کا باج گذار تھا اور لداخ کے
راجے کشمیر کے مغل گورنر سے فارسی میں خط و کتابت کیا کرتے تھے۔ اس ضمن میں
شروع میں لداخ کے ایک راجہ نے کشمیر سے ایک فارسی دان مسلمان کو لیہہ مدعو
کیا اور اسے زمین کے علاوہ دوسری مراعات بھی دیں۔ لداخ میں یہ خاندان
'خواجہ خاندان' کے نام سے مشہور ہے۔ خواجہ خاندان کے آل و اولاد آج بہت

سارے کنبوں پر مشتمل ہیں اور لداخ اور کشمیر کے علاوہ چینی ترکستان، تبّت، پاکستان، انگلینڈ، اور امریکہ میں بھی آباد ہیں۔

فارسی زبان کا لداخ پر اثر رہا ہوگا کیونکہ لداخی زبان میں فارسی کے الفاظ ہیں۔ ایک لداخی راجہ چھیتن نمگیل (۱۸۰۰ - ۱۸۲۰ء) فارسی اور کشمیری زبانیں بخوبی جانتا تھا۔ کرگل میں چھوٹے چھوٹے پرائیویٹ مکتب تھے جہاں بچّوں کو قرآن خوانی کے علاوہ فارسی سکھائی جاتی تھی۔ لیہہ میں ذی حیثیت لوگ اپنے بچّوں کو پڑھانے کے لئے گھر میں استاد رکھتے تھے۔

مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے ۱۸۸۸ء میں جموں صوبہ میں اُردو کو عدالتی زبان بنایا۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں وادیٔ کشمیر اور لداخ کی عدالتوں میں اُردو میں کام ہونے لگا۔ تقریباً اسی زمانے میں محکمہ مال میں اُردو استعمال ہونے لگی۔

اُنیس سو بیس اور تیس کی دہائیوں میں لداخ میں لاہور سے اُردو اخبارات آتے تھے۔ ان میں 'انقلاب'، 'ملاپ' اور 'پرتاپ' شامل ہیں۔ بعد میں سرینگر سے 'صداقت'، 'ہمدرد' اور دوسرے اخبارات آنے لگے۔ ان اخبارات کو پڑھ کر ایک لداخی منشی عبدالستار نے تحریکِ آزادی میں حصّہ لیا اور ۱۹۲۹ء میں جیل گئے۔ وہ لداخ کے واحد مجاہدِ آزادی تھے۔ مرحوم نے اُردو میں 'لداخ کی تاریخ' لکھی جو ریاست میں لکھی جانے والی اُردو کی پہلی تصنیفات میں سے ایک ہے۔ ڈوگرہ حکومت نے اس کتاب کو ممنوع قرار دیا۔

ڈوگرہ حکمرانوں نے اُردو کی ترقی و ترویج میں بڑی دلچسپی لی۔ ۱۹۴۰ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے جانشین مہاراجہ ہری سنگھ (۱۹۲۵ - ۴۷ء) کے دورِ حکومت میں سیدین کمیٹی کی سفارشات پر اُردو کو ریاست کے سکولوں میں

ذریعۂ تعلیم بنایا گیا۔ خواجہ غلام السیّدین ریاست میں محکمہ تعلیم کے ناظم اعلیٰ تھے۔

مہاراجہ ہری سنگھ نے اُردو کے فروغ کے لئے سکولوں میں انسپکٹر تعینات کئے اور اردو ادیبوں کی اچھی تخلیقات کے لئے انعامات اور اعزازات کا سلسلہ شروع کیا۔

۱۹۴۷ء کے بعد پچھلے پچاس سال کے دوران لداخ میں اُردو نے نمایاں ترقی کی۔ اگرچہ خطّے میں اُردو کے ہزاروں قارئین موجود ہیں اور اردو میں کتابیں بھی لکھی گئیں تاہم اردو کے خلاف دبی دبی مہم بھی چلی، جس کی وجہ سے ایک فرقے سے تعلق رکھنے والی نئی نسل کے بہت سارے بچّوں نے اردو کو خیرباد کہا۔

۱۹۵۶ء میں جموں و کشمیر آئین ساز اسمبلی نے آئین کی دفعہ ۱۴۵ کے تحت اُردو کو ریاست کی سرکاری زبان قرار دیا۔

اُردو ذریعۂ تعلیم ہونے کی وجہ سے لداخ میں اسے بڑا فروغ ملا۔ دائیں بازو کی ہندو جماعتوں اور اردو مخالف عناصر کا اُردو کے خلاف جو رویّہ رہا ہے، لداخ شخصی آزادی کے بعد برسوں تک اس سے محفوظ رہا۔ تاہم یہ صورتِ حال بہت زیادہ دیر تک نہیں رہی۔ اُردو دشمنی کی ہوا یہاں بھی آ پہنچی اور اس کے خلاف ایک غیر مرئی سی تحریک چلنے لگی، جو سکولوں میں نظر آنے لگی۔ جب ناخواندہ والدین اپنے نو داخلہ بچّوں کو اُردو پڑھانے سے باز رکھنے لگے جس کے پس پُشت ایک فرقے کے سیاسی رہنماؤں کا ہاتھ ہے۔

جیسا کہ پہلے ہی عرض کیا جا چکا ہے کہ لداخ سمیت ریاست کی تینوں اکائیوں میں اُردو زبان ڈوگرہ دورِ حکومت میں رائج کی گئی تھی لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ ایک طبقے کی طرف سے پیش کی ہوئی یادداشتوں وغیرہ میں ہمیشہ یہ تاثر

دیا جاتا ہے کہ لداخ پر کشمیر سرکار نے آزادی کے بعد لوگوں کی مرضی کے خلاف اردو مسلّط کی ہے۔ کئی غیر ملکی مصنّفین نے بھی ان یادداشتوں کی روشنی میں یہی بات دہرائی ہے۔ یہ مصنّفین لداخ میں انگریزی کی اشاعت تو چاہتے ہیں لیکن اُردو کو غیر ملکی زبان کہتے ہیں۔

آزادی سے پہلے اردو کے تئیں لداخیوں کے نقطۂ نظر اور روّیہ سے متعلق ایک واقعہ ملاحظہ ہو:

۱۸۷۴ء میں مہاراجہ رنبیر سنگھ نے لیہہ میں سنسکرت کے درس و تدریس کے لئے ایک پاٹھ شالہ کھولا اور اس سلسلے میں کشمیر سے ایک اُستاد بھیجا۔ لداخ کے تمام نمبرداروں کے نام ہدایت جاری کی گئی کہ وہ اپنے ایک بیٹے یا اپنے قریبی رشتے کے ایک بچّے کو پاٹھ شالہ میں سنسکرت سیکھنے کے لئے داخل کریں۔ لیکن لداخیوں نے سنسکرت سیکھنے میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ اکثر بچّے سکول سے بھاگ جاتے تھے اور والدین ان کو روکتے نہیں تھے۔ سینٹرل ایشیا سے لداخ کی تجارت کی نگرانی کے سلسلے میں لیہہ میں متعینہ انگریز جوائنٹ کمشنر اپنی ڈائری[1] میں مورخہ یکم تا پندرہ اکتوبر ۱۸۸۲ء رقم طراز ہے:

"لداخی فارسی رسم الخط میں لکھنے اور پڑھنے کا شوق رکھتے ہیں۔ ——— کیونکہ یہ ہندوستانیوں اور ترکی تاجروں میں آپسی میل جول کے دوران عملی طور زیادہ مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس لداخی سنسکرت

---

[1] یہ ڈائری نیشنل آرکائیوز میں محفوظ ہے۔

کے چند صفحات بڑ بڑانے میں اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتے
ہیں۔ لڑکوں کو بڑی مشکل سے سکول میں حاضر رکھا جاتا ہے۔
مہاراجہ کی طرف سے وظائف کی فراخدلانہ ادائیگی، خوراک وغیرہ
کی فراہمی کے باوجود وہ لگاتار سکول سے بھاگتے رہے ہیں۔
مہاراجہ کو پاٹھ شالہ کی ناپسندیدگی کا علم رہا ہے۔ ہر سال طلبا
کی تعداد میں کمی ہو رہی ہے۔ لیکن اس نے سکول بند نہیں کیا۔
شاستری (سنسکرت) سکول جو یہاں چند سال سے قائم
ہے، عملی طور بے کار پڑا ہے اور اس میں صرف پانچ طلباً
زیرِ تعلیم ہیں۔"

اِس سے پہلے انگریز جوائنٹ کمشنر نے اپنے افسرانِ بالا کو رپورٹ کی ہوگی کہ کشمیر میں برطانوی ہند سرکار کے خصوصی ڈیوٹی پر تعینات افسر میجر پی۔ ڈی ہنڈرسن نے معاملہ ہٰذا زیر نمبر ۱۶۶ مورخہ ۲۵ اکتوبر ۱۸۷۷ء برطانوی ہند حکومت کی نوٹس میں لایا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"لداخی لڑکوں کی تعلیم کے لئے مہاراجہ کا قائم کردہ یہ شاستری
سکول (مقامی لوگوں میں) بالکل نامقبول ہے۔ مہاراجہ صورتحال
سے آگاہ ہے لیکن اپنے فیصلے پر اڑا ہے۔"

آخر کار مہاراجہ کو لوگوں کی مرضی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا اور سکول بند کر دیا گیا۔

۱۸۸۵ء میں عیسائی مشنری موراوین مشن نے لیہہ میں ایک سکول کھولا اور نصاب میں اُردو اور انگریزی دونوں زبانیں رکھیں۔

۱۸۹۲ء میں ڈوگرہ حکومت نے لیہہ اور سکردو کے قصبوں میں پرائمری سکول کھولے اور اردو اور انگریزی زبانیں پڑھائی جانے لگیں۔

۱۸۹۸ - ۱۸۹۹ء میں نصاب سے انگریزی خارج کردی گئی اور اس کے بدلے لداخ میں بودھی پڑھائی جانے لگی۔

۱۹۷۵ء میں شیخ محمد عبداللہ جب ریاست کے دوبارہ وزیراعلیٰ بنے تو انہوں نے اردو ہندی دونوں کو دسویں جماعت تک لازمی مضامین قرار دیا۔ حکم کے مطابق جس نے ابتدائی جماعت میں اردو زبان اختیار کی ہو اسے چوتھی جماعت سے ثانوی زبان کی حیثیت سے ہندی پڑھنی ہوگی اور ہندی ابتدائی جماعت سے پڑھنے والے طالب علم کو چوتھی سے اردو پڑھنی ہوگی۔ حکومت نے حکم تو جاری کیا لیکن اس پر عمل آوری کے لئے مؤثر قدم نہیں اٹھایا۔ چنانچہ نیم دلی سے اس پر عمل ہونے لگا اور یہ مشاہدے میں آیا کہ جو زبان ابتدا میں پڑھائی جاتی ہے بچے اسے بہتر سیکھتے ہیں۔ چوتھے درجے میں پہنچنے کے بعد طلباء دوسری زبان سیکھنے کی طرف مائل نہیں ہوتے یا اسے سنجیدگی سے نہیں لیتے اور بیگار سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلباء دونوں زبانوں میں کمزور رہتے ہیں۔ خاص کر آج کل جب کہ تعلیم کا معیار گر گیا ہے، یہ مسئلہ زیادہ سنگین اور پیچیدہ بنا ہے۔

سہ لسانی فارمولا کو ویسے بھی بہت سی ریاستوں نے قبول نہیں کیا اور یہ کامیاب نہیں ہوا ہے۔ اس حکم کے مطابق لداخ میں چار زبانیں پڑھائی جانے لگیں۔ بودھی سمیت تین زبانیں پہلے ہی مروج تھیں۔ ظاہر ہے ننھے منّے بچوں پر یہ غیر معمولی بوجھ تھا اور اس پر عمل نہیں ہوا اور ایک اوسط طالب علم نے ایک زبان میں واجبی سی لیاقت بھی حاصل نہیں کی۔ ویسے بھی میٹرک کے بعد ذریعہ تعلیم

انگریزی ہونے کی وجہ سے اکثر طلباء ہندی اور اردو کو خیر باد کہتے ہیں اور دوسرے مضامین اختیار کرتے ہیں۔

پرائیویٹ سکولوں نے اس حکم پر عمل نہیں کیا اور حکومت نے اُن سے کوئی باز پرس بھی نہیں کی۔ حکومت تادیبی کارروائی کرسکتی تھی۔ لیکن ان سکولوں کی نہ گرانٹ بند کی گئی اور نہ ان کی سرکاری شناخت (Recognition) منسوخ کی گئی۔

اگرچہ ۱۹۴۷ء کے بعد پچھلی پانچ دہائیوں کے دوران لداخ میں ہزاروں اردو دان اور قارئین نکلے ہیں۔ لیکن خطے نے بہت کم ادیب اور قلم کار پیدا کئے ہیں۔ اس کی وجہ سے اُردو ادب میں علاقائی طور بہت کم کام ہوا ہے۔ لداخ کے مقامی اُردو ادیبوں میں کاچو سکندر خان، اکبر لداخی، راقم الحروف اور عبدالقیوم ہیں جنہوں نے اپنی تخلیقات شائع کی ہیں۔

کاچو سکندر خان نے اُردو میں دو کتابیں تصنیف کی ہیں۔ "قدیم لداخ" لداخ اور بلتستان کی ایک مبسوط تاریخ ہے۔ ۷۳۳ صفحات کی اس ضخیم تصنیف میں کاچو صاحب نے لداخ کی تہذیب و تمدّن پر بھی خامہ فرسائی کی ہے اور لداخی دردوں کی تہذیب اور معاشرت پر بصیرت افروز روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے اٹھارہ لداخی لوک گیتوں کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس تاریخ کی تیاری میں جہاں انہوں نے مختلف مؤرخوں سے استفادہ کیا ہے وہیں اپنی تخلیق سے نئی باتیں بھی منظرِ عام پر لائی ہیں۔ کتاب کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ یہ تصنیف ان کی عمر بھر کی محنت اور جستجو کا حاصل ہے۔

کاچو صاحب کی زبان سلیس، شیریں، دلنشیں اور دلکش ہے۔ ریاستی کلچرل اکادمی نے اس تصنیف پر ان کو ایوارڈ سے نوازا ہے۔

ان کی دوسری تصنیف مشہور لداخی داستان "نز بو زانگپو وات ٹھوق لامو" کا اردو ترجمہ ہے۔ انہوں نے داستان پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ اس داستان کا اصلی ماخذ سنسکرت ہے اور اسے مقامی مزاج اور ماحول کے مطابق لداخی اور تبتی جامہ پہنایا گیا ہے۔ اس تصنیف پر کاچو صاحب کو اتر پردیش اردو اکادمی کا ایوارڈ ملا۔

عبدالقیوم نے حال ہی میں اپنی پہلی کتاب "رنگین سپنے" لکھی ہے۔ یہ ان کی چند کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ ان کی دوسری کتاب زیرِ تصنیف ہے۔ عبدالقیوم کا مطالعہ وسیع ہے اور اردو ادب پر گہری نظر ہے۔ لیہہ میں اپنی نجی لائبریری میں انہوں نے اردو کی متعدد اور اچھی کتابیں رکھی ہیں۔ مصنّف کے مضامین "تعمیر"۔ "محراب"۔ "ہمارا ادب"۔ "پیامِ تعلیم"۔ "خدمت"۔ "آواز" وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں۔

اکبر لداخی نے لداخی سماج اور زندگی پر کئی کہانیاں اور مضامین قلمبند کئے ہیں جو مختلف رسائل میں چھپے۔ مرحوم اردو میں خوبصورت گفتگو کرنے میں مشہور تھے۔

بابو عبدالحمید لداخی زبان کے شاعر ہیں۔ انہوں نے اردو میں بھی شعر کہنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا بڑا کارنامہ سہ لسانی لغت کی ترتیب و تدوین ہے جو لداخی، اردو اور انگریزی زبانوں میں ہے۔ یہ پہلی لغت ہے جس میں لداخی الفاظ کے اردو متبادل دیئے گئے ہیں۔ مصنّف کی ایک اور کتاب زیرِ تصنیف ہے۔ اسمیں لگ بھگ ایک ہزار لداخی کہاوتوں کی متبادل اردو اور انگریزی کہاوتیں یا انکے ترجمے پیش کئے گئے ہیں۔ کہاوتوں پر مبنی کارٹون بھی شامل کئے گئے ہیں۔ مذکورہ دونوں تصانیف لداخ میں اپنی نوعیّت کی منفرد اور پہلی کتابیں ہیں جن سے اردو قارئین لداخی زبان اور کہاوتوں سے روشناس ہوں گے۔

راقم الحروف کی اب تک مندرجہ ذیل کتابیں زیورِ طباعت سے آراستہ

ہو چکی ہیں :

(۱) زوجی کے آر پار ــــ (افسانوں کا مجموعہ)

(۲) دوراہا ــــ (افسانوں کا مجموعہ)

(۳) دل ہی تو ہے ــــ (ناول)

(۴) وہ زمانہ ــــ (ناول)

(۵) صنم نربو ــــ (سوانح حیات)

میری چالیس کے قریب کہانیاں اب تک ریاست اور بیرونِ ریاست کے رسائل 'شمع' 'بانو' ہمارا ادب ' شیرازہ ' واقعات ' العطش ' دیش ' ہمپوش ' فلمی ستارے ' موتی سٹار ' ایوانِ اردو ' پالیکا سماچار وغیرہ میں چھپ چکی ہیں ۔ اس کے علاوہ میرے متعدد ادبی اور لداخ سے متعلق مضامین آج کل ' شیرازہ ' ہمارا ادب ' شاعر ' تعمیر ' شبستان وغیرہ میں چھپے ہیں ۔

کئی کہانیوں کا انگریزی ' ہندی اور ایک کا تلگو میں ترجمہ ہوا ہے ۔ امریکہ میں رہنے والی ہندوستانی نژاد روبینہ اگروال نے لداخ سے متعلق میری گیارہ کہانیوں کو کتابی صورت میں چھاپنے کے لئے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے ۔

راقم الحروف کے غیر مطبوعہ مسودوں میں 'لداخ کی سیر' 'کتابوں کی دنیا' اور 'مہاتما گاندھی' ہیں ۔ اوّل الذکر دو مسودے بچوں کے بین الاقوامی سال پر لکھے گئے تھے اور ریاستی سرکار نے ان پر ایوارڈ دیئے ۔ مہاتما گاندھی ' گاندھی جی صد سالہ برسی پر لکھی گئی ۔ اس مسودے اور ناول 'دل ہی تو ہے' پر مجھے کلچرل اکادمی کے ایوارڈ ملے ۔

لیہہ میں 'بزمِ ادب' کے نام سے ایک ادبی انجمن ہے ۔ انجمن نے گذشتہ چند سالوں میں کئی ادبی محفلیں منعقد کیں ۔ ان محفلوں میں کئی غیر مقامی قلمکاروں

اور مقامی شعراء منیر احمد، خالدہ باری اور رقیہ بانو نے اپنا کلام اور تخلیقات پیش کیں۔
لداخی زبان کے اسکالر اور ادیب ٹشی رگبیس، چھیتن نچگ اور چھوانگ تولدن کے اردو میں لکھے ہوئے کم سے کم ایک ایک مضمون میری نظر سے گزرے ہیں
۱۹۴۷ء کے بعد کشمیر کے ایک قلمکار محمد امین پنڈت نے "لداخ کی کہانی" کے عنوان سے اردو میں ایک کتاب لکھی۔ اس میں لداخ کے ماضی اور تمدّن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد بلتستان میں بلتی اور لداخی تاریخ، تہذیب، ثقافت اور لوک ادب پر کئی اچھی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ سنہ ۴۷ء سے پہلے منشی حشمت اللہ کی "تاریخِ جموں وکشمیر، لداخ وبلتستان" ایک اہم تصنیف ہے۔ منشی حشمت اللہ لداخ اور بلتستان کے ناظمِ اعلیٰ رہ چکے ہیں اور انہوں نے دونوں خطّوں کی تاریخ پر دو درس ریسرچ کیا۔
ریاست میں اردو کی پہلی کتاب "سفرنامہ بخارا" ہے جو جموں میں چھپی۔ اس کتاب میں لداخ کا تذکرہ ہے۔ اس کا مصنّف مہتہ شیر سنگھ ہے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے اس کو ۱۸۶۷ء میں جاسوسی کے مشن پر سینٹرل ایشیا بھیجا تھا۔ اس سفر کے دوران وہ لداخ سے گزرا تھا۔
"احوالِ ملکِ لداخ" بھی لداخ سے متعلق لگ بھگ اسی دور کا ایک قلمی نسخہ ہے۔ یہ دونوں نسخے سرینگر کی ریسرچ لائبریری میں ہیں۔
لداخ سے اردو میں کوئی اخبار یا جریدہ نہیں نکلتا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کالج میں زیرِ تعلیم لداخی طلباء نے اردو اور انگریزی میں 'لوٹوس' نام سے ایک جریدہ نکالا۔ لیکن اس کا صرف ایک شمارہ نکلا۔ محکمہ تعلیم نے لداخ میں تعلیم کے مسائل پر اردو میں ایک خصوصی شمارہ نکالا۔

لداخ میں اردو کی کتابت کرنے والا کوئی (کاتب) نہیں ہے۔ کئی دفعہ مضامین، پمفلٹ، اشتہارات وغیرہ کی کتابت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جو اشاعت کے لئے سرینگر اور دہلی بھیجے جاتے ہیں۔ عبدالسلام ٹاک فردِ واحد ہے جو فالتو وقت میں کتابت کرتا ہے۔ عبدالسلام نے اپنی لگن اور محنت سے کسی تربیت کے بغیر خوشنویسی میں کچھ صلاحیت حاصل کی ہے۔

حال میں ضلع لیہہ میں سرکاری سکولوں میں ابتدائی جماعت سے انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا ہے اور اس پر عمل ہو رہا ہے۔ اس کا اردو کے پھیلاؤ میں منفی اثر پڑا ہے۔ اس کی محرّک ایک مقامی غیر سرکاری تنظیم SECMOL [1] ہے۔

تنظیم نے اس تحریک کو Operation New Hope کا نام دیا ہے جسے لداخ اٹونومس ڈیولوپمنٹ ہل کونسل کی تائید اور حمایت حاصل ہے۔

اس تحریک کے روحِ رواں تنظیم کے ڈائریکٹر صنم وانگچک ہیں۔ صنم وانگچگ کی دلیل یہ ہے کہ طلباء کو ابتدائی درجوں میں اردو پڑھانے میں کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ آٹھویں درجہ کے بعد ذریعہ تعلیم انگریزی ہے۔ پرائیویٹ سکولوں کی طرح اگر طالبعلم ابتداء سے ہی انگریزی میں تعلیم حاصل کرے تو وہ اس زبان میں زیادہ مہارت حاصل کر سکتا ہے، جو آگے چل کر زندگی میں بھی اس کے لئے نفع بخش ہو سکتا ہے۔ پرائیویٹ سکولوں کے نتائج سرکاری سکولوں سے بہتر رہتے ہیں۔ بہت سے والدین اپنے بچوں کو پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں تعلیم دلانے کی خواہش رکھتے ہوئے بھی غربت کی وجہ سے ایسا نہیں کر پاتے۔

---

[1] The students Educational and Cultural Movement of Ladakh

ان دلائل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جب سرکار کی طرف سے پرائیویٹ اور سرکاری سکولوں میں زبان کے لئے مساوی، واضح اور بندھا ٹکا اصول اور پالیسی نہ ہو تو ہر ایک کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مرضی سے زبان کا انتخاب کرے۔

لیکن SECMOL کی اس مہم میں قباحت یہ ہے کہ وہ جلد بازی سے اپنے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنا رہا ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ ضلع لیہہ کے ایک سو پچاسی پرائمری سکولوں میں صرف مڈل یا میٹرک پاس استاد ہیں۔ ان میں اکثر اُستاد انگریزی میں درس و تدریس کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ان کے لئے دس روز کے لئے ایک ریفریشر کورس رکھا گیا ہے۔

بہت سارے اُستاد نجی طور کہتے ہیں کہ ان حالات میں بچے نہ انگریزی سیکھ رہے ہیں اور نہ ہندی یا اردو۔

تنظیم نے Operation New Hope کی مہم کرگل میں بھی چلائی۔ تاہم یہ کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوئی۔ اس کی ایک وجہ کرگل کے لوگوں کی اُردو سے جذباتی وابستگی ہے۔[۳]

انگریزی کو ذریعہٴ تعلیم بنانے سے اردو کو زیادہ نقصان اختیاری مضمون کے انتخاب سے پہنچا ہے۔ کیونکہ ایک فرقہ سے تعلق رکھنے والے طلبا اردو بہ طورِ اختیاری مضمون نہیں لے رہے ہیں۔

SECMOL لداخی ثقافت، مزاج، معاشرت اور مقامی ہُنر و فن کے مطابق نظامِ تعلیم ڈھالنا چاہتا ہے اور ان کے مطابق درسی کتب مرتب کرنے کا خواہاں ہے۔ اسے شکایت ہے کہ نصاب کی کتابوں کے موضوعات لداخی ماحول، مزاج اور ثقافت سے میل نہیں کھاتے۔ یہ حقیقت ہے کہ نصابی کتابوں کے

مؤلفین نے درسی کتابیں تالیف کرتے وقت لداخ کو نظرانداز کیا ہے اور لداخی ادیبوں اور تعلیمی ماہرین سے کبھی رائے نہیں لی ہے۔ چنانچہ درسی کتب میں لداخ سے متعلق مواد میں غلطیاں ہیں۔

زبان کو اکثر روزی روٹی سے جوڑا جاتا ہے۔ پٹواری اور عرائض نویس بننے کے لئے بھی اردو سیکھی جاتی ہے۔ اب محکمہ مال اور عدلیہ میں یہاں آہستہ آہستہ اردو کی جگہ انگریزی لے رہی ہے۔ بہت سارے جج صاحبان اور وکلاء اردو سے نابلد ہیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ Central Institute for Budhist studies نے جو مرکزی وزارتِ تعلیم اور کلچر کے تحت لیہہ میں ایک اہم تعلیمی ادارہ ہے، مرکزی سرکار کو اردو ریاست جموں وکشمیر کی سرکاری زبان ہونے اور محکمہ مال اور عدلیہ میں اردو امیدواروں کو روزگار کے وسائل ہونے کے پیشِ نظر یہ تجویز پیش کی تھی کہ ادارہ میں اردو پڑھانے کا بھی انتظام کیا جائے۔ لیکن وزارت نے اس تجویز کو یک قلم مسترد کردیا۔ انسٹی ٹیوٹ میں معاشیات، سیاسیات، تاریخ، آرٹ وغیرہ کے مضامین کے علاوہ انگریزی اور سنسکرت پڑھائی جاتی ہیں اور ذریعہ تعلیم ہندی ہے۔

اردو کا المیہ یہ ہے ریاست کی سرکاری زبان ہوتے ہوئے بھی اس کی حیثیت سرکاری زبان جیسی نہیں ہے۔ کوئی پڑھے یا نہ پڑھے اس کی بلا سے۔ اگر یہ رجحان برقرار رہے تو وہ دن دور نہیں جب لداخ خطے میں اردو پڑھنے والے افراد کی تعداد گھٹ کر نصف یا اس سے بھی کم رہ جائیگی۔

اٹھارہویں صدی کے وسط سے بیسویں صدی کی ایک چوتھائی تک شمالی

ہندوستان میں اردو عروج پر تھی اور سب سے بڑی اور اہم ترین زبان مانی جاتی تھی۔ سبھی بلا تمیزِ مذہب و ملت شوق سے اردو سیکھتے تھے۔ ۱۸۳۵ء میں اسے سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا لیکن آزادی کے بعد یک لخت یہ ایک فرقے کی زبان قرار پائی۔ پھر بھی اردو ہر جگہ اپنی چاشنی، دلکشی اور شیرینی کی وجہ سے زندہ ہے۔ اردو میں یہ خوبی ہے کہ اس کے مخالفین بھی اس کی تعریف کرتے ہیں۔

اکثر لداخی ادیبوں اور شاعروں نے اردو پڑھی ہے اور براہ راست یا بالواسطہ انہوں نے اردو سے اثر لیا ہے۔ ایک لداخی رومانی شاعر سے میں نے حال ہی میں سوال کیا کہ اس کی شاعری پر کس کا اثر ہے؟

"اختر شیرانی کا۔" اس نے جواب دیا۔

ملک کے دوسرے علاقوں کی طرح لداخ میں ریڈیو پر اردو گیتوں کی فرمائشیں ہوتی ہیں۔ اردو فلموں اور ٹی وی سیریلز بڑے ذوق و شوق سے دیکھے جاتے ہیں۔ اردو غزلوں پر سامعین سر دھنتے ہیں۔

لداخ کی ادبی، سیاسی اور ثقافتی زندگی پر اردو کا اثر ہے۔ اندرونِ ملک کوئی بڑی شخصیت آتی ہے تو عموماً اردو میں اس کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ اردو میں سپاسنامہ پڑھا جاتا ہے۔ کھیل کے میدان میں کومینٹری اسی زبان میں ہوتی ہے اور مختلف موقعوں پر اعلانات کرنے کے لئے اسی زبان کا سہارا لیا جاتا ہے۔ لداخی گیتوں کے لئے اردو گیتوں کے طرز پر دھنیں بنائی جاتی ہیں۔ غرض اردو نے لوگوں کے فکر و ذہن پر انمٹ نقوش ثبت کئے ہیں۔

اردو نے لداخی زبان کو متعدد الفاظ دیئے ہیں۔ لداخی زبان چینی خاندان کی زبانوں کے چین تبت گروپ میں شمار ہوتی ہے۔ اس کی ترکیب، ساخت، مزاج

اور صوتی اثرات تبتی زبان سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اس لئے لداخی زبان دان اور ادیب متبادل الفاظ کے لئے تبتی ماخذ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور مجرد الفاظ اور غیر مجرد چیزوں کے لئے تبتی مرکب اور مفرد الفاظ مستعار لیتے ہیں۔ لداخی الفاظ یا تبتی الفاظ کے مرکبات سے تلمیحیں اور اصطلاحیں وضع کرتے ہیں۔ اردو، ہندی اور فارسی الفاظ اس میں نہیں پھبتے۔

ڈوگری، پنجابی، کشمیری اور گوجری زبانوں کی طرح لداخی میں اردو اور ہندی الفاظ کی بھرمار نہیں ہے۔ تاہم صدیوں کے میل جول کی وجہ سے بہت سارے اردو اور کچھ ترکی، کشمیری اور انگریزی الفاظ لداخی میں رچ بس گئے ہیں اور لداخی زبان کے ناقابلِ تقسیم جز بن گئے ہیں۔

مثال کے طور پر اردو الفاظ جیسے کمبل، بنیان، کنٹوپ، دف، چلم، نائے، کمرہ، کلچہ، بقچہ، تولیہ، میز، پیوند، دیدی، خواجہ، برقعہ، گلاب، قالین، شال، گوشتابہ، یخنی، کباب، توپ، دری، مخمل، رنگ، ٹماٹر، پھول گوبھی، آلو، دیگ، ٹھیک، خوب، ارہ، سیاہ وغیرہ لداخی بول چال میں استعمال ہوتے ہیں۔

بہت سارے الفاظ لداخی سانچے میں ڈھل گئے ہیں اور بگڑی صورت میں لداخی زبان میں مستعمل ہیں۔ مثلاً

| اردو | لداخی | اردو | لداخی |
| --- | --- | --- | --- |
| دمامہ | دمن | بالٹی | بالٹین |
| چٹیا | چوتی | جنازہ | جناز |
| چادر | ژانزر | قمیض | کمیز |
| موتی | موتیک | کھجور | خسور |

| اردو | لداخی |
|---|---|
| ڈاین | ڈین |
| مسخرا | مسکر |
| چائے | چار |
| پلاؤ | پولا |
| طشت | طاس |
| قفل | کُولیک |
| بندوق | تُوبق |
| تمغہ | تغمہ |
| سموسہ | سمسو |
| پاپوش | پابو |
| توا | تاؤ |
| تمباکو | تمق |
| الائچی | لیشی |

| اردو | لداخی |
|---|---|
| بگھار | بغار |
| وسوسہ | وسوس |
| مُردار | ملدار |
| موم بتی | بتی |
| سُرنائی | سُرنا |
| فلیتہ | فتیلہ |
| دارچینی | دال چین |
| کھانڈ | خارا |
| پراٹھا | پرونٹا |
| نیلام | لیلم |
| مسجد | مجید |
| آبا | آوا |

کئی دفعہ لداخی اردو اور لداخی ہم معنی الفاظ ایک ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ جیسے کھیل شرم، کٹمز قانون، ٹھل بے گار، خدا قونجوق وغیرہ۔

لداخیوں نے اردو الفاظ سے لداخی انداز میں حروفِ مکبّر اور حروف تصغیر بنائے ہیں۔ جیسے دیگ سے دیگچن یا بڑی دیگ، دیگچونگ یعنی دیگچہ وغیرہ۔

کئی اردو الفاظ لداخی میں دوسرے معانی میں استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے اردو الفاظ خوشی، ٹوٹا، منّت، حساب، ادب، غدود، خوب، کھیل، بُو، قدر

وغیرہ سے بنے محاورے یا فقرے ملاحظہ کیجئے :

خوشی چین ______ متلون مزاج

ٹوٹا پھوق چیس ______ نقصان اٹھانا

منّت چوچیس ______ بے مروتی سے ٹرخانا ۔ کترانا

حساب چیپک دُوگ ______ تھوڑا بہت ہے

ادب چیپک دُوگ ______ کچھ کچھ ہے

غدُود ______ کمینہ آدمی ۔ پاجی

خُوب دُوگ ______ بہت ہیں

کھیل تب چیس ______ کوئی چیز کسی سے خرید کر اسے نفع پر بیچنا

لُو میدوگ ______ نام ونشان نہیں ہے

زُوگسپو قدر چوس ______ صحت کا خیال رکھئے

زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ۔ اسے جغرافیائی حدبندیوں یا خانوں میں بند نہیں کیا جاسکتا ۔

اُردو گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے ۔ یہ برصغیر ہند کے ہندو مسلم تمدّن کا مشترکہ ورثہ اور فرقہ دارانہ اتحاد کی یادگار ہے ۔ کروڑوں لوگ اسے بولتے، پڑھتے اور لکھتے ہیں ۔ اُردو کو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہے ۔ اس کی چاشنی، حلاوت، گھلاوٹ اور مٹھاس نے ہر ایک کو اس کا گرویدہ بنایا ہے ۔

اُردو کو ریاست میں عمومی اور لداخ میں خصوصی طور فروغ دینے کیلئے حسبِ ذیل چند تجاویز پیش کی جاتی ہیں :

(۱) ریاست کے تینوں خطّوں میں قائم کلچرل اکادمی اور محکمہ اطلاعات کے

دفتروں سے منسلک ایک شاخ یا ادارہ کھولا جائے جو اُردو کی ترقی اور ترویج کیلئے کام کرے۔

(ب) یہ ادارے محکمہ تعلیم، مقامی ادیبوں اور ادب نوازوں کے اشتراک سے سیمیناروں، ورک شاپوں اور کانفرنسوں کا اہتمام کریں اور نامور ادیبوں اور مفکروں کے دن منایا کریں۔

(ج) کلچرل اکادمی کا مرکزی دفتر جموں اور وادی کی طرح لیہہ اور کرگل میں بھی اُردو ادب اور زبان پر مجالس اور سیمینار منعقد کرے۔

(د) لداخ میں کوئی اُردو کاتب نہیں ہے۔ ہر سال لیہہ اور کرگل سے کتابت اور خوشنویسی کی تربیت کے لئے کم سے کم دو دو امیدوار لئے جائیں۔

(ہ) لداخ ایک ایسا خطّہ ہے جو سال میں چھ یا سات ماہ ریاست اور ملک کے دوسرے حصّوں سے منقطع رہتا ہے۔ یہاں کا بڑا مسئلہ ابلاغ اور ترسیل کا فقدان ہے۔ لداخ میں کوئی اخبار یا جریدہ نہیں نکلتا۔ سب سے بڑا مسئلہ چھپائی کی مشین ہے۔ ریاستی سرکار کو خطّے میں اُردو پریس کی سہولت فراہم کرنے کیلئے غور کرنا چاہیئے۔

(و) سرینگر کی طرح لیہہ اور کرگل میں کلچرل اکادمی سے منسلک لداخی، اُردو اور انگریزی مطبوعات کی فروخت کیلئے کتاب گھر کھولا جائے۔

(ز) خاص طور پر ریاستی سرکار کو زبان سے متعلق ایک واضح اور ٹھوس پالیسی اپنانی چاہیئے اور سرکاری زبان ہونے کی حیثیت سے ریاست کے تمام سرکاری اور پرائیویٹ سکولوں میں اُردو کی تعلیم لازمی قرار دینی چاہیئے۔

غلام نبی ناظر*

# کشمیر میں اُردو شاعری کے پچاس سال

اُردو زبان و ادب کا جنم ہندوستان میں مُغلوں کا دورِ حکومت شروع ہوتے ہی لشکری زبان کی صورت میں ہوا تو اس نے بہت کم وقت میں اپنے آقاؤں کی سرپرستی میں ہی دہلی اور کشمیر کا درمیانی فاصلہ طے کیا اور یہاں اپنے لئے ایک پُرفضا وادی کی حسین و جمیل گود میں پل کر اپنے دائرہ کار کو اور وسعت سے ہمکنار کر دیا اور ہر پہلو سے اپنے پھلنے پھولنے کے لائق آب و ہوا پاکر پھیلنا شروع کیا۔ سو سوا سو سال سے کچھ اوپر کا وقت گذار کر یہ لاڈلی زبان بیرونی ہوتے ہوئے بھی حکومت کے ایوانوں میں جگہ پاکر پیار اور قدر و منزلت سے سرفراز ہوئی اور یہاں کی اصلی زبان سے آنکھیں چار کرنے لگی۔ یوں تو عام طور پر ہر زبان نے اپنا دفترِ ادب شعر و شاعری سے ہی کھولا ہے۔ مگر اُردو زبان نے دہلی یا کشمیر میں بول چال کی زبان سے بسم اللہ کر کے نثر سے اپنا

* یاری پورہ، اننت ناگ، کشمیر

دفترِ ادب کھولا ہے ۔ اُردو زبان پہلے جموں اور پھر کشمیر میں داخل ہوکر اپنی بنیادیں اُستوار کر رہی تھی کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ (۱۸۵۷ء ۔ ۱۸۸۵ء) کا دورِ حکومت شروع ہوا اور یہ دور پہلے زمانے کی نسبت امن و آشتی کا زمانہ رہا اور علم و ادب کی ترقی کیلئے مناسب فضا قائم ہوئی ۔ مہاراجہ کے درباری فارسی علم و ادب کے استاد تھے۔ اور اردو زبان کے ساتھ بھی اُن کا تعلّق قائم رہا اور ترقی کرتا گیا ۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانے میں کئی تحریری کام اُردو میں ہوئے ۔ اُردو میں رپورٹیں لکھی جاتی تھیں اور ڈوگری اور ہندی کے شانہ بشانہ اردو بھی ترجمے کی زبان بن گئی تھی ۔ عربی اور فارسی زبانوں کی کتابیں اُردو میں ترجمہ ہوکر شائع ہوئیں ۔ اگرچہ اُردو سرکاری زبان کا درجہ نہ پا سکی مگر قبولیت عامہ حاصل کرنے میں آگے ہی آگے بڑھتی گئی ۔ اُسی زمانے میں پہلا اُردو پریس قائم ہوا اور اُسی زمانے کے ادیبوں میں ہرگوپال کول خستہ کا نام سرِفہرست ہے ۔ یہ شبلیؔ اور حالیؔ کے ہم عصر رہے ہیں ۔ لاہور میں قیام پذیر تھے اور کئی پرچوں کے ساتھ وابستہ رہے اور کئی بڑے ماہرینِ تعلیم سے ملتے تھے اور نئے جذبات و خیالات سے آگاہی پاتے تھے ۔ اُردو کا مزاج رکھنے والے خستہؔ اعلیٰ پائے کے شاعر اور نثر نگار تھے ۔ وہ ۱۸۷۶ء کشمیر آئے تو مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار سے وابستہ ہوگئے ۔ وہ اردو میں کشمیر کی پہلی تاریخ "گلدستۂ کشمیر" کے مصنّف تھے جسمیں انہوں نے قدیم سے لیکر مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد تک کے حالات و واقعات لکھے ۔ کتاب کی عبارت رواں اور شُستہ ہے ۔ انہوں نے اردو میں اور بھی بہت کچھ لکھا اور اس طرح اُردو شاعری کے لئے بھی ایک زرخیز میدان تیار ہوا ۔ اُن کے چھوٹے بھائی سالگرام سالکؔ نے بھی اُردو زبان کو اپنا ذریعہ اظہار بنا کر بہت کچھ لکھا اور اُردو قصرِ شعر کی کشمیر میں بنیاد رکھ دی اور انہوں نے خود کئی مثنویاں اور نظمیں

بھی اُردو میں لکھیں اس طرح وہ کشمیر کے پہلے اُردو شاعر اور پروفیسر عبد القادر سروری کی زبان میں "کشمیر کے دو ادیب دو بھائی" کے خطاب سے موصوف ہو گئے۔

ہرگوپال کول خستہ کی ایک غزل کے دو شعر دیکھئے ؎

کیا بتائیں جہاں میں کیا دیکھا ۔۔۔ ہر طرف جلوۂ خدا دیکھا

کیا بھروسہ ہے دم کا اے آدم ۔۔۔ دم کو ہر دم گیا ہوا دیکھا

سالگ رام سالک نے کافی شعری سرمایہ چھوڑا۔ ان کی ایک غزل کا ایک شعر دیکھئے ؎

گرداب محبت سے ہوا کوئی نہ جاں بر

یہ بحر وہ ہے جس کا کنارا نہیں ہوتا

یہ سلسلہ ۱۹۳۰ء کے قریب تک چلتا رہا اور پھر شعری سرمایہ جمع ہونے کا سلسلہ یہاں جاری ہوا اور کئی شعراء اپنی اپنی بساط کے مطابق یہاں اُردو شعری سرمایہ میں اضافہ کرتے گئے اور ۱۹۴۷ء تک ایک خاص رنگ غالب رہا، جس میں غیر ملکی حکمرانوں اور شخصی حکومت کے ظلم و ستم کی داستان اور اس حالتِ غلامی سے چھٹکارا پانے کی خواہشوں نے مختلف رنگ و روپ میں شعری تخلیقات میں جگہ پائی اور کہیں مذہبی موضوعات کا غلبہ رہا۔ اس دور میں یہاں کے اکثر نوجوان شعراء سیماب اکبر آبادی جیسے شعراء کے زیر اثر رہے۔ حفیظ جالندھری کی رومانی شاعری اور فطرت کی پرستاری کی خصوصیات سے مرصع نظموں کا چلن بھی سارے ہندوستان میں رہا اور یہاں تک بھی اس کا اثر پہنچا۔

۱۹۴۷ء کے بعد سے جو دور شروع ہوتا ہے۔ وہ ایک سیاسی جدو جہد اور کشمکش کا نتیجہ دکھائی دیتا ہے اور اسی دور میں سماجی اور معاشی تعمیر نو کو فروغ دینے کی طرف توجہ دی جانے لگی۔ اس میں شک نہیں کہ برِصغیر کی تقسیم کی وجہ سے

رنگارنگ مسائل پیدا ہونے لگے خاص کر الحاقِ کشمیر اور قبائلی ریڈ نے ایک نئی
صورت حال سے یہاں کے لوگوں کو دوچار کیا۔ اِدھر نوجوانوں کو تہذیب و ثقافت
اور ادب کی طرف متوجہ کرنے کے سلسلے میں تمام تر ذرایع اختیار کرنے کی کوشش کی
گئی اور PROGRESSIVE WRITERS ASSOCIATION وغیرہ
کا قیام عمل میں لایا گیا۔ شعرا نے نئی کروٹ لی اور نئے زاویئے سے سوچنے لگے تو
کشمیری ادب کے ساتھ ساتھ اُردو ادب و شعر کو بھی ترقی پسند رویئے نے متاثر کیا۔
اگر چہ ادب کی راہیں روایتی تھیں۔ لیکن اب یہ راہیں زندگی کی خاطر کھلنے لگیں اور
ادب برائے ادب کی جگہ ادب برائے زندگی کا نظریہ سامنے آیا اور کشمیر میں بہت سے
اُردو زبان میں لکھنے والے شاعر اس صورت حال کے پیشِ نظر اب صرف کشمیری
زبان کو اپنانے لگے اور اردو شاعری کے میدان میں لے دے کے چند ہی شعرا رہے
جن میں غلام رسول آزاد جو محکمہ جنگلات میں رینجر کے عہدہ پر فائز تھے اور کامیاب
شاعر تھے۔ وہ مناظرِ قدرت اور مذہبی موضوعات پر لکھتے تھے۔ ان کی نظم "موسم بہار"
کا یہ شعر دیکھئے ؎

یہ موسمِ بہار دیکھ ہجومِ لالہ زار دیکھ
وہ تختۂ گلاب دیکھ بہارِ پُر شباب دیکھ

کشمیری زبان کے اہم اور سرکردہ شاعر مثلاً رحمان راہیؔ، امین کاملؔ اور
فاضل کشمیری نے اگر چہ اردو زبان میں شعر کہنا اب لگ بھگ ترک کیا ہے مگر
انہوں نے بھی اپنے ابتدائی دور میں اچھا خاصا اردو شعری سرمایہ چھوڑا ہے، جسمیں
عمومیت کے ساتھ رومانی فضا اور نئی تحریکوں کے ساتھ ان کا تعلق نظر آتا ہے اور
سب نے اپنے اپنے مخصوص رنگ میں اعلیٰ پائے کے نمونے چھوڑے ہیں۔

فاضلؔ کے کلام میں پختگی اور دوسرے شعری لوازمات بھرپور رنگ میں موجود ہیں۔ موضوعات عموماً روایتی ہیں ؎

ظلم پرور تیری عادت ناشکیبا میرا غم
رحم تیرے دل میں کم ہے صبر میرے دل میں کم

غالبؔ کی زمین میں ایک غزل کا یہ شعر ؎

پھر جی میں ہے کہ باغِ تمنّا ہرا کروں
مدّت ہوئی ہے سیرِ گلستاں کئے ہوئے

کاملؔ ابتدا میں روایت پسند رہے لیکن ترقی پسندی کی رو کے ساتھ بالآخر وہ بھی بہہ گئے۔ کاملؔ نے نظمیں بھی لکھی ہیں اور غزلیں بھی۔ "مسجد دار الشکوہ" فکر اور فن کے لحاظ سے اُن کی بہت اچھی نظموں میں سے ہے۔ مسجد کی شاندار یادیں اور مسجد کی موجودہ خستہ حالی پر شاعر کا دل ایک عہد کی تباہی محسوس کرتا ہے اور لکھتا ہے ؎

مرگ و ہستی کے تسلسل کا تغیر نام ہے
اس تغیّر سے نہیں بچنے کی ہے کوئی بھی شے

"وہ لمحہ" نظم سے یہ شعر ؎

تری نظر کا تبسم تری جبین کی جھلک
اُمید بن کے نکھرتی ہے میری آہوں میں

رحمان راہیؔ نے ابتداء تو روایتی اندازِ غزل سے کی ہے۔ لیکن جلد ہی نئی تحریک سے منسلک ہوئے اور نئے عہد کی نمائندگی میں غزل کہنے لگے جسمیں رومانیت کے ساتھ نیا اسلوب اور اندازِ فکر کا بھی اثر ہے ؎

پریشاں زلف، چہرہ فق، نظر کچھ کھوئی کھوئی سی
وفورِ شوق نے تیری بھی کیا صورت بنائی ہے

چھوٹی بحر کی غزلوں میں اندازِ بیاں دلچسپ اور کھلا ہوا ہے ؎

یاد پھر اس شعلہ رو کی آگئی — آگئی اور آگ سی بھڑکا گئی
دل کی بربادی کا راہی کچھ نہ پوچھ — کھلتے کھلتے اِک کلی مُرجھا گئی

ترقی پسند احساسات کے لئے بھی راہی نے غزل کو برتا ہے ؎

نقیبِ نو نے نئے دن کا صور پھونک دیا
اندھیرا ٹوٹ چکا سونے والوں کو تو جگاؤ

راہی نے نظمیں بھی لکھی ہیں۔

ان کے علاوہ مہندر رینہ بھی تھے کہ اپنی تنوّع سے بھرپور ادبی اور صحافتی سرگرمیوں نے ان کا ذوقِ شعری بھی پروان چڑھایا اور وہ اپنے وقت کے اچھے غزل گو شعرا میں گنے جاتے ہیں۔ ایک غزل کا ایک شعر ؎

کر رہا ہوں طے خلاؤں کے راستے — پھر بھی کیا میرا جنوں بے سود ہے

اپنی ایک غزل میں اپنی سرزمین کے سخن سنجوں سے وہ یہ چبھتی ہوئی بات کہتے ہیں

اے دوست تعجّب ہوتا ہے ان لوگوں کی بدذوقی پر
کشمیر کے شاعر ہو کر بھی جو نجد و ختن کی بات کریں

غلام محمد تسنیم بھی ایک اچھے شاعر ہوئے ہیں۔ وہ بھی نظم اور غزل دونوں صنفوں میں لکھتے رہے ہیں۔

ان کے ساتھ ہی خموش سرحدی کا نام آتا ہے جنھوں نے اُردو کی محبّت میں کچھ نثر بھی لکھی اور شاعر کی حیثیت میں سیماب اکبرآبادی کے شاگردوں میں بہت

اچھا مقام پایا۔ انہوں نے اردو زبان کی وسعت اور مقبولیت پر ایک پُر کشش نظم لکھی۔ یہ دو اشعار پڑھئے ؎

مشرق کی وادیوں میں مغرب کی محفلوں میں
ہر سمت نغمہ خواں ہے اردو زباں ہماری
اک حُسنِ جاوداں ہے اک رنگِ بے خزاں ہے
ہر لحظہ نوجواں ہے اردو زباں ہماری

۵ ۔ شہ زور کاشمیری (۱۹۱۵ء - ۱۹۹۰ء) جہاں تک میرا خیال ہے کشمیر میں زیر بحث دور کے سب سے پہلے کامیاب اور پُر وقار شاعر ہیں اور سیماب اکبر آبادی سے تلمذ حاصل کر کے انہی کے فرمان پر کشمیر کے لئے اُستادی کا رُتبہ پایا اور زبان کے نکات اور شعری اسالیب پر قدرت حاصل ہو گئی۔ وہ غزل میں اُستادی کا مقام پا چکے ہیں۔ اُن کا تصوّرِ شعر جامد نہیں بلکہ زمانہ کے ساتھ ساتھ ارتقاء پذیر رہا۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے عہد کے فنی اور سماجی شعور اور عصری آگہی کو اپنی شاعری خاص کر غزل میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ وہ محسوس کرتے اور کہتے ہیں ؎

مرا گوہرِ سخن جو، تِرے کان تک نہ پہنچا
مِرے کم نصیب فن کا وہی شاہکار کیوں ہو

سید سلیمان ندوی آپ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آپ کے کلام میں اقبالؔ کی رُوح بولتی ہے۔ اس لئے آپ کو کشمیر کا اقبالؔ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن جہاں اپنا ذوق نظر گم ہو جاتا ہے وہاں اقبالؔ کی آواز کی صدائے بازگشت اُبھرتی ہے، جو دل کو تار تار کرنے کی قوّت سے محروم نظر آتی ہے۔"

جبینِ گُل پہ اِک اُلجھی ہوئی تحریر ہے ساقی
بڑے پیچاک میں گُل زار کی تقدیر ہے ساقی
صبا مُضطر، پریشاں بوئے گُل، بیتاب ہے شبنم
گلستاں پر مسلّط خوفِ دار و گیر ہے ساقی

دیگر اصنافِ سخن یعنی قطعہ اور رُباعی سے بھی وہ غافل نہیں رہے۔ لیکن ان چیزوں میں ان کا اپنا ایک مخصوص رنگ ہے ؎

جنوں میرا تو میرا ہی جنوں ہے
نہ کیوں حیران ہوں اربابِ ادراک
جنوں کا مظہرِ اکمل ہوں لیکن
گریباں ہے نہ دامن ہی مرا چاک

ترقی پسندی کی تحریک چلی تو وہ اگرچہ اس کی نمائندگی نہیں کرنا چاہتے تھے، اس کے باوجود طبقاتی کشمکش اور غربت و امارت میں فرق کو محسوس کرنا شعور کی بیداری کی دین سمجھ کر ضرور اس طرح سے اشارے کرتے ہیں ؎

خواجہ پرست آج بھی مزدور ہے یہاں
پائے خدائے زر پہ گدا سجدہ ریز ہے

انہوں نے کشمیر کے مناظر پر کئی نظمیں لکھی ہیں۔ مثلاً "وادیٔ کشمیر"۔ شالا مار باغ وغیرہ۔
اردو زبان کے ساتھ اُن کے والہانہ محبت کے سلسلے میں عبدالقادر سروری اپنی کتاب "کشمیر میں اردو" میں لکھتے ہیں:

"شہ زور اردو کے شاعر ہیں اور ان سے بڑھ کر اس زبان کے حسن اور اس کی اظہاری صلاحیتوں سے کوئی کم ہی واقف ہو سکتا

ہے۔ اپنی ایک نظم میں ان تاثرات کو وہ اردو کی زبان سے
اس طرح ظاہر کرتے ہیں ؎

میں نے جذبات کو کونین کی وسعت دی ہے
فکر کو کنگرۂ عرش کی رفعت دی ہے
نطق کو کوثر و تسنیم کی عزت دی ہے
اور تخیل کو بھی شادابیٔ جنت دی ہے"

شائستہ شہزور کا کہنا بالکل صحیح ہے کہ
"ان کی نظر وسیع، مشاہدہ گہرا اور شعری قوّت
بے مثال ہے"۔

؎ ہر ایک قلب کو شہزور شعلہ بار کیا
ترے تکلّم جادو اثر میں آگ لگے

۵ - میر غلام رسول نازکیؔ (۱۹۱۷-۱۹۹۸) ہماری ریاست کے سب سے بزرگ اور سربرآوردہ شاعر ہیں، جو کشمیری زبان کے ایک اہم اور صفِ اول کے شاعر ہیں جنہوں نے اپنے لہجے اور اسلوب سے ایک منفرد مقام پایا ہے۔ اردو میں آپ غزلیں، نظمیں اور رباعیات بھی لکھتے ہیں اور کسی مشاعرے میں آپ کی موجودگی سامعین کے لئے بے حد دلچسپی اور کشش کا باعث بنتی ہے۔ ان کی ایک نظم کا پہلا مصرعہ جیسے انہوں نے اپنے ہی حسب حال کہا ہے ع

ہم مصوّر بھی ہیں، شاعر بھی ہیں، صورت گر بھی ہیں

ان کی شاعری میں کلاسیکی تقدس اور مقصدیت سے انقطاع نہیں بلکہ اس میں ایک انفرادیت ہے۔

اُن کا پہلا شعری مجموعہ "دیدۂ تر" ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا ہے۔ اسمیں غزلیات، نظمیں اور قطعات ہیں۔ کشمیری زبان میں ان کے مجموعے "نمرود نامہ"۔ "آوازِ دوست" اور "کاوِ بیٹنہِ وول" بہت مقبول ہوئے ہیں۔ "آوازِ دوست" پر اُن کو ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ بھی ملا ہے۔ وہ روایت کے بھی علمبردار ہیں اور جدید دریافتوں اور علم و آگاہی کے عروج سے بھی بھرپور وابستگی رکھتے ہیں اور ان کا کلام ان دونوں چیزوں کے اتصال کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ ان کا کلام رسائل میں چھپتا رہا اور اب ان کا دوسرا مجموعہ "متاعِ فقیر" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اُن کا اکثر کلام روحانی تجربات کا آئینہ ہے۔ نعت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بلند ترین اور عظیم ترین شان کو پیشِ نظر رکھ کر انہوں نے اپنی استادانہ صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے ــ اُن کا آہنگ اسی لئے یہ زیادہ کامیاب اور پُر اثر محسوس ہوتا ہے ؎

تمہارے ساتھ تھا ہر لمحہ نغمۂ جبرئیل
وہ نغمہ جس میں معانی کی روح تھی تحلیل

○

جب انا الحق کہنے والے لوگ ہی رخصت ہوئے
پھر زبان پر قصۂ دار و رسن کیا آئے گا

○

اب تو دن ڈھلنے لگا سائے بھی لمبے ہو گئے
ہم بھی گھر جائیں گے اپنے اپنے گھر جاتے ہیں لوگ

۵ ـــ غلام محمد میر طاؤس نے بھی کشمیر کے اردو شاعروں میں ایک اہم مقام پایا ہے۔ وہ جدید ادبی تقاضوں اور معیاروں کو بہت اچھی طرح جذب کرنیوالوں

میں گِنے جاتے ہیں۔ طاؤس نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل سے کی اور ان کی غزل بہت جلد جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہو گئی۔ اپنے زمانے کی ضرورتوں کے پیشِ نظر وہ نظم کہنے پر بھی مائل ہو گئے اور اُن کی نظم اپنے ذاتی تجربوں کی وجہ سے ایک انفرادی رنگ کی حامل ہے۔ اپنی نظم "یورپ اور جنگ" میں اہلِ یورپ کے تہذیب و تمدّن کے علمبردار ہونے کی تضحیک یوں کی ہے ؎

جسے اہلِ جہاں سرچشمۂ تہذیب کہتے تھے
وہ جس کی خام کاری کو نئی ترکیب کہتے تھے

○

اخوّت اور آزادی یہ کہتے تھے جو قرباں ہیں
وہی قومیں معاذ اللہ بہم دست و گریباں ہیں

ان کی کئی نظمیں کشمیر اور اہلِ کشمیر کے مختلف اوصاف اور روایتی اور تاریخی اہمیت کی حامل ہیں اور اپنے زعفران زاروں کے دل کو کھینچ لینے والے مناظر پر ان کی ایک نظم "چندہ ہار" کافی مشہور ہے۔ اس کا مرکزی کردار حبہ خاتون ہے ؎

یہ گاؤں جس کی مٹّی نے اکسیر کا رتبہ پایا ہے
یہ گاؤں جس کو کھو کر ہم نے قسمت سے پھر پایا ہے
اک بار یہاں اک مہ وش نے جب درد کے نغمے گائے تھے
افلاک نے سینہ کھولا تھا انوار پہ سائے چھائے تھے

غزل میں تو وہ اپنا ایک منفرد اندازِ اظہار رکھتے تھے ؎

میں ہوں ایک تشنہ کام محفلِ انبساط میں — مضطرب و شکستہ جام منتظر و تہی سبو
آگر ترے بغیر ہے میرا شباب سوگوار — تیرے بغیر نوحہ خواں کشتِ گل و کنارِ جو

آپ اعلیٰ پائے کا تنقیدی شعور بھی رکھتے تھے اور نثر نگاری کے بھی آپ نے شاندار نمونے چھوڑے ہیں۔ آپ کا مجموعہ کلام "موج موج" ۱۹۸۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔

۵ — تنہا انصاری (۱۹۳۰ء - ۱۹۸۲ء) کے دبستان شاعری میں مختلف اصنافِ سخن پر طبع آزمائی ہوئی ہے۔ غزل اور نظم، دونوں میں اعلیٰ پائے کے نمونے چھوڑے ہیں۔ حسین علی تنہا انصاری کشمیر میں اردو کلاسیکی انداز کے مرثیوں میں بلند رتبہ حاصل کر چکے ہیں۔ اُن کا آبائی گاؤں دلنہ، بارہمولہ میں واقع ہے۔ تنہا کم عمری میں ہی شعر و سخن سے دلچسپی رکھتے تھے انہوں نے شاعری کی ابتدا غزل سے کی۔ ابتدا میں روایتی انداز اختیار کیا اور بعد میں تقاضائے وقت کے پیشِ نظر نئی راہوں کو دریافت کیا اور فکر کو وسعت دیکر اپنے عہد کی آواز اپنی شاعری میں سمونے کی کوشش کی۔ ان کی ایک غزل کے یہ دو شعر اس نظریئے کی تصدیق کرتے ہیں ؎

حماقت ہے اب ذکرِ رُخسار و گیسو — طلسمِ محبت کے پروردگارو
تلاشِ نظر اک فریبِ نظر ہے — نظر کی نوازش کے اُمیدوارو

دوسری غزل کا ایک شعر ہے ؎

کیسے بھولوں گا وہ اُٹھنا خواب سے کاکُل بدوش
بے خودی اور اُس پہ وہ بے خود سی انگڑائی تری

اُن کی نظمیں طویل ہوتے ہوئے بھی اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ جہاں تنہا نے اندرونی ردِّ عمل اور مخصوص مشاہدات اور اندازِ بیان سے ان میں انفرادیت پیدا کی ہے۔ "چاندنی رات میں جھیل ڈل کی سیر" اور "احساسِ بہار" جیسی نظمیں اس کی تصدیق کرتی ہیں۔

۵ — عبدالحق برق نظم اور غزل دونوں لکھتے ہیں۔ اُن کی ایک غزل کے یہ

دو۲ شعر دیکھئے ؎

عشق بیداریٔ کامل ہے کوئی خواب نہیں
نشتر و خار ہے یہ بسترِ سنجاب نہیں
اک ذرا اور ہٹا دے رخِ روشن سے نقاب
چشمِ مشتاق ابھی دید سے سیراب نہیں

٥ — سیفیؔ سوپوری نے بھی اپنی شاعری غزل سے ہی شروع کی اور ایک پختہ کار صاحبِ فن کی حیثیت میں ابھرے۔ ضرورتِ زمانہ نے ان سے کئی نظمیں بھی لکھوائیں۔ وہ غزل میں اپنے ماحول میں پائے جانے والے موضوعات کا عکس پیش کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ اندازِ بیاں سادہ مگر پُرکار ہوتا ہے ؎

کل رات بھی کیا جانے کہ ہم لوگ کہاں تھے
آئینے کا کہنا ہے کہ پردے میں نہاں تھے
گم گشتہ تمناؤں سے کیا آنکھ ملاتے
کاندھوں پہ اٹھائے ہوئے ہم بارِ گراں تھے

ایک نظم "مسافر" کا ایک اقتباس دیکھئے کہ فنکارانہ مگر سیدھا سادہ برتاؤ اور منظر کشی کا ایک حسین اور پُرکشش نمونہ ہے ؎

وہ دیکھئے شام ہو چکی ہے
غروب کے بعد سحر کی وادی میں چپکے چپکے سیاہیٔ شب اتر رہی ہے
جو نغمے تھے خاموش ہو گئے
ہوا بھی ساکت ہے جیسے تھک کر ٹھہر گئی ہو۔

٥ — شوریدہ کاشمیری (۱۹۲۴ء — ۱۹۹۱ء) کلاسیکی آداب و روایات کا مطالعہ

رکھتے ہوئے بھی اپنے عہد سے انقطاع نہیں چاہتے ہیں بلکہ اپنے گرد و پیش کی خوب آگاہی رکھتے ہیں۔ حامدی کاشمیری کہتے ہیں:

"شوریدہ کاشمیری جہاں غزل کے تعلق سے اپنی قدامت پسندی کا احساس دلاتے ہیں وہاں آزاد اور حالی کی قائم کردہ نظمیہ روایات سے وابستگی سے جدت پسندی کا ثبوت دیتے ہیں"

شوریدہ کی شاعری میں کلاسیکی ترکیبات و استعارات اُن کے شعری رویئے کی غمازی کرتے ہیں۔ اُن کی غزلوں میں روایتی خیال آرائیوں کے ساتھ تازگی تخیل اور پیکر تراشی کی نزاکت محسوس کی جاسکتی ہے۔ شوریدہ احساس، جذبے اور مشاہدے میں دیانت داری، سادگی اور روایت کے پہلو بہ پہلو روانی اور مٹھاس بھی پیدا کرتے ہیں ؎

یہ سرخیٔ رُخسار یہ سینے پہ صباحت
کیا رنگِ شفق نورِ سحر دیکھ رہا ہوں

○

حسن اس درجہ شعلہ بار ہوا　　لاکھ پردوں سے آشکار ہوا

"جوشِ جنوں" کا شاعر "جذبِ دروں" تک سفر کرتے کرتے ایک اور بلند مقام تک رسائی حاصل کر چکا ہے۔ شوریدہ کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جن میں تخیل کی بلندی اور مشاہدات کی تازگی اور جذبات کی شدت، انسانی ہمدردی اور اخوت کے جذبے کی کشش بدرجۂ اتم موجود ہے ؎

بن گیا تھا دل زمانے کا ہدف　　اب زمانہ خود نشانہ ہو گیا

ترے رخ سے روشن ہوا سب جہاں

ترے گیسوؤں سے ٹپکتا رہا

اپنے وطن میں فطرت کی نیرنگیوں پر مشتمل نظموں کا ایک اچھا سلسلہ شوریدہ نے پیش کیا ہے اور بھی کئی رنگ کی نظمیں ان کے مخصوص تخلیقی حُسن سے آراستہ ہوتی ہیں۔ "باغِ نشاط"۔ "نیرنگ زمستان"۔ "ڈل کا منظر" اور "ڈل اور چاند" جیسی نظمیں ایک حسین اور لازوال تخلیقی سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایک بند "ڈل کا منظر" سے ؎

ڈل سہانا ہے کیا چاندنی رات میں ہے یہ غرقاب کیا جلوۂ ذات میں

ایک طوفان برپا ہے جذبات میں جانے ڈوبا ہے دل کن خیالات میں

غوطہ زن ہو کے موتی لگے ہاتھ کچھ

دامنِ دل میں لایا ہوں میں ساتھ کچھ

اب تک اُن کے دو شعری مجموعے "جوشِ جنوں" (۱۹۸۱ء) "جذبِ درون" (۱۹۸۶ء) شائع ہو چکے ہیں۔

۵ - قیصر قلندر (۹۸ - ۱۹۲۶ء) ۱۹۴۷ء ہی سے پہلے انفارمیشن اور پھر ریڈیو کشمیر سے وابستہ ہو گئے۔ عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

"قیصر کے ادبی اور شعری کردار کی تعمیر میں تین نمایاں عناصر کا حصّہ ہے۔ شعر گوئی کا ذوق انہیں گویا ورثتاً ملا تھا۔ ریڈیو کی ملازمت کے سلسلے میں موسیقی اور ڈرامہ سے انہیں گہرا لگاؤ رہا۔ اس طرح غیر شعوری طور پر شاعری، موسیقی اور ڈرامہ کے تینوں عناصر ان کی تخلیقات کے محرک بن گئے"۔

قیصر کی غزل میں نئے زمانے کے فکر و فن کے خط و خال نمایاں ہیں اور انکی

Seemab

QASR-UL-ADAB,
AGRA.

Dated 17. 2. 1943

بسمہ تعالیٰ

عزیزی اکبر صاحب ۔ السلام علیکم

رقعہ اور کتاب "شعر کی شرح" بسلسلۂ ثانی موصول ہے ۔

معلوم نہیں آپ یہ کس سلسلے کی کڑی سمجھ رہے ہیں؟ ۔ کیا آپ ترتیب وار تمام کلام کی شرح کرنا چاہتے ہیں؟ ۔

اگر شرح لکھنے پر طبیعت آمادہ ہے تو پھر "طلسم عجم" کی شرح کرنے میں کیوں تامل ہو رہا ہے؟ ۔

از بسم اللہ تا تائے تمت شرح لکھ ڈالیے ۔

"کام کی چیز ہے یہ وقت پر کام آئے گی"

امید کہ آپ بخیریت ہوں گے

دعاگو
سیماب اکبرآبادی

عکس خط سیماب اکبرآبادی

مجھے خوشی ہے کہ اکادمی کے اہتمام سے دوماہی "شیرازہ" کا خاص ثقافت نمبر

شیرازہ نے ماضی میں جو شاندار معیار برقرار رکھا ہے اُس کے پیش نظر اُمید ہے کہ

ثقافتی ورثے کی بھرپور ترجمانی کر سکے گا!

غلام محمد صادق

صدر

جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹس کلچر اینڈ لینگویجز

سرینگر

غزلوں میں فکر و فن اور اسلوب کی جدّت بھرپور رنگ میں مشاہدہ کی جا سکتی ہے۔

جب درد کی شمعیں جلتی ہیں احساس کے نازک سینے میں
اِک حُسن سا شامل ہوتا ہے پھر تنہا تنہا جینے میں

○

یادوں کو سُلا دوں کہ میں لمحوں کو پکاروں     اس رات کے صحرا میں اکیلا ہی کھڑا ہوں

○

بے باکیٔ اظہار سے مجبور ہوں قیصرؔ
حق بات کہوں یا نہ کہوں سوچ رہا ہوں

عبدالقادر سروریؔ لکھتے ہیں :

"قیصرؔ کی شاعری پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پچاسویں دہے[1] کے اواخر تک پنجاب کے حلقۂ شعراء خاص طور پر حفیظؔ جالندھری کے ہلکے پھلکے انداز کی نظموں کا گہرا اثر رہا۔ چنانچہ اس دوران جو نظمیں انہوں نے لکھی ہیں ان میں رواں بحروں اور لفظی ترنّم پر زیادہ زور ملتا ہے۔ "شام شالیمار" اسی زمانے کی لکھی ہوئی نظم ہے۔"

قیصرؔ نے اردو میں "تصوّریئے" ایجاد کر کے ایک حسین تخلیقی گلدستہ اسے دیا ہے۔ قیصرؔ کو موسیقیت سے گہرا شغف ہے اور اس کے رموز سے وہ آگاہ ہیں[2]۔ اس سلسلے میں علی جواد زیدیؔ نے خوب کہا ہے :

"قیصرؔ ایک فنکار اور تجربہ پسند فنکار ہے اور قیصرؔ کی تجربہ پسند طبیعت نے ایک نیا گوشہ ڈھونڈا ہے۔"

---

[1] یہ پانچویں دہے ہونا چاہیے۔
[2] ۱۹۹۰ء میں موسیقی پر اُن کی کتاب "ہماری موسیقی" کے نام سے شائع ہوئی۔ (ادارہ)

انہوں نے کئی تصوّریئے لکھے ہیں، جن میں سے سات تصوّریئے "سازِ جمال" کے نام سے ۱۹۶۶ء میں ایک مجموعے کی صورت میں چھپے ہیں اور ایک اور مجموعہ "سازِ آرزو" کے نام سے مرتّب ہوا ہے۔

۵- اکبرؔ جے پوری (۹۸-۱۹۲۶ء)۔ ان کی شاعری میں روایت کا سلسلہ کسی حد تک قائم ہے۔ پھر بھی اپنی عصری تحریکوں سے وہ دور بھی نہیں ہیں ؎

ہر شام کے پردے میں ہوتی ہے سحر پنہاں
مرنا بھی حقیقت میں جینے کا بہانہ ہے

اُن کے اندازِ تغزّل کو نمایاں کرنے کیلئے یہ تین۳ شعر پیش کئے جا سکتے ہیں ؎

ہر طرف پھیلا ہوا ہے حُسن کا دامِ فریب
پاؤں اس وادی میں رکھنا دیکھ اے دل دیکھ کر

○

اے دل نہ جائے ہاتھ سے میدانِ اضطراب
بحث آ پڑی ہے برق سے اے جانِ اضطراب

○

گدگدا کر، آپ دل کو ناخنِ شمشیر سے
ہر دہانِ زخم کا پھر مسکرانا دیکھئے

اکبرؔ نے بہت سی نظمیں بھی لکھی ہیں جن میں "جنّتِ کاشمر" "تنظیم نو بہار" کا پسِ منظر بھی کشمیر ہی کا ہے۔ "جنّت کاشمر" سے چند اشعار ؎

رو کشِ انبارِ فردوس آبشار کاشمر
نازشِ گلزارِ جنّت لالہ زارِ کاشمر

نخلِ طوبیٰ پست از شاخِ چنارِ کاشمر

فرعِ سدرہ شرمگیں از برگ و بارِ کاشمر

اکبرؔ کی نعتوں میں ایک مخصوص رنگ ہے اور اظہارِ عقیدت اور اندازِ بیان میں ایک جدّت ہے جو اپنی طرف خصوصیت کے ساتھ متوجہ کرتی ہے ؎

قربان میں نقاشِ ازل تیری ادا کے

عالم کو کیا دنگ یہ تصویر بنا کے

وہ مطلعِ اوّل کہ نبوّت کے صحف میں

جبریلِ امین رہ گئے مقطع ہی سُنا کے

اللہ ردیف اور احد قافیہ بن جائے

احمد کا لکھوں مصرعہ برجستہ بنا کے

اپنے بہت سے کلام میں سے کچھ انتخاب کر کے ۱۹۶۵ء میں ایک مجموعہ "سازِ شکستہ" کے نام سے شائع کیا ہے۔ میرے خیال میں اس کے بعد کا سارا کلام محتاجِ طباعت ہے۔

۵ — شہزادی کلثوم (۱۹۲۸ — ۴۹ء) جو اکبر جے پوری کی ہمشیرہ تھیں۔ وہ بھی شعر و شاعری اور مضمون نگاری میں ترقی کر رہی تھی۔ وہ غزلیں، سلام اور مناقبت لکھتی تھیں۔ ۱۹۴۹ء یعنی عنفوانِ شباب میں ہی وفات پاگئیں چند شعر ملاحظ ہوں ؎

رُخ بدل دو آج حُسن و عشق کی تصویر کا

تم بھی دامن تھام لو اب اپنے دامن گیر کا

○

جب اہلِ دل کو عشق کا عرفان ہو گیا

حُسنِ فریب کار پشیمان ہو گیا

شہزادی کلثوم نے شاعری میں ایک اچھا معیار قائم کیا تھا۔

۵ ۔ فاروق نازکی کے اب تک اُردو شاعری کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک "آخری خواب سے پہلے" اور دوسرا "لفظ لفظ نوحہ"۔ میرے خیال میں پروفیسر آل احمد سرور کا یہ تاثر فاروق نازکی کی شاعری پر صادق آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"۔۔۔۔ نظموں کے علاوہ غزلوں میں بھی آپکی شخصیت کی
کی طرحداری اور بانکپن دونوں کی بھرپور عکاسی ہے اور یہ کہنا
مشکل ہے کہ آپ کی غزل بہتر ہے یا نظم"۔

فاروق نازکی کی فکر کا تنوّع اور مشاہدے کی وسعت اور اندازِ بیان کی جدّت جیسے عناصر اپنے ماحول کے حسن و جمال اور رنگینیوں کے پہلو بہ پہلو ایک جدید اور گہرے حسیاتی اور تجرباتی عالم کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ وہ اپنے جذب دروں کو لُطف و انبساط کی شدّت کی آنچ دیکر غزل کے رنگ میں ایک دلکش اور پُر کیف انداز میں پیش کرنے کی مہارت رکھتے ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ ہو۔

شہر کے ہنگاموں میں کھو جاتا ہے اکثر میرا چہرہ
تنہائی کے تاج محل میں میرا چہرہ درپن درپن

○

اپنی زمین اپنے گلستاں جلادئے ۔۔۔ اپنے بدن کے آپنے مینار ڈھادئے

چھوٹی بحروں میں اُن کی غزلوں میں شدّتِ تاثر اور حسنِ بیان اور کھل جاتا ہے اور اپنے گرد و نواح کی آوازیں شعر کے سانچے میں ڈھل جاتی ہیں ؎

دامنِ شب پہ نوکِ خنجر سے ۔۔۔ اک نیا آفتاب لکھتا ہوں
مجھ سے کیا پوچھتے ہو نام، پتہ ۔۔۔ میں تو بس آپ کا ہی سایہ ہوں

عمیق حنفی کا کہنا ہے:

"فاروق زبان پر قدرت رکھتا ہے، ایک شاعرانہ لہجہ رکھتا ہے اور ان تجربوں سے بھی مالامال ہے جو اچھی شاعری کی جان بن جاتے ہیں اور پہچان بھی۔"

٥ — ڈاکٹر حامدی کاشمیری (۱۹۳۲ء) ایک ایسی شخصیت جو کشمیر میں اردو زبان وادب کے معماروں میں اپنا اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ آپ افسانہ، ناول، ڈرامہ اور تنقید و تحقیق اور شاعری سے دلچسپی رکھتے ہیں اور ہر صنف پر منفرد اور دنیائے اردو کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے والی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ نے زیرِ بحث دور کی ابتداء سے ہی شاعری شروع کی ہے اور اب تک تین مجموعے زیورِ طباعت سے آراستہ کر کے قارئین تک پہنچا دئے ہیں۔ وہ ہیں "عروسِ تمنا" "نایافت" اور "لاحرف"۔ آپ کشمیری زبان میں بھی لکھتے ہیں۔

حامدی صاحب اپنا ایک منفرد تخلیقی انداز و اسلوب رکھتے ہیں۔ ملک کے سب سے زیادہ چھپنے والے اور اعلےٰ معیار کے تقریباً سبھی رسائل میں اُن کے تحقیقی تنقیدی مضامین اور شعری تخلیقات وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اپنے شعری مجموعوں "عروسِ تمنا" سے "نایافت" اور "لاحرف" تک ایک لمبا ذہنی سفر طے کر کے میرے خیال میں کشمیر میں اُردو تخلیقی عمل میں خصوصاً شاعری میں اعلےٰ مقام پایا ہے۔ اُن کی تحریریں ایک مخصوص اور دلکش زبان رکھتی ہیں۔ وہ سمندر کو کوزے میں بند کرنا جانتے ہیں۔ ان کی شاعری کلاسیکی رکھ رکھاؤ کے ساتھ ساتھ جدید حسیت اور عصری آگاہی اور وُسعتِ مشاہدہ، فکری تنوع اور جدّت اسلوب سے مزیّن ہے۔ اُن کی زبان اور تراکیب اور علامات اور استعارات

کا جدید استعمال ان کی شاعری کو ایک نیا رنگ عطا کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ترقی پسندی کے زینے پر بھی قدم رکھے ہوئے تھے۔ مگر آخر وہ ۱۹۶۰ء سے بعد کی تبدیلیوں میں پیش پیش رہے ؎

رات جلتی جبیں پہ لہرائے — تیرے ہاتھوں کے شبنمی سائے
تیرے چہرے پہ غم کا سایہ ہے — کتنے لمحوں کے چاند گہنائے

○

دور تک نام و نشاں باقی نہیں
گرد میں ڈوبی ہیں خود رو جھاڑیاں

○

بے خطر پانی میں اُترے تہہ شناس
ساحلوں پر اہلِ ظاہر رہ گئے

حامدی اپنے منفرد لب و لہجہ آہنگ اور ڈکشن کے مالک ہیں اور اپنے دور کی تشنہ سامانیوں اور کربناکیوں سے الگ نہیں ؎

یہ اندھیرا ضرور پگھلے گا — خون میں میرے تابشیں ہیں بہت

○

گر گیا خون بے گناہوں کا — بڑھ گئی اشتہا زمینوں کی

○

پانیوں پر کالی آوازیں رقم ہوتی گئیں
روشنی کے جسم ڈوبے تہہ نشیں ہوتے گئے

وہ نظمیں بھی لکھتے ہیں۔ "جشن بہاراں" "گل مرگ" "شالیمار کی ایک شام"

اور "شام خزاں" وغیرہ مقامی ماحول کے حسن و جمال سے حاصل ہونے والی خصوصیات اور دل کشی سے آراستہ ہیں۔ "شالیمار کی شام" سے ایک اقتباس ؎

یہاں دھڑکتے دلوں کے حسیں فسانے ہیں
جمال و شوق کے خواب آفریں ترانے ہیں
ہر ایک شاخ کے ہاتھوں میں پھول کا ساغر
ہر ایک کیاری ہے کتنے شراب خانے ہیں

حامدی صاحب کے ہزار رنگ ہیں جن کا احاطہ اس مختصر تعارفی خاکے میں نہیں ہو سکتا ؎

معدنِ لعل و جواہر رہ گئے　　　　کالے پانی میں جزائر رہ گئے

حامدی کے شعروں میں بندشِ الفاظ کا سلسلہ انتہائی اہم اور دلآویز ہے۔

۵ — سلطان الحق شہیدی (۱۹۳۵ء) گذشتہ تیس[۳۰] بتیس[۳۲] سال سے اردو میں شعر کہہ رہے ہیں —— غزلیں بھی لکھتے ہیں اور نظمیں بھی۔ تحقیق و ترجمے کا کام بھی کر رہے ہیں۔ غزل میں فکر و خیال کا نیا پن ہے۔ اس میں شک نہیں کہ روایتی اندازِ اظہار و بیان سے دامن چھڑانا بہت مشکل ہے۔ لیکن پھر بھی شہیدی کی کوشش کامیابی کی طرف گامزن ہے اور وہ آزاد نظمیں بھی اچھی خاصی لکھتے ہیں۔ ایک غزل کے دو شعر دیکھئے ؎

بہار آتے ہی مرجھائے آرزو کے گلاب
مری حیات میں ایسے بھی دور آئے ہیں
یہ دور دورِ تصادم ہے باغبانوں کا
چمن چمن ہے دھواں یہ بھی دیکھ پائے ہیں

نعت لکھنے کا شہیدیؔ کا ایک الگ اور منفرد انداز ہے ؎

روح القدس مثال ہے یوسف جمال ہے
وہ اشرف البشر کہ خدائی کا لال ہے
زہراب زیست چشمۂ حیواں بنادیا
ابرِ کرم ہے وہ کہ برستا گلال ہے

○ — ہمدمؔ کاشمیری (۱۹۳۷ء)۔ عبدالقیوم خان ہمدمؔ کاشمیری غزل بھی لکھتے ہیں اور نظم بھی۔ غزل میں روایت سے منقطع ہونا پسند نہیں کرتے اور پھر بھی اسلوب میں نیاپن پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نظم بھی لکھتے ہیں۔ کچھ اشعار ملاحظ ہوں ؎

چاندنی راتیں ہوں یا برسات کے دن ہمنشین
دل بہلتا ہی نہیں لاکھوں جتن ہم نے کئے

○

یہ فقط سوز تمنّا کا صلہ ہے اے دوست
تیرگی میں بھی ہے روشن مرا کاشانۂ دل

○ — قاضی غلام محمد (۱۹۳۶ء) قاضی صاحب عموماً مزاحیہ انداز اپنائے شعر کہتے ہیں۔ اُردو اور کشمیری دونوں ہی زبانوں میں جس میں زندگی ہے اور زندہ دلی ہے۔ سیّد محی الدّین قادری زورؔ آپ کے ایک مجموعہ کلام "حرفِ شیرین" کے تعارف میں لکھتے ہیں:

"قاضی صاحب کے کلام میں زندگی اور زندہ دلی کے جن عناصر کی فراوانی ہے۔ اس کلام کے مطالعے کے بعد نہ صرف آگاہی ہوتی ہے بلکہ اندازہ ہوتا ہے کہ ایسی جاندار اور پُر لطف

شاعری کس قسم کے ماحول میں نمودار ہو سکتی ہے۔ قاضی صاحب
کا سنجیدہ کلام قدیم اور جدید اسالیبِ سخن کے امتزاج سے
معمور ہے جو فطرتی اور بے لوث شاعر ہی کے موئے قلم کا
نتیجہ ہو سکتا ہے۔"

قاضی کو پیروڈی لکھنے میں یدطولیٰ حاصل ہے۔ نظم "مہمانِ عزیز" سے
چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ یوں تو پوری نظم کو پڑھ کر ہی لُطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔

میں اپنی بیوی سے گرم کلام تھا یارو
شبِ بہار بھی آیا جو ناگہاں مہماں
خلوص و شوقِ ارادت کی انتہا یہ ہے
کہ میزباں ہے نہاں گھر میں اور عیاں مہماں

"فی المواعظ" عنوان کا ایک قطعہ اس طرح ہے

بیوی کو خدا کی مہربانی سمجھو | جیسی بھی ہو اس کو آسمانی سمجھو
جذبات کی رو میں بہہ نہ جانا لڑکو | ہر زہرہ جبیں کو اپنی نانی سمجھو

متفرق غزلوں کے چند اشعار

جانکاہیٔ شب ہائے الم یاد رہے گی
ہر سانس کو وہ تیغ دو دم یاد رہے گی

○

باندھا تھا کسی شوخ سے پیمانِ تمنّا | رنگیں ہے مرا عالمِ امکانِ تمنّا

ایک قطعہ بھی سُنیئے

کاش رخصت سے قبل ہم دونوں | تپشِ شوق سے پگھل جاتے

مرمریں چاندنی میں حل ہو کر اِک روپہلی کرن میں ڈھل جاتے

۵ — حکیم منظور (۱۹۳۸ء) ایک نئی آواز کی صورت میں اُردو دنیا میں ظہور پذیر ہوئے۔ ان کے تجربات اپنے مخصوص اور حسین و جمیل دنیا کی پیداوار ہیں اور وہ واقعی "فردوس بر روئے زمیں" کے ایک سربرآوردہ فرزند اور کامیاب تخلیق کار اور تصویرکار کا رتبہ پانے والے اور حساس اور نقاش شاعر ہیں۔ اُن کے کلام کے اب تک چار مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ (۱) ناتمام — ۱۹۷۷ء (۲) لہو لمس چنار — ۱۹۸۲ء (۳) برف رتوں کی آگ — ۱۹۹۰ء اور (۴) خوشبو کا نام نیا۔

ان کی غزلوں میں نئی حیثیت، فکر کا تنوّع، اسلوب کی جدّت اور مشاہدے کے ساتھ ساتھ روایت شکنی کا رویّہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اور وہ تخلیقی عمل کی ماہیت سے آگاہ ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کہیں کہیں یہ روایتی الفاظ، استعاروں اور علامتوں سے انقطاع ناقابل قبول خاطر بھی ہو جاتا ہے چونکہ تعمیر جدید کا کام ہو رہا ہے اس لئے کچھ فروگذاشتیں بھی فطری تقاضوں کے عین مطابق ہو سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں راج نرائن رازؔ کا یہ مشاہدہ قابل توجہ ہے۔

"حکیم منظور کے یہاں جداگانہ فکری سطح پر الفاظ کے تخلیقی استعمال کی ایک علامت تجریدی تمثل ہے جو بیک وقت اس کے انداز مشاہدہ اور اسلوب کا حصّہ ہے۔"

محمود ہاشمی لکھتے ہیں:

"اس عہد کی غزل کو جس تحیّر، اضطراب اور خاموشی سے الفاظ تک سفر کرنے والی مفہوم کی تہہ دار تلوار کی ضرورت ہے — وہ سب کچھ حکیم منظور کے اشعار کا سرمایہ ہے۔"

چند اشعار دیکھئے ؎

اِک گرد چھائے گی ترے مومی دماغ پر
تھمنے دے آندھیوں کو ابھی کھڑکیاں نہ کھول

○

تجھے اے گُلِ زرد رکھّوں کہاں　　پہاڑی کے اوپر ہے خوشبو کا گھر

○

حساب مانگوں کِس سے میں کس طرح کہ ابھی
دہائیوں میں بٹی ہیں اکائیاں میری

منظورؔ نظم بھی لکھتے ہیں اور وہاں بھی اُن کی انفرادیت جھلکتی ہے۔
ایک نظم سے اقتباس ؎

میں سوچتا ہوں
یہ بیل دیوارِ سنگ پر جو کِھلی ہوئی ہے
خود اپنے ننھے وجود کے آخری سرے تک
یہ اپنے ہر پیچ میں سخن ہے
کتاب ہے یا کتاب کا خوشنما متن ہے!

گوپی چند نارنگ کا مشاہدہ یہ ہے :

"اُن کی آواز بیک وقت جانی پہچانی بھی ہے اور اجنبی بھی۔ اُن کا ہُنر اس میں ہے کہ وہ بظاہر سادہ گو معلوم ہوتے ہیں لیکن بہ باطن تہہ داری اور معنی آفرینی کا حق بھی ادا کر جاتے ہیں۔"

۵ ۔ مظفر ایرجؔ (۱۹۴۴ء) وادی کے ایک اہم شاعر کی حیثیت منوانے میں بہت حد تک کامیاب ہو گئے ہیں ۔ انہوں نے شاعری غزل سے ہی شروع کی اور بعد میں نظمیں اور آزاد غزلیں بھی لکھی ہیں ۔ ان کے کلام کے اب تک دو مجموعے شائع ہو گئے ہیں "ابجد" ۔ (۱۹۸۳) اور "انکسار" ۔ (۱۹۸۸ء)

ایرجؔ ایک مخلص اور پُر اعتماد فطری صلاحیتوں سے مالا مال شاعر اپنے مخصوص انسانی اقدار کے نبّاض اور حقیقی محبّت سے آراستہ وجود کو عالمی امن و سکون و آشتی کے حصول کے لئے کام کرتے ہیں اور اپنی شخصیّت کی تکمیل کیلئے کام کر رہے ہیں ۔

ڈاکٹر ارتکاز افضل لکھتے ہیں :

"مظفر ایرجؔ کی شاعری کی بنیادی خوبی یہی ہے کہ قاری اس سے فوراً مانوس ہو جاتا ہے ۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ایرجؔ کا لفظی و صوتی آہنگ ان عناصر سے ترتیب پاتا ہے جنہیں ہم کسی جماعت کی اجتماعی زندگی کی علامتوں کی ہی جہت سے پہچانتے ہیں" ۔

شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں :

"نظم اور غزل دونوں میں مظفر ایرجؔ نے انفرادیت سے سے کام لیا ہے اور اپنے لہجے کی شناخت کو طمانیت بخشی ہے" ۔

غزل کے کچھ اشعار ؎

اس موسم کی پہلی بارش گھر ٹوٹا      اشک کہ آنکھوں سے ٹپکا اندر ٹوٹا

ساون آنکھوں سے جب مہکے دل آنگن میں یادِ گلاب
کِھل کِھل اٹھے روپ سمندر چاند بدن میں یادِ گلاب

○

شعلہ شعلہ صنوبروں میں اُتار　　پھر مجھے سوکھے جنگلوں میں اُتار

ایک نظم "تب بھی" ؎

آج بھی میں
روشنی کے ہاتھ سے
ہر پا شکستہ، تن بریدہ
گھپ اندھیرے کی سیاہی چیرتا ہوں
اور تب بھی
آج تک اپنی ہی آنکھوں کے
اندھیروں میں
حصارِ ذات میں
فرسودہ ہوں، پژمردہ ہوں
شاید یہی میں اور میری زندگی ہے۔

یہاں دیکھئے انسانی اقدار کی معراج کے حصول کا جذبہ کس قدر سیدھے سادے الفاظ میں جھلکتا ہے اور حسّاس ذہن سے نکل کر چمکنے والے گہر الفاظ کا روپ دھار کر سامنے آتے ہیں۔

۵ — شبیب رضوی کا تعلّق اصل میں تو اتر پردیش سے ہے مگر ان کی شادی یہاں ہی ہو گئی ہے اور وہ اب یہاں کے ہی ہیں۔ وہ ہمیشہ سے اُردو

شعری سرمائے میں ہر رنگ میں اضافہ کرتے رہے۔ ان کی مادری زبان چونکہ اُردو بھی ہے اس لئے وہ زیادہ وسعت اور اعتماد کے ساتھ اپنی تخلیقی کاوشیں بروئے کار لاتے ہیں۔ وہ نظمیں بھی لکھتے ہیں اور غزلیں بھی اور نعت و مرثیے بھی۔ اُن کا اپنا جداگانہ رنگ ہے۔

وہ روایت سے قطعی طور منحرف نہیں ہیں۔ ہاں اپنے نئے تصورات اور حالات کی روشنی میں ذاتی تجربات کی تخلیقی بازآفرینی سے بھی کام لیتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور اپنی شخصی سطح پر محسوس تجربات کو بھی زبان دیکر اپنا ایک مخصوص انداز اظہار و بیان رکھتے ہیں ؎

دھوپ کے شہر میں جسموں کو چرائے رکھیو
اپنے ہمراہ فقط جسم کے سائے رکھیو

○

لمحوں کے تعاقب میں، یوں عمر گزرتی ہے
وہ آج پُرانے ہیں جو لوگ نئے تھے کل

○

بہت آسیب ہے یہ آگہی بھی　　بدل ڈالا مزاجِ دہر کس نے

○

سمتوں کو خود شناسی کا اس سے پتہ ملا
جو سنگِ میل نصب میری رہ گزر میں تھا

○

اُن کا کلام طباعت کے زیور سے آراستہ ہو تو ان کا اصل مقام متعین ہو سکتا ہے۔

○ — شجاع سلطان ۔ شجاع مصوّر بھی ہیں اور شاعر بھی ۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ انہوں نے پہلے شعر کہنا شروع کئے یا مصوری ۔ بہرحال انہوں نے اپنے اندرون کے اظہار کے لئے جو وسیلے اختیار کئے ہیں، ان دونوں سے انصاف کرتے رہے ہیں ۔

چند شعر ملاحظہ کیجئے ؎

نیند اسکی ، ہی رہیگی ، پھر مری جاگیر خواب
بند کرلوں گا میں آنکھیں دیکھنے تعبیر خواب
رات اک کوہ گراں آنکھوں سے کٹ سکتی نہیں
بے سبب ہم ڈھونڈتے پھرتے ہیں جوئے شیر خواب

○ — سجاد حسین ۔ سجاد شعر بھی کہتے ہیں اور افسانے بھی لکھتے ہیں اور دونوں میں اپنا منفرد رنگ و اسلوب قائم رکھنے میں کامیاب ہیں ۔

چند شعر ملاحظہ کیجئے ؎

نصیب میرے بھی کوئی کہیں ڈگر لکھ دو
اگر عذاب ہی لکھنا ہے عمر بھر لکھ دو
ہزار راستے بدلے گا وہ کہ پانی ہے
کہاں نصیب ہے ہجرت مجھے شجر لکھ دو

●

ایک پل کی ہی سہی یاد اگر رہتی ہے
آگ سینے میں لگی آٹھ پہر رہتی ہے
دور تک راہ میں قدموں کے نشاں رہتے ہیں
سنگ میلوں کو مسافر کی خبر رہتی ہے

●

۵۔ غلام نبی ناظرؔ (۱۹۳۵ء) میں نے پہلا شعر جب لکھا ہوگا شاید اُردو میں لکھا ہوگا۔ مجھے پوری طرح سے یاد ہے کہ میں جب جناب دینا ناتھ نادمؔ صاحب سے اپنی کشمیری شاعری کی اصلاح لینے کی غرض سے ۵۵-۱۹۵۴ء میں گیا تو میں نے ان کے سامنے اپنا مقصد بیان کرنے کی غرض سے ایک اُردو نظم پیش کی اور آپ اس سے بہت متاثر ہوئے۔ اس کے بعد میں ہمیشہ کشمیری زبان میں ہی لکھتا رہا۔ مگر کبھی کبھی کچھ خیالات ایسے پیدا ہوتے جو اُردو کا جامہ مانگتے تو میں اُردو میں ہی لکھتا۔ اس طرح میں نے کئی نظمیں اور غزلیں اُردو میں ہی لکھیں۔ ایک مجموعہ کلام اُردو جس میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی "فخرالدّین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنو کی مالی اعانت سے ۸۷-۱۹۸۶ء میں "بہتے شعلے" کے نام سے طبع کیا۔ اور اب ایک اور مجموعہ "سُلگتی کرنیں" کلچرل اکادمی جموں و کشمیر کے مالی تعاون سے زیر طبع ہے۔

"بہتے شعلے" پر "قیل و قال" کے عنوان سے جناب محمد یوسف ٹینگ نے اپنی رائے لکھی ہے۔ میں اسی سے چند اقتباسات پیش کر کے اپنے بارے میں خود کچھ اور کہنے کے بغیر آپ کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔

"۔ ۔ ۔ یہ بات کہ ناظرؔ روانی سے اُردو غزل اور نظم لکھتا ہے، واقعی ایک دھواں دار دریافت تھی۔ ۔ ۔ ۔ اپنے بہترین لمحوں میں اس کے شفّاف اشعار پر اس کے تقریباً ہم نام شاعر ناصر کاظمی کا سا گمان ہوتا ہے ؎

مہک ہے روشنی کی اب بھی اس تاریک گوشے میں
یہاں سے کوچ کرتے چاند چند لمحے رُکا ہوگا

ناظر کے اشعار میں عام طور پر پامال مضامین سے گریز اور نئی بنجر زمینوں میں پھول کھلانے کا حوصلہ نظر آتا ہے اور ایسے بصری پیکر ابھرتے ہیں جن پر اپنے زمانے کی چھاپ ہے۔ زبان کی حد تک روشِ عام کی پیروی کسی فن کار کو عصری آگہی سے ہم کنار نہیں کر سکتی لیکن جب پیکروں کی سطح پر اس کا احساس نقوش ابھارنے لگے تو یہ اس کی آگہی کی گہرائی کا سُراغ دیتا ہے ؎

کھنڈروں کی کھول کر دیکھی کتاب
پڑھ لیا پھاڑا ورق تاریخ کا

○

اور کیا ہو ہوا کے کاندھوں پر
نقشِ پا اُن کے پائے جاتے ہیں

○

بات جو رات کی کرتے ہو ذرا چمکے گی
چاند تختی پہ قلم سے ہی بنالو یارو

یہ قدرِ اوّل کے شعر ہیں اور اگر شاعر کا نام معلوم نہ ہو تو انہیں بڑے ہم عصر شعراء سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ ان میں فکر کی تازگی کے ساتھ اردو بیانیے پر جو عبور ملتا ہے وہ اس لحاظ سے بےحد حیرت انگیز ہے کہ شاعر کے اظہار کی پرائمری زبان کشمیری ہے اور اردو میں اس کی مشق میں نہ تسلسل ہے اور نہ تواتر۔

ناظر اپنے زمانے کے آشوب میں پوری طرح ڈوبا ہوا ہے۔ اس آشوب کی پرچھائیاں ہر زبان میں اپنے اپنے مزاج اور اپنے اپنے Genius کے لحاظ سے پڑتی ہیں۔ ناظر کے ان اشعار کو پڑھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ وہ معاصر اردو شاعری کے بڑے دھارے سے کٹا ہوا ہے؎

اور دیکھا دو[2] قدم یہ راستہ ہم پہ جو بجلی گری اچھّا ہوا

○

سارے اوراق الٹتے ہوئے اتنا سمجھا
جو ابھی تک نہ پڑھا میں نے وہ لکھا ہوگا

○

کون کہتا تھا فلک سے تھا بلاؤں کا نزول
بھوکے کتوں نے بہت رات کو بھونکا ہوگا"

○

اس کارواں میں اور بھی کئی کشمیری شعرا ہیں جو کبھی کبھار اردو میں بھی لکھتے ہیں۔ ان میں محمد زمان آزردہ، نشاط انصاری، مشعل سلطانپوری، مرحوم منظور ہاشمی کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے اکثر کشمیری زبان کے سربرآوردہ شاعر ہیں۔ بہر کیف چند شعر ملاحظہ فرمائیے؎

چلتا ہے صبح و شام اندھیروں کی راہ پر
سورج کو جستجو ہے کوئی نقشِ پا ملے

• ——— (محمد زماں آزردہ)

پھر ہر قدم پہ حسن گراتا ہے بجلیاں
حشر آفریں یہ شہر نگاراں ہے آج کل

• ——(نشاط انصاری)

لمحوں کی کڑی دھوپ برستے ہوئے شعلے
آنگن میں کوئی پیڑ اُگانے نہیں دیتا

• ——(مشعل سلطانپوری)

اُن سا کوئی کہاں سے ملے کوئی بتاؤ
لائے جواب کوئی کہاں لاجواب کا

• ——(منظور ہاشمی)

ماحول ، اقدار اور حالات کی تبدیلی کے پہلو بہ پہلو ادب اور خاصکر شعر و شاعری کے مزاج ، اسالیب اور اصناف وغیرہ میں بھی تبدیلی ایک فطری امر ہے اور شاعری مختلف مراحل سے گزر کر ہر دور میں نئی جہتوں کا سامنا کرتی رہتی ہے ۔ اس طرح پرانے اور نئے میں فرق کرنا اگرچہ مشکل ہے اس کے باوجود کچھ تبدیلیاں راہ پاکر اپنا وجود منواتی ہیں اور اس میں صرف پرانے اور نئے شعراء کے حالات و ماحول کا ہی دخل نہیں بلکہ ان کے اپنے مزاج ، احساسات اور حالات سے اثر پذیری اور اپنے مخصوص اندازِ اظہار کا بھی دخل ہوتا ہے اور نئے تخلیقی تجربات بھی کلام میں ایک نیا حُسن پیدا کرنے کے موجب ہوتے ہیں ۔ کئی لوگ ڈکشن میں تبدیلی لاتے ہیں اور کچھ لوگ خیالات کے ساتھ آہنگ کا بھی خیال رکھتے ہیں ۔ کبھی کسی نئی تحریک یا ماحول میں خاص ذہنوں کو متاثر کرنے والی تبدیلی کا اثر بھی شعراء میں زیادہ

گہرا ہوتا ہے۔

ان باتوں کے پیشِ نظر کشمیر میں اُردو شعراء کی ایک نئی کھیپ تیار ہوئی۔ جن میں کچھ کم لیکن کچھ بہت زیادہ اپنے جدّتِ مواد و اظہار کے نمونے پیش کرتے ہیں۔ اگر ایک فہرست اس نوع کے شعراء کی ترتیب دیجائے تو وہ یوں ہے:

یہ دو گروپوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو پورے انہماک اور حتی الامکان تواتر کے ساتھ لکھتے ہیں۔ دوسرے وہ جو بہت کم لکھتے ہیں مگر امید کی جا سکتی ہے کہ ان میں کئی اچھے اور اپنی طرف متوجہ کرنے والے شعراء کا درجہ حاصل کریں گے۔ بشرطیکہ وہ ریاض جاری رکھیں۔

پہلے گروپ میں رفیق رازؔ، رخسانہ جبینؔ، نذیر آزادؔ، سیّدہ نسرین نقاشؔ، شبنم عشائیؔ، فریدہ پربتیؔ اور شفق سوپوری شامل کئے جا سکتے ہیں۔ یہ وہ شعراء ہیں جنہوں نے اپنے کلام کے مخصوص انداز اور مواد کی جدّت اور زبان پر اپنی گرفت کی وجہ سے اپنے لئے خاص جگہ بنا لی ہے اور کشمیر ان کی اُردو شاعری پر بہت حد تک ناز کر سکتا ہے۔

٥— رفیق رازؔ اردو اور کشمیری دونوں زبانوں میں کامیابی کے ساتھ غزل لکھتے ہیں۔ ان کا رنگ اُردو میں بھی اور کشمیری میں بھی دوسرے شعراء سے بالکل الگ اور منفرد ہے۔ رفیق رازؔ کی لفظیات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان کے تجربات کا عمل رواں دواں ہے اور وہ حسیاتی بھی ہے اور بصری بھی۔ فارسی الفاظ کے ساتھ وابستگی سے بھی فائدہ اُٹھاتے ہیں اور بندشِ الفاظ پر بھی توجہ خوب ہے۔ فکر و احساس کی تازگی نمایاں ہے اور ان کے تجربات میں تہہ داری کا ہے۔

چونکہ ان کا کوئی مجموعہ کلام ہمارے سامنے نہیں اس لئے کھل کر بحث کرنا ناممکن ہے۔ ہاں اگر ان کا اس انداز سے انہماک قائم رہا تو وہ ضرور ایک کامیاب اور منفرد اسلوب و آواز کے شاعر کی حیثیت میں قارئین کی توجہ اپنی طرف بھرپور رنگ میں مبذول کرا سکیں گے۔ رفیق رازؔ چھٹے دہے یعنی ۱۹۶۰ء سے پہلے ہی سے لکھ رہے ہیں اور اپنے ماحول اور ذات کی کربناکیوں سے آگاہ ہیں اور محسوس کر کے ان کو شعر کا جامہ پہنانے کی مہارت رکھتے ہیں ؎

چاروں اور کے منظر شعلہ شعلہ ہیں
بیچ میں گم صُم دھواں ہے میری سوچ

○

اک خلل اور سراسیمہ سیہ خاک میں ڈال
خوف نادیدہ نواحِ دلِ بے باک میں ڈال

○

سیلاب ہفت رنگ مری خامشی میں ہے
سہمے ہوئے سکوت کی چھہکار مجھ میں ہے

○

کلچرل اکادمی سرینگر کے اردو رسالہ شیرازہ میں بھی آپ کا کلام چھپتا ہے اور ہندوستان کے کئی کثیرالاشاعت معیاری رسائل میں بشمول ماہنامہ "شب خون" رفیق رازؔ کا کلام وقتاً فوقتاً چھپتا رہتا ہے ؎

جلوۂ خواب کے مہتاب اگاؤں شب بھر
چشمِ بے نور کے صحرا کو فروزاں کر دے

○

وسعتوں کا سلسلہ درپیش تھا    راہ میں اک منزلِ حیرت بھی تھی

۵ — رخسانہ جبین ساتویں دہائی سے لکھنے والوں میں بہت آگے چلتی تھیں۔ کشمیر کی شاعرات میں ایک اہم مقام کی طرف گامزن ہو رہی تھیں ایسا لگتا ہے کہ ریڈیو اور گھر دونوں کی مصروفیتوں نے رخسانہ کو وقتی طور تخلیقی سرگرمیوں میں زیادہ تواتر سے شرکت کرنے سے باز ہی رکھا ہے۔ مگر پھر بھی وہ اپنا ایک رُتبہ پانے میں کامیاب ہوئی ہیں۔

ان کے کلام کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کشمیر کی نوجوان خواتین بھی اپنی شناخت قائم کر سکتی ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ رخسانہ تنہائی پسند ہو گئی تھیں۔ اس کے کچھ اشارات بھی ان کے کلام میں ملتے ہیں۔ یوں تو رخسانہ بے ساختہ لب و لہجہ سے بھی اور شدّتِ احساس اور معنی کی وسعتوں سے بھی آگاہ ہیں۔ ان کے اشعار میں ایک منفرد تخیلی فضا بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔

کچھ اشعار پیشِ خدمت ہیں ؎

موج در موج صدف میرا سمندر ہوگا
اور وہ کوئی کہن سالہ شناور ہوگا

○

اب کے تالاب میں پھینکوں گی میں ایسا پتھّر
شور گہرائی میں اور سطح سلامت ہوگی

○

چشمۂ صوتِ سنگ کا پانی    کھیتیوں میں اگائے گا پتھّر

وہ نظمیں بھی لکھتی ہیں لیکن کم۔ اصل میں ان کی انفرادیت غزل میں ہی جھلکتی ہے۔ ان کی خاموشی سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ شاید بہت جلد ایک خوشگوار اچنبھے کو وجود بخشیں گی۔

٥ — نذیر آزاد ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں جس کی فضا ابتدا ہی سے شاعرانہ اور علم و آگہی کے نور سے کافی حد تک آراستہ رہی ہے۔ نئے شعرا میں ان کا ایک اہم مقام ہے۔ ایک مجموعہ "نغمۂ زنجیرپا" کے نام سے ۱۹۹۲ء میں چھپا ہے۔ وہ غزلیں زیادہ لکھتے ہیں اور نظموں میں بھی کسی سے پیچھے نہیں اور وہ ۱۹۶۰ء کے بعد جب تک کہ ترقی پسندی اور مقصدیت کا شور و شر ہر طرف سے سنا جا رہا تھا اپنی مخصوص آواز و ادا لے کر میدان میں اترنے والوں میں ماضی قریب سے تعلق رکھنے والے مصروف مشق سخن شاعر کی صورت میں نمودار ہوئے۔ وہ روایت سے نا آشنا نہیں اور موجودہ زمانے کی کربناکیوں اور انتشار سے بھی بخوبی آگاہ ہیں۔ اردو اور فارسی شعری روایات پر بھی نظر رکھتے ہیں اور اب جبکہ ریڈیو اور ٹیلیویژن کی برکت سے ایک آدمی بہت دور دور کے حالات اور تبدیلیوں سے آگاہی پاتا ہے۔ نذیر آزاد بھی اردو زبان کی شعری دنیا سے پوری طرح آگاہ ہیں اور ان کی نظر دور دور تک پہنچی ہے۔ پروفیسر حامدی کاشمیری کا یہ اقتباس نذیر آزاد کے حق میں کافی ہے:

> "خوشی اس بات کی ہے کہ نذیر آزاد روایت کا صحتمند شعور رکھتے ہیں اور ساتھ ہی وہ الفاظ سے پیکر تراشی کا کام لیتے ہیں۔ یہ سنگ سے آئینہ سازی کا عمل ہے۔ نذیر آزاد آئینہ سازی کے اس عمل میں تن دہی سے مصروف ہیں۔"

اُن کے کلام میں تازگی بھی ہے اور کشش بھی ہے

اپنی ناگفتہ کہانی کا کوئی لمحہ ہوں میں
تو نے کیوں سمجھا کہ تیرے واسطے ٹھہرا ہوں میں

○

یدِ بولہب نے پھر عزّتوں سے کھیلنا سیکھا
بصد آداب جا کر گوشۂ ممبر پہ لکھ دینا

ایک نظم "کلائمکس" سے

بڑھتے بڑھتے
افسانے میں
آخر ایسا موڑ بھی آیا
خالق اپنے کرداروں سے
روٹھ گیا
اور پھر
لکھنا بند کیا۔!

۵ — سیّدہ نسرین نقاش یوں تو پچھلے دس بارہ برسوں سے لکھ رہی ہیں مگر ان کا تعارف "سرکتا آنچل" کے مدیر کی حیثیت میں ہوا ہے۔ لیکن دو ڈھائی سال قبل جب ان کے کلام کا مجموعہ "دشت تنہائی" سامنے آیا تو ان کی شعری خوبیوں اور اہمیتوں کو دیکھ کر قارئین حیران رہ گئے کہ قریب قریب ایک خاموشی کے عالم میں رہ کر اتنا سرمایہ جمع کر کے محفوظ کیا ہے۔ یہ تو ایک خلّاق اور کامیاب ذہن کی دین ہے جس کی بھرپور پذیرائی ہونی چاہیئے۔ میں نے

شیرازہ کے لئے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

"اُن کا (نسرین نقاش کا) کلام زبان و بیان اور لب ولہجہ پیشِ نظر رکھتے ہوئے حسین اور شوخ الفاظ سے تعمیر ہوا معلوم ہوتا ہے۔ نسرین نقاش طبعاً ایک شاعرہ ہیں جو اپنے کلام میں اپنے ذاتی تجربات اور واردات سے حاصل شدہ احساسات و خیالات اور جذبات کو حسین و دل کش رنگ میں پیش کرتی ہیں۔ ان کے ہاں تکلّف اور تصنّع سے بالکل کام نہیں لیا گیا ہے۔ بلکہ خیالات کے ساتھ شاعرہ کی نظری ہم آہنگی کا برملا اظہار عیاں ہے۔"

نسرین بنیادی طور پر غزل کی شاعرہ ہیں۔ کچھ نظمیں اور گیت بھی لکھے ہیں اور یہاں بھی غزل ہی کی زبان، لب ولہجہ اور نفاست غالب ہے۔ گیتوں کی زبان کچھ الگ سی لگتی ہے۔ غزل کے چند اشعار دیکھئے ؎

جب سفینہ غرق کرنے کے لئے طوفاں اُٹھا
ناخدا نے میرے سر اپنا مقدّر کر دیا

○

قرارِ جاں کے عوض دل کی وحشتیں بھی گئیں
جنوں کا لُطف گیا غم کی لذتیں بھی گئیں

○

کھل گئی ساری حقیقت ہم پہ تیرے شہر میں
تیرے چہرے پر لگا ایک اور چہرہ دیکھ کر

۵ — شبنم عشائی کی شاعرانہ حیثیت ۱۹۹۳ء میں سامنے آگئی جب آپ کی ایک چھوٹی سی کتاب "اکیلی" قارئین کی توجہ کا مرکز بنی۔ کتاب کے نام سے ہی "اکیلی" کی شاعرہ کا حساس اور کئی ذہنی اور قلبی حادثات سے دوچار ذہن کھل کر سامنے آتا ہے۔ میں نے اس پر شیرازہ اردو کے لئے تبصرہ میں لکھا ہے:

"شبنم کی شاعری میں غم و اندوہ کا ایک دلچسپ فطری رقص ہے۔ یہاں آرزوؤں کے بازار سجے سجائے دکھائی دیتے ہیں۔ تصور میں اُبھار ہے، تموج کا نظارہ ہے۔ صحرا کی وسعت بھی ہے اور دیوانگی کے آداب بھی۔ وہ اپنے سفر میں کسی کو شریک کرنے کا شدید غم نہیں کرتیں بلکہ اکیلی جلتی ہوئی پیش آنے والے حادثات کو نقش بر سنگ کرتی چلی جاتی ہیں۔ اور صبر و رضا کا پیکر بن کر حوصلہ مندی کے ساتھ اگلی منزل کی طرف گامزن ہیں۔"

شبنم کم عمر ہیں اور اس قدر کم عمری میں حادثات و تجربات سے بھرپور زندگی کی امین دکھائی دیتی ہیں ؎

جب بھی تو اندھیرا تھا
اور میں
چلی جا رہی تھی
آج بھی اندھیرا ہے
اور میں چلی جا رہی ہوں
ہاں

تب آنکھیں بند تھیں
آج آنکھیں کھلی ہیں!

وہ صرف نظمیں لکھتی ہیں اور اکیلی سے اپنا شاعری کا سفر شروع کیا ہے جو بے حد اُمید افزا ہے۔

۵ — فرید پربتی گزشتہ پندرہ برسوں سے شعروشاعری سے وابستہ ہیں۔ بہت کم وقت میں بلکہ اگر کہا جائے کہ ابتدائی کوششوں میں ہی اپنی حیثیت منوانے میں انہوں نے بہت حد تک کامیابی حاصل کی۔ آپ غزلیں لکھتے ہیں اور اب رباعیاں بھی تمام فنی اور عروضی لوازمات کی روشنی میں لکھ رہے ہیں۔

گذشتہ کئی برسوں سے کچھ نئے رجحانات کا ظہور ہوا اور شعراء اپنی خود آگہی کی روشنی میں اپنے زمانے کا پوری طرح سے شعور رکھتے ہیں اور وہ روایتی تصورات سے ناامید ہوکر ذاتی کرب و بحران میں پھنس جانے کی وجہ سے ایک طرف ذہنی طور اپنے وجود کی گہرائیوں سے بھی آگاہ ہیں۔ دوسری طرف کائنات کے مختلف مظاہر کی حقیقت سے آگاہی چاہتے ہیں اور یہی جذبہ اور احساس لیکر وہ شعری تخلیقات کو جنم دیتے ہیں افسادگی اور کرب و اذیت کا احساس فرید پربتی کے اشعار میں نمایاں ہے۔ تاثر کی شدت اور وحدت غزلوں میں نمایاں ہے اور رُباعیات میں وہ اجتماعی محسوسات کو اپنی فنی چابکدستی سے الفاظ کے گلدستوں میں پیش کرتے ہیں۔ فرید کا اسلوب و اظہار انفرادیت کا حامل ہے اور تخیل کا کینواس بہت وسیع ہے ؎

یہ کیا کہ شب و روز فقط اُنکی تمنا — یہ کیا کہ محبت کو یہاں کہہ نہیں پاتے

بجھا ہے دل کا سکوں گرفتہ بہار یوں ہی

شگفتہ پھول کو بادِ صبا نہ راس آئی

○

شبیہہ خواب و خیال کی ہے ۔۔۔ اُداس چہرہ نظر ہے ویران

○

ایک رباعی دیکھئے ؎

ٹوٹی ہوئی تلوار نظر آتی ہے

سائے سے یہ بیدار نظر آتی ہے

اے زیست کے سائے میں اچھل کود

فریدؔ کا ایک مجموعہ جب شائع ہوا ہے تو انشاءاللہ دوسرا مجموعہ بھی بہت جلد شائع ہوگا۔[1]

۵ — شفقؔ سوپوری کا اصلی نام سیّد عبدالقیوم ختائی ہے۔ وہ لگ بھگ پندرہ[15] برس سے لکھ رہے ہیں اور اُن کی نگارشات افسانے، غزلیں، نظمیں اور تبصرے وغیرہ مختلف رسائل میں چھپتے رہتے ہیں۔ زیادہ تر وہ غزلیں اور نظمیں لکھتے ہیں۔ اب تک اُن کا غزلوں کا ایک مجموعہ ۱۹۹۱ء میں چھپ گیا ہے۔ ڈاکٹر حامدیؔ کاشمیری ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ کشمیر کی نئی نسلوں میں شفقؔ سوپوری نہ صرف نسبتاً گہرے تخلیقی شعور کا احساس دلاتے ہیں بلکہ وہ لفظ و پیکر کی فراوانی اور تازہ کاری کا احساس

---

[1] فرید کے اب تک تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

• ابرِ تر (۱۹۸۵) • آبِ نیساں (۱۹۹۴ء) • اثبات (۱۹۹۸ء) (ادارہ)

بھی دلاتے ہیں۔ اُن کی شعری فضا میں حد بندی، یک رنگی اور
گھٹن کا احساس نہیں ہوتا ہے، بلکہ آزادی، توسیع اور
رنگا رنگی کا احساس ہوتا ہے اور یہ خاصیت نئے شعرا میں
کم ملتی ہے۔"

شفق سوپوری کے پاس اپنے داخلی تجربات کو اپنی پوری قوت اور تاثر
کے ساتھ قارئین کے سامنے ایک نئی اور معتبر آواز کے ساتھ پیش کرنے کے لئے
الفاظ و محاورات کا ایک خزانہ ہے۔ وہ ایک منفرد انداز تحریر و اظہار کے مالک ہیں۔

؎ برگِ گلاب اب کے برنگِ لہو نہ تھا
تمثالِ خونِ دل کسی کے روبرو نہ تھا

○

خوشبو سی خواب میں تھی پھرے پہ پنکھڑی تھی
میرے خیال میں بھی شہزادی سو رہی تھی

○

ڈوبنے والا کیا نہ کر ڈوبے ہاتھ اوپر کرے تو سر ڈوبے

○

وہ بند کھڑکیوں میں خاموشیوں کی بستی
میں رات بھر صدائیں دیتا ہوا مسافر

○

دوسرے گروپ میں بھی نئی جہتوں اور نئے اسالیب اور حالیہ برسوں کی
سائنسی اور تکنیکی ترقی کے اثرات اور زبان پر بھرپور دسترس کے نمونے ملتے ہیں۔

مگر ابھی بہت کم مواد صفحۂ قرطاس پر آراستہ ہوا ہے۔ میں اس گروپ کی فہرست پیش کروں گا اور ہر نام کے ساتھ ایک ایک یا دو شعر نمونتاً پیش کروں گا:

○ — خالد بشیر —— نظم بھی لکھتے ہیں اور غزل بھی۔ ایک غزل کے دو شعر ؎

کوئی خواب نہ پھول نہ کوئی آہٹ ہے
زیست ہماری کتنی بے اسباب ہوئی

وہ آواز نہیں آسیبی دھوکا تھا
دھوپ کی جادوگرنی تھی برفاب ہوئی

○

○ — اشرف ساحل —— عموماً غزلیں ہی لکھتے ہیں۔ دو غزلوں کے دو دو شعر ؎

برف کی صورت مری آغوش میں پگھلی وہ آگ
منکشف ہونے میں اُس کے کس قدر ابہام تھا

○

اک تسلسل ہے خوشبوؤں کا میری بانہوں میں دُعا چپ ہے

○ — فاروق آفاق ——

عبث اک عکس نیلی جھیل میں تھا
کنارے پر کہاں کوئی کھڑا تھا

○ — سیّد رضا ——

اپنی آنکھوں میں رکھو برف کی قاشیں محفوظ
کہیں رستے میں دہکتا ہوا منظر ہوگا

○ — تنہا نظامی ـــــ غزلیں اور نظمیں دونوں لکھتے ہیں۔ ایک غزل کا ایک شعر ؎

یہ سیاہ اور سخت گیر شب خموشی کیا کریں
نہ کوئی سنگ صدا نہ کوئی آہ رسا

○ — مشتاق مہدی ـــــ افسانے بھی لکھتے ہیں اور شعر بھی کہتے ہیں۔ عموماً نظمیں لکھتے ہیں۔ ایک نظم "آنگن کے پھول" سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو ؎

آنگن کے وہ پھول .....
جو مٹی میں جا سوتے ہیں
کس خواب کو لے کر جیتے تھے
کس سوچ میں آنسو پیتے تھے
کچھ یاد نہیں
کیا وہ ہم سے کہتے تھے

○

نشاط انصاری

# جموں و کشمیر میں اردو نثر

## ـــــــ مختصر جائزہ

پندرھویں[15] صدی سے انیسویں[19] صدی تک کشمیر میں فارسی زبان کو ایک علمی و ادبی زبان کا درجہ حاصل تھا اور جب ملک میں اردو زبان کو سرکاری سرپرستی حاصل ہوئی تو یہاں بھی آج سے یہی کوئی سوا سو سال پہلے اردو نے فارسی زبان کو پیچھے دھکیل کر اس کی جگہ لے لی اور سب سے پہلے اس جادو اثر زبان نے اپنا اثر جموں اور پونچھ پر ڈالا۔ پونچھ سے چراغ حسن حسرت المعروف سندھ باد جہازی کی شاداب طبیعت نے اردو زبان میں اپنی ادبی تخلیقات پیش کیں۔ پونچھ اور جموں کے دوش بدوش وادی کے مردم خیز خطے نے محمد دین فوق کو ادب اور تاریخ کے میدان میں لا کھڑا کیا۔ تاریخ اقوام کشمیر، تاریخ بڈشاہی، تاریخ پونچھ، تاریخ کشمیر مکمل، خواتین کشمیر وغیرہ ان کی زندہ یادگاریں ہیں۔ صحافتی میدان میں اردو زبان کے اخبارات نے یکے بعد دیگرے جنم لینا شروع کیا۔ چنانچہ سرینگر، جموں اور پونچھ سے اخبار صداقت، حقیقت، ہمدرد، خالد، البرق، خدمت، المجاہد، وتستا، رہبر، چاند، دلیش، ذوالفقار، وکیل وغیرہ مختلف اوقات پر منظر عام

* دلنہ بارہمولہ

پر آتے رہے۔ رسالوں میں پرتاپ میگزین، فردوس، لالہ رُخ، رتن، تنظیم اور تعلیم جدید نام قابل ذکر ہیں۔

ابتداء میں اگرچہ اُردو نثر کی طرف بہت کم توجہ دی گئی اور زیادہ زور شعر و شاعری کی طرف دیا گیا اور نثری کام نہ ہو سکا اس کے لئے کشمیر میں اُردو اور تدریس کے مخصوص مسائل اور حکومت کی بے توجہی کو ذمہ دار ٹھہرایا جانا چاہئے لیکن صحیح معنوں میں اگر اُردو نثر نے انگڑائی لینی شروع کی تو اس کی ابتداء ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد ہوتی ہے۔ دراصل برصغیر کی تقسیم کے بعد اور خاص طور سے ریاست میں عوامی حکومت بننے کے ساتھ ساتھ نثر کی ضرورت کو محسوس کیا گیا اور یہی دور کشمیر کی سیاسی سماجی، معاشی اور خاص کر تمدنی و تہذیبی زندگی کے لئے ایک عہد ساز دور کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ تمدنی سطح پر اُردو نثر کو بے توجہی کے ماحول سے نکالا گیا۔ کیوں کہ اُردو ملک کے جن علاقوں میں اُبھری اور پروان چڑھی وہاں اس زبان کی ترقی و ترویج کی راہیں بہت حد تک مسدود ہو گئیں۔ ہماری ریاست کو بہر حال یہ فخر حاصل ہے کہ اس کے اپنے آئین کی رُو سے اُردو کو یہاں کی سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں اُردو زبان کی روز افزوں ترقی کے ساتھ ساتھ یہاں شاعروں کے دوش بدوش نثر نگار، تمثیل نگار، افسانہ نویس، ڈرامہ نگار اور صحافی تیزی کے ساتھ اُبھرنے لگے جنہوں نے اپنی تخلیقات کو پیش کر کے کشمیر میں اُردو نثر نگاری کی کمی کو پورا کیا۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد یہاں کی حکومت نے پرائمری اور مڈل کلاسوں کی درسی کتابیں مقامی مصنفین سے ہی لکھوائیں۔ ان مقامی مصنفین میں پریم ناتھ پردیسی، پروفیسر صاحب زادہ حسن شاہ، میر غلام رسول نازکی، تنہا انصاری، مرحوم غلام احمد کشفی، پروفیسر ایم ایل فاضلی اور غلام حسین نخوتی اور پروفیسر بی ڈی مل شرما قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۹۵۰ء میں یہاں جب فن تمدن اور زبانوں

سے متعلق اکادمی[1] کا وجود عمل میں لایا گیا تو اس ثقافتی ادارے نے نہایت فیاضی کے ساتھ دوسری زبانوں کے علاوہ اُردو کی طرف بھی خاص توجہ دی۔ اُردو نثر و نظم اور دوسری تخلیقات کو منظرِ عام پر لانے کے سلسلے میں اس ادارہ نے نثر نگاروں، افسانہ نویسوں کہانی کاروں اور شاعروں کو مالی امداد دینے کا سلسلہ شروع کیا تاکہ وہ اپنی تصنیفات شایع کرا سکیں۔ چنانچہ اس ادارے کی کوششوں سے ہی آج تک درجنوں اُردو کتابوں کو چھپوا کر ایک خاص کمی کو پورا کیا گیا۔ اُدبا کی حوصلہ افزائی کے پیشِ نظر مالی امداد سے قطع نظر معیاری کتابوں کی اشاعت کے لئے ہر سال انعامات دینے کی روایت بھی کلچرل اکادمی نے ہی ڈالی اور نثر نگاری کے میدان میں جن نثر نگاروں کی تصانیف ۱۹۵۸ء کے بعد منظرِ عام پر یکے بعد دیگرے آتی رہیں اُن میں ڈاکٹر حامدی کاشمیری کی بلندیوں کے خواب، سراب، جدید نظم کا ارتقاء غالب کے تخلیقی سرچشمے، اقبال اور غالب، کارگہہ شیشہ گری، میر کا مطالعہ حرفِ راز اور امکانات وغیرہ شامل ہیں

پروفیسر عبدالقادر سروری کی کشمیر میں اُردو (حصہ اوّل، دوم و سوم)۔ نور شاہ کی انتخاب اُردو ادب، پائل کے زخم اور یہ میری دنیا۔ محمد امین پنڈت کی "مختصر تاریخ کشمیر" اور "لداخ کی کہانی"، تنہا انصاری مرحوم کے خطوط کا مجموعہ "خاطرِ احباب"۔ "صحیح اُردو بولئے اور تعلیم زبان"، عشرت کشتواڑی کی "تاریخِ کشتواڑ"، کے ڈی مینی کی "تاریخ پونچھ" ڈاکٹر شکیل الرحمان کی "ادبی قدریں اور نفسیات"، "لاوے کا سمندر اور شعوری عمل"۔ پروفیسر نند لال طالب کی جوہر آئینہ شبنم قیوم کا اک زخم اور سہی اور یہ کس کا لہو بہا، ملک راج آنند کی جانے وہ کیسے لوگ تھے؟ ڈاکٹر اکبر حیدری کا ناول "فطرت"۔ میر انیس بحثیت

[1] جے اینڈ کے اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز

رزمیہ شاعر، میر ضمیر اور دیوان نامی، تحقیق و انتقاد، مطالعۂ زور اور نسخہ میر بخطِ میر، شیخ محمد عبداللہ کی 'آتش چنار' ثناء اللہ بٹ کی "۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۰ء تک" پروفیسر سیوا سنگھ کی 'کشمیر میں پنجابی زبان و ادب'، علی محمد لون کی "شاہ ہے تیری آرزو" ڈاکٹر کاشی ناتھ پنڈت کی "خواجہ حافظ شیرازی کا مفصل مطالعہ" ڈاکٹر محمد زمان آزردہ کی "فانوسِ خیال"، 'شبلی کے خطوط'، 'غبارِ کارواں اور مرزا سلامت علی دبیر حیات اور کارنامے' ڈاکٹر برج پریمی کا 'سعادت حسن منٹو حیات اور کارنامے'۔ ذوق نظر، حرفِ جستجو، جلوہ صد رنگ اور چند تحریریں جگن ناتھ آزاد کی 'اقبال اور کشمیر'۔ غلام رسول سنتوش کا ناول "سمندر پیاسا ہے" ڈاکٹر مشعل سلطانپوری کی "نگارشات"، امر مالموہی کا 'زعفران زار' بھوشن لال بھوشن کی کتاب 'صرف پانچ ہزار'، موہن یاور کی 'سیاہ تاج محل اور اپنا گھر' اور بہت سی بیسیوں چھوٹی بڑی تصانیف قابلِ توجہ ہیں۔

جموں و کشمیر کے تمدنی اور ادبی احیا کے پیشِ نظر کلچرل اکادمی نے گذشتہ تیس برسوں میں اردو زبان کو فروغ دینے میں جو رول انجام دیا ہے وہ بجائے خود ایک تاریخ ہے۔ اس ادارے کے تحت ایک دو ماہی ادبی جریدہ "شیرازہ" محمد یوسف ٹینگ کی ادارت میں جاری کیا گیا جو اب ایک ماہ نامہ کی صورت میں چھپ رہا ہے۔ ٹینگ صاحب اگرچہ بعد ازاں کچھ عرصہ کے لئے اکادمی کے ڈپٹی سکریٹری اور پھر سیکریٹری بھی تھے لیکن وہ اس جریدے کے ساتھ نگراں و مدیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ کچھ عرصہ کے لئے رشید نازکی اس کے ایڈیٹر رہے اور آجکل محمد احمد اندرابی اس کے مدیر ہیں۔ نثر نگاروں کی تخلیقات کو عوام سے روشناس کرانے کے سلسلہ میں سالنامہ "ہمارا ادب" بھی نہایت پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے اور اس کے کئی نمبر مثلاً مشاہیر نمبر ۲ جلد، جموں و کشمیر نمبر۔ ۵ جلد، شخصیات نمبر۔ ۵ جلد

ادبیاں نمبر – ۴ جلد، قابل ذکر ہیں اور اکادمی نام کا مصور خبر نامہ بھی اس ثقافتی ادارے کی کوششوں سے چھاپا جاتا ہے۔

امر سنگھ کالج کا سالانہ میگزین "لالۂ رُخ" اور سری پرتاپ کالج کے "پرتاپ میگزین" نے ادب میں اپنا ایک مقام بنایا ہے۔ ان کے علاوہ دیگر کالجوں کے میگزین بھی منظر عام پر آتے رہے ہیں جن میں زنانہ کالج کا "زون" اور اسلامیہ کالج کا "بادم واّر" کا نام لیا جا سکتا ہے۔

ریاستی محکمہ اطلاعات کی طرف سے "تعمیر" نام کا رسالہ بخشی غلام محمد کی وزارت کے دوران اجرا کیا گیا۔ تعمیر بیچ میں کچھ عرصے کے لئے بند ہوا لیکن اب پھر منظرِ عام پر آ گیا ہے۔ اس کے پہلے ایڈیٹر مرحوم شمیم احمد شمیم تھے۔ پھر محمد یوسف ٹینگ اس کے مدیر بنے جن کی ادارت میں کئی خاص نمبر شائع ہوتے اور تعمیر نے ادبی حلقوں میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا۔ ہماری یہاں کی یونیورسٹی کا شعبہ اُردو اس کارِ خیر میں کسی سے پیچھے نہیں۔ اس شعبہ کی طرف سے کئی برسوں تک 'ادبیات' نام کا ایک رسالہ سال میں ایک بار چھپتا رہا۔ اب یہ رسالہ 'بازیافت' کے نام سے شایع ہو رہا ہے اور اس میں تحقیقی اور تنقیدی، لسانی و ادبی تخلیقات کو منظرِ عام پر لایا جا رہا ہے۔

اُردو زبان و ادب کی خدمت انجام دینے میں یہاں کے ریڈیو اسٹیشن اور پھر ۷۱ء سے قیام دُوردرشن کیندر (ٹیلی ویژن) کی ادبی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاتے گا۔ یہ دونوں ماس میڈیا ادارے اُردو زبان و اَدب کی توسیع و تشہیر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان اسٹیشنوں سے آئے دن علمی، ادبی، ثقافتی، تنقیدی و تحقیقی پروگرام پیش کئے جاتے ہیں۔ ان اِداروں نے یہاں کے اُردو دان طبقہ اور سکولوں و کالجوں میں زیرِ

تعلیم طلباء و طالبات کو صحیح تلفظ، مناسب لب و لہجہ صحیح تذکیر و تانیث اور صحیح زبان سیکھنے کے مواقع بھی فراہم کئے۔

صحافتی شعبہ میں بھی یہاں نمایاں ترقی ہو چکی ہے۔ کہاں گنتی کے چند روزنامے اجراء ہونا اور کہاں، ۴۷ء کے بعد خالد، جدید، رہبر جدید، ڈلر، جمہور، آئینہ، رہنما، ہلال، جموں سندیش، ہمارا استاد، پیام انقلاب، آفتاب، اقبال، روشنی، زمیندار، مزدور، نیا سنسار، کشمیر، سنسار، آجالا، نوائے کشمیر، قومی آواز، نوجیون، جہانِ نو، جیوتی، سلسبیل، سرینگر ٹائمز، محافظ، چٹان، جبروت، چنار، ارمغان، نگینہ، الغفران، پولیٹیکل ٹائمز، ہمارا کشمیر، امر، وادی کی آواز، سرچشمہ حیات، وادی، عقاب، کیسری، اذان، دبستان، سویرا، محاذ، قومی درد، میزان، ٹڈ شاہ اور دیگر درجنوں روزنامے اور ہفت روزہ نہایت پابندی کے ساتھ شایع ہوتے۔

اس دور اور اس سے پہلے کئی برسوں میں مضمون نگاری اور انشا پردازی کی تحریک کا بڑا سبب اخبار اور رسائل ہیں۔ ریاست میں جس بہتات سے روزنامے و ہفت روزہ شایع ہو رہے ہیں ان کے مدنظر یہ حیرت کی کوئی بات نہیں کہ یہاں بے شمار مضمون نگار پیدا ہوتے۔ اصل بات یہ ہے کہ اخباروں کے اجراء کی تحریک سے ہی لکھنے والوں کے لئے ایک تحریک ملی۔ یہ نہ ہوتے تو ایسا نہ ہو سکتا تھا کیونکہ ریاست سے باہر کے اخبار دور کی چیز تھی لہٰذا اس دور میں نثر نگاروں کا کارواں تشکیل پانا ایک لازمی بات ہے۔ چنانچہ دورِ حاضرہ کے مضمون نگاروں کی تخلیقات میں موضوعات کے لحاظ سے بہت وسعت پائی جاتی ہے۔ تاریخ، تہذیب و ثقافت، ادب و فن، تعلیم و صنعت گری غرض ہر موضوع پر مضامین لکھے جا رہے ہیں اور یہ مضمون جہاں اردو نثر نگاری میں

پیش رفت کے حامل ہیں وہاں زیادہ رچے ہوئے شعور کی آگہی بھی دیتے ہیں۔

اردو نثر کے نشاۃ ثانیہ کے اس دور میں جموں و کشمیر کے دونوں خطوں میں قابل تعریف حد تک ادبی ترقی کی منزلیں گذشتہ پانچ دہائیوں کے دوران طے ہو چکی ہیں اور اس طرح اردو نثر نگاری فن اور موضوع دونوں اعتبار سے وسعت، تنوع اور نئے نئے افکار سے ہمکنار ہو رہی ہے اور نئی نسل کے ادیبوں، نثر نگاروں، ڈرامہ نویسوں اور دانشوروں کا ایک بڑا کارواں تخلیقی راہوں پر آج کل رواں دواں نظر آرہا ہے۔ ان قلم کاروں کی کاوشوں سے ہی یہاں اردو کے شاندار مستقبل کی بشارت مل سکتی ہے کیونکہ یہاں تینوں خطوں کی وحدت کے لئے اردو ہی وہ زبان ہے جسے تبادلۂ خیالات کی قدر مشترک ہونے کا فخر حاصل ہے۔ ہم اس زبان کی مدد سے ریاست کی تینوں اکائیوں کے ثقافتی و تہذیبی رشتوں کو برقرار رکھنے اور فروغ دینے کا کام سرانجام دے سکتے ہیں۔

ان اکائیوں کے قدیم و جدید ادب کو سمجھنے اور سمجھانے کا کام بھی اردو کے ذریعے ہی کیا جاسکتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہاں کے ثقافتی سرمایہ کو ریاست سے باہر پرکھ سکتے ہیں اور اس سرمایہ کو ملک کے دیگر حصوں میں روشناس کرانے کے سلسلے میں اردو کا ہی دامن ہم تھام سکتے ہیں۔

کشمیر کی اردو نثر نگاری میں جن ادبا نے اپنا بھرپور حصہ ادا کیا ہے ان میں پریم ناتھ پردیسی، پروفیسر حامدی کاشمیری، شمیم احمد شمیمؔ، خواجہ ثناء اللہ بٹ، محمد زمان آزردہ، پروفیسر اکبر حیدری، ڈاکٹر برج پریمی، ڈاکٹر مشعل سلطانپوری، محمد یوسف ٹینگ، نور شاہ، ڈاکٹر نذیر ملک، ڈاکٹر شمس الدین احمد، بشیر احمد نحوی، محمد اسد اللہ وانی، پروفیسر مولوی ابراہیم، نشاط انصاری، پریم ناتھ در، تیج بہادر بھان، کلدیپ، رعنا، شبنم قیوم، عمر مجید، مجید مضمر، پریمی رومانی،

عبدالغنی شیخ، موتی لال ساقی، خالد بشیر، ڈاکٹر غلام محمد آجر قابل ذکر ہیں۔ اخبارات میں لکھنے والوں کی فہرست کافی طویل ہے۔ اُردو کی ترویج و ترقی کے سلسلے میں اگر حالات ایسے ہی سازگار رہے تو وہ دن دُور نہیں جب کہ یہاں کی اُردو نثر پوری طرح پنپ کر ساری ریاست پر چھا جائیگی۔

## شیرازہ میں چھپنے والی نگارشات

- ہر نگارش کا معقول معاوضہ پیش کیا جاتا ہے بشرطیکہ وہ غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ ہو
- ہندوستانی تاریخ، تمدن اور ثقافت و ادب کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل مضامین قبول کئے جاتے ہیں۔
- ریاست کے تمدنی ورثے کے بارے میں تحقیقی و تنقیدی مقالات ترجیحی طور پر شائع کئے جاتے ہیں
- فنِ تعمیر، آرٹ اور مصوری کے متعلق مضامین کے ساتھ تمثیلی تصاویر کا معاوضہ الگ سے دیا جا سکتا ہے۔
- منظومات بشرطیکہ معیاری ہوں، قبول کی جاتی ہیں۔
- اپنی نگارشات کے ساتھ اپنا پاسپورٹ سائز تصویر بھیجنا نہ بھولیں۔

منصور احمد منصور ⊛

# جموّں و کشمیر میں اردو ناول

## ۱۹۴۷ء کے بعد

جموں و کشمیر میں ناول کی روایت کوئی زیادہ پرانی نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہاں ناول ۴۷ء کے بعد ہی مرکزِ توجہ بنا تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ چنانچہ ناول کی صورت میں ہمارے پاس جو سرمایہ موجود ہے اس کا بیشتر حصّہ ۴۷ء کے بعد کی پیداوار ہے۔ کمیت کے اعتبار سے دیکھیں تو یہ ناول انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں لیکن کیفیت کے لحاظ سے یہ ناول مایوس کن نہیں۔ یہاں کے ناول نگار بلاشبہ ان فنّی معیاروں کو چھونے سے قاصر ہیں جو اردو میں کرشن چندر، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین وغیرہ نے قائم کئے ہیں۔ لیکن یہاں کے ناول نگار جس فنّی مہارت اور ریاضت کا ثبوت بہم پہنچا رہے ہیں وہ امید افزا بھی ہے اور قابلِ ستائش بھی۔ یہ ناول فنی تکنیکی اور موضوعی اعتبار سے حد درجہ روایتی ہیں لیکن ان ناولوں کی اہمیت کا اصل مدار اس بات پر ہے کہ یہ کشمیر

---

⊛ گورنمنٹ ڈگری کالج کرگل (جے اینڈ کے)

کے مختلف سیاسی، سماجی، معاشرتی اور تہذیبی رنگوں کو پیش کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو کے متعدد ادیبوں نے کشمیر کو اپنی تخلیقات میں پیش کیا ہے۔ ممتاز شعراء اور ادیبوں نے کشمیر کی گل بداماں وادیوں، سر بفلک برف پوش کہساروں، دوشیزہ سبزہ زاروں اور فطرت کے دیگر شاداب اور سحر کار مناظر کو اپنی تخلیقات کو سمونے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ان کی تخلیقات میں کشمیر کا صرف صرف "جسم" دکھائی دیتا ہے۔ یہاں کی "روح" بڑی حد تک ان کی نظروں سے اوجھل رہی۔ یہاں کے سحر آلود مناظر ان کی تخلیقی حسیت پر کسی طرح سے اثر انداز ہوئے۔ کشمیر کے فطری حُسن کا جادو اُن پر کچھ اس انداز سے سر چڑھ کر بولا کہ وہ یہاں کی سسکتی اور تڑپتی ہوئی زندگی کا اندازہ نہیں کر سکے۔ کشمیر میں لکھے گئے ناول سرسری معلومات اور اخباری اطلاعات پر مبنی ناول یا ڈرامہ نہیں —— جیسے "کشمیر کی بیٹی" (جمنا داس اختر کا ناول) یا کرتار سنگھ دگل کا ڈرامہ "اور دیا بجھ گیا"۔ —— بلکہ یہ ناول کشمیر کی سچی اور حقیقی زندگی کو پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ بیشتر ناول کرشن چندر کی "رومانیت" کے زیرِ اثر لکھے گئے اور ان ناولوں میں زندگی صرف "رومان" اور اس سے وابستہ شادابیوں، الجھنوں اور المیوں تک محدود ہے۔ یہ ناول رومان کے سرسری اور سطحی پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں۔ ان ناولوں کا کینوس محدود ہے اور پھر رومانی کیفیات، واردات اور سانحات کو بھی سطحی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً وجے سوری کے ناول "ایک ناؤ کاغذ کی" کی ہیروئن جب اپنے صاحب ثروت باپ کے ہاتھوں اپنے عاشق نامراد کی توہین و تذلیل ہوتے دیکھکر غش کھا کر گر پڑتی ہے تو ناول نگار اس جذباتی و نفسیاتی صدمے کی شدت کو گرفت میں لانے سے قاصر نظر آتا ہے۔ وہ اس کا اظہار یوں کرتا ہے:

"اُسے اس وقت ہوش آیا جب آواز آئی - بی بی! اُٹھو چائے پیو"۔

لیکن متعدد ناول زندگی کی زہرناکی، انسانی رشتوں کے پیچ و خم اور انسان کے ازلی و ابدی دُکھوں اور المیوں کو فنکارانہ بصیرت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ یہ ناول افلاس اور استحصال کی ماری زندگی کے نقش اُبھارتے ہیں۔ یہ آج کے انسان کے بیکل باطن کی پرچھائیوں کو مختلف انداز سے پیش کرتے ہیں۔ زیرِ نظر مضمون کوئی تنقیدی مضمون نہیں۔ یہاں مقصد صرف ایک ایسا خاکہ پیش کرنا ہے جو ۱۹۴۷ء کے بعد لکھے گئے ناولوں سے مترتب ہوا ہے۔ اس مضمون کو اسی نظر سے دیکھا جانا چاہیے۔

ریاست جموں و کشمیر میں اُردو ناول کے اوّلین نقوش اُبھارتے ہوئے ڈاکٹر برج پریمی لکھتے ہیں:

"انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے شروع میں سب سے پہلے ناول نگاری کی شروعات پنڈت سالگرام سالک اور مولوی محمد الدین فوقؔ نے کی۔ سالگرام سالک نے "داستان جگت روپ" اور "تحفۂ سالک" تصنیف کر کے نثر کے اس شعبے کی طرف توجہ کی۔ اگرچہ یہ تصانیف قطعی طور پر ناول کے زمرے میں شامل نہیں کی جا سکتیں۔ لیکن ان میں قصے کی مہک ہے۔ "داستان جگت روپ" ناول سے زیادہ ایک داستان ہے۔ اس سے بہتر کوششیں مولوی محمد الدین فوقؔ کے یہاں ملتی ہیں۔ فوقؔ کی تصانیف ایک سو کے لگ بھگ ہیں۔ ان میں ان کے نثری کارنامے بھی شامل ہیں۔ ان میں بعض قصّوں پر ناول نگاری کا

اطلاق کیا جا سکتا ہے۔"[1]

فوقؔ اور سالگرام سالکؔ کے بعد موہن لال مروہ اور وشوا ناتھ ورما نے ناول نگاری کی روایت میں توسیع کی۔ ڈاکٹر ظہور الدین جموں میں اردو نثر کا جائزہ لیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ موہن لال مروہ نے "داستانِ محبت" کے نام سے ایک ناول لکھا جو ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔ وشوا ناتھ ورما نے "تلاشِ حقیقت" کے نام سے جو کتاب لکھی وہ قصے کی مہک سے معمور ہے۔ کشمیر میں نند لال بے غرض نے اس شعبے میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ انہوں نے پنڈت رتن ناتھ سرشار کے تتبع میں "تازیانۂ عبرت" لکھا۔ ۱۹۴۷ء سے قبل کشمیر کے معروف افسانہ نگار پریم ناتھ پردیسی نے "پوتی" کے عنوان سے ناول لکھا۔[2] لیکن یہ ناول ۴۷ء کے ہنگاموں میں تلف ہوا۔

جموں و کشمیر میں ۱۹۴۷ء کے بعد ہی ناول نگاری کے میدان میں پیش رفت ہوئی اور نئی نسل سے تعلق رکھنے والے فنکاروں نے اچھے اور کامیاب ناول لکھے۔ قبل ازیں نرسنگھ داس نرگسؔ "پاربتی" اور "نرملا"[3] جیسے قابلِ ذکر ناول پیش کر چکے تھے۔ اس کے ساتھ ہی نرسنگھ داس کے ہم عصروں کشمیری لال ذاکر اور ٹھاکر پونچھی نے اس میدان میں قدم رکھا۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے متعدد ناول لکھے اور بحیثیت ناول نگار اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا۔ کشمیری لال ذاکر ناول نگاری کے میدان میں ایک ناولٹ "سیندور کی راکھ" سے متعارف ہوئے۔ ان کے ناولوں میں "جاتی ہوئی رُت"۔ "دھرتی"۔ "سدا سہاگن" وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اس دوران مدن موہن شرما، برج کیتال اور ملک رام آنند نے بھی ناول کے فن کی جوت روشن

---

۱ جموں و کشمیر میں اردو نثر کی نشو و نما صفحہ ۴۰

۲ و ۳ ایضاً صفحہ ۴۲ - ۴۴

کی۔ عبدالقادر سروری رقمطراز ہیں:

"ملک رام آنند کا پہلا ناول "نئے خدا" ۱۹۵۸ء میں مرتب ہوا اور اس کے بعد دوسرے ہی سال ایک اور ناول "دہکتے پھول شبنم آنکھیں" شائع ہوا۔ دو اور ناول "صلیب اور دیوتا" اور "اپنے وطن میں اجنبی" شائع ہوئے"[1]

برج کیتاں نے "چراغ بجھنے سے پہلے" کے نام سے ناول لکھا۔ مدن موہن شرما کے ناول "ایک منزل چار راستے" اور "پیاسے کنارے" کے نام سے شائع ہوئے یہ سبھی ناول زندگی کی ناہمواریوں اور سماجی تفاوت کو پیش کرتے ہیں تاہم صوبہ جموں کے لکھنے والوں میں جو اہم نام ہے وہ ٹھاکر پونچھی کا ہے۔

ٹھاکر پونچھی نے متعدد ناول لکھے۔ وہ صحیح معنوں میں ناول کے فنکار ہیں۔ انہیں ناول کے فن پر بھی عبور ہے اور زبان و بیان پر بھی دسترس حاصل ہے۔ وہ انسانی نفسیات کی باریکیوں کو بڑی چابکدستی سے پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ بڑی خوبصورتی سے دیہاتی و شہری زندگی کے مرقعے پیش کرتے ہیں۔ اہم سماجی و نفسیاتی مسائل بھی ان کے ناولوں سے جھلک رہے ہیں۔ ٹھاکر پونچھی کے ناولوں میں "وادیاں اور ویرانے"۔ "یادوں کے کھنڈر"۔ "شمع ہر رنگ میں جلتی ہے"۔ "زلف کے سر ہونے تک"۔ "اداس تنہائیاں" "چاندنی کے سائے" اور "پیاسے بادل" قابلِ ذکر ہیں۔

کشمیر میں ۱۹۶۰ء کے بعد جو ناول نگار سامنے آئے ان میں تیج بہادر بھان، غلام رسول سنتوش، علی محمد لون، حامدی کاشمیری، نور شاہ، شبنم قیوم، عمر مجید،

---

[1] کشمیر میں اردو تیسرا حصہ صفحہ ۳۴۲

وحشی سعید ساحل، بھوشن لال بھوشن، رشید پروین، فاروق رینزو اور جان محمد آزاد نمایاں ہیں۔ کشمیر میں اردو ناول کی ترویج و ترقی میں یہ فنکار سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن ان میں سے بیشتر ناول نگار دو ایک ناول لکھ کر اس فن سے دست کش ہو گئے۔ انہوں نے سنجیدگی سے اس فن کو نہیں اپنایا بلکہ بس ایک آدھ ناول لکھنے کا شوق پورا کیا۔ حالانکہ ان فنکاروں نے اپنے کارناموں سے ثابت کیا ہے کہ وہ اس صنف میں کافی دور تک جانے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ بد قسمتی کی بات ہے کہ وہ نثر کی اس اہم صنف کے جہانِ دیگر سے سرسری سے گزرے۔

تیج بہادر بھان نے صرف ایک ناول "سیلاب اور قطرے" کے عنوان سے لکھا۔ وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں لیکن "سیلاب اور قطرے" سے انہوں نے ایک اچھا ناول نگار ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ اس ناول کا موضوع کشمیر کے درد سے لبریز معاشرتی زندگی ہے جو افلاس اور استحصال کی شکار ہے اور جسے حکمران ٹولے کے استحصالی نظام نے پامال کر دیا ہے۔ تیج بہادر بھان نے اسے سیلاب کے پس منظر میں اُبھارا ہے۔ انہوں نے تاناشاہی کے چہرے سے بھی پردہ ہٹا دیا ہے۔ عبدالقادر سروری اس ناول پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ ناول ایک اچھا حقیقت پسندانہ بیانیہ اور کسی حد تک ایک نفسیاتی مطالعہ اور کشمیر کی فضا کے پس منظر میں ایک نچلے طبقے کی زندگی کے واقعات کے میٹھ بٹھاو کا دلچسپ اور معنی خیز نقشہ بن گیا ہے۔"

ریاست کے نامور شاعر اور نقّاد ڈاکٹر حامدی کاشمیری نے ابتدا میں افسانے اور ناول کو اپنایا۔ شاعر کے علاوہ وہ فکشن کی طرف اپنی توجہ مرکوز کئے ہوئے تھے۔ لیکن بڑی جلدی سے انہوں نے اپنے فکر و ہنر کی جولان گاہ تبدیل کر دی۔ انہوں نے شاعری اور تنقید کو اپنے فکر و فن کا مرکز و محور بنا لیا تاہم انہوں نے اردو ناول "پرچھائیوں کا شہر" جیسا قابلِ قدر ناولٹ بھی دیا۔ حامدی کاشمیری نے جو ناول لکھے ان کے نام یہ ہیں۔ "بہاروں میں شعلے"، "بلندیوں کے خواب"، "پگھلتے خواب"، "اجنبی راستے"۔ حامدی کشمیری کے ان ناولوں کا کینوس بہت ہی محدود ہے۔ ان ناولوں میں رومان کی سحر انگیزی ہے۔ لیکن پسِ منظر میں کشمیر کی زندگی اور یہاں کا سیاسی و سماجی ماحول شدّت کے ساتھ اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔ یہی ان ناولوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ بلندیوں کے خواب میں حامدی کاشمیری نے کشمیر کی جو تصویر پیش کی ہے وہ انتہائی کربناک ہے۔ کشمیر کی غیر فطری تقسیم اور غیر فطری اور مصنوعی تجارتی راستوں سے اہلِ کشمیر جن چیرہ دستیوں کے شکار ہیں "بلندیوں کے خواب" بڑی خوبی سے اسے پیش کرتا ہے۔ "پرچھائیوں کا شہر" ان کا اہم ناولٹ ہے۔ یہ ان کے فکر و فن کا ایک نیا موڑ بھی ہے۔ یہاں وہ داخلیت کے محشرستان میں قدم رکھتے نظر آتے ہیں۔ وہ انسان کے اندرون کے پیچیدہ مسائل کو اپنی فکر رسا کا ہدف بناتے ہیں۔

علی محمد لون اور غلام رسول سنتوش نے اردو ادب کو "شاہد ہے تیری آرزو" اور "سمندر پیاسا ہے" جیسے ناول دیئے۔ سنتوش کا اصل میدان مصوری ہے۔ "سمندر پیاسا ہے" ان کا واحد ناول ہے۔ اس ناول میں سنتوش نے

بڑی بے رحمی کے ساتھ انسان کے باطن میں موجود ہوسناکی اور زہرناکی کو اُبھارا ہے۔ یہاں زندگی ایک روگ کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ اس روگ نے جاجرہ، شگنتلا اور کلپنا جیسی کتنی ہی زندگیوں کو دیمک کی طرح چاٹ لیا ہے۔ یہ روگ انسان کے باطن میں پرورش پاتا ہے۔ یہ خود غرضی، بوالہوسی اور لذّت پرستی کا روگ ہے۔ ٹھاکر پونچھی اس ناول کے تعارف میں لکھتے ہیں:

"سمندر پیاسا ہے" ایک دریا کی کہانی ہے جو بہکی بھٹکی چھوٹی چھوٹی سی ندیوں کو اپنے سینے سے لگائے ان کی منزل کی جانب بڑھنے کی جستجو میں ہوتا ہے کیونکہ اسی میں اس کی اپنی محبت کی تکمیل ہے ...... سنتوش انسانی نفسیات اور سیاسی و سماجی باریکیوں اور لغزشوں پر گہری نظر رکھتا ہے۔"[1]

علی محمد لون نے ڈرامہ نگار کی حیثیت سے نام کمایا۔ انہوں نے افسانے بھی لکھے اور دہلی میں دورانِ ملازمت "شاہد ہے تیری آرزو" کے نام سے ایک ناول بھی لکھا۔ عبدالقادر سروری کے مطابق یہ ان کے قیام دہلی کے زمانے کے مشاہدات اور تجربات کی پیداوار ہے۔

نور شاہ ایک مقتدر افسانہ نگار ہیں۔ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے انہوں نے اپنا مقام بنایا ہے۔ نور شاہ کے افسانوں میں کشمیر کی سماجی و معاشرتی زندگی کی بو باس رچی بسی ہے۔ وہ یہاں کی زندگی کے متنوع رنگوں کے فنکار ہیں۔ مفلوک الحال اور مجبور و مقہور لوگوں کی زندگی، ان کے خواب، ارمان، خواہشات اور رنج و غم ان کے فکشن میں خاص طور پر سامنے آتے

---

[1] تعارف "سمندر پیاسا ہے" صفحہ ۷، ۸

ہیں ۔ ان کے ناولوں "پایل کے زخم" اور "نیلی جھیل کالے سائے" میں بھی یہی رنگ بکھرے نظر آتے ہیں۔

اس دوران نئی نسل کے متعدد فنکار سامنے آئے۔ عمر مجید کے دو ناول "یہ بستی یہ لوگ"، "درد کا دریا"، بھوشن لعل بھوشن کا ناول "صرف پانچ ہزار"، رشید پروین کے دو ناول "دل اور دیا"، "پیاسی پایل" اور وحشی سعید ساحل کے ناول "خون اور محبت"، "منزل اور تلاش" اور "قحط" منظرِ عام پر آئے۔ ان ناول نگاروں کا اپنا ایک الگ لکھنے کا انداز ہے۔ یہ کہیں رومان کی دھند میں لپٹی فضا کو پیش کرتے ہیں اور کہیں سماجی نابرابری سے پیدا شدہ مسائل کو ابھارتے ہیں۔ ان میں عمر مجید اپنے گردوپیش کی زندگی کا گہرا ادراک رکھتے ہیں۔ ان کے تجربے احساس کی آنچ سے پگھل کر لفظ و بیان میں ڈھل جاتے ہیں۔ انہیں کشمیری عوام کی زندگی کا قریبی مشاہدہ ہے۔

پچھلے برسوں میں ناول نگاری کے فن میں جو باصلاحیت فنکار سامنے آئے ان میں عمر مجید کے علاوہ شبنم قیوم، جان محمد آزاد اور فاروق رینزو قابلِ ذکر ہیں۔ شبنم قیوم نے افسانوں کے علاوہ جو ناول لکھے ان میں "زندگی اور موت"، "انسان اور کتے"، "جس دیش میں جہلم بہتی ہے"، "چراغ کا اندھیرا" اور "یہ کس کا لہو ہے کون مرا" شامل ہیں۔ جان محمد آزاد کے چار ناول شائع ہوئے۔ "وادیاں بلا رہی ہیں"، "ظلمات کے ہم سفر"، "کشمیر جاگ اٹھا" اور "برفیلے لمحوں کا جنگل"۔ فاروق رینزو کے دو ناول چھپ چکے ہیں۔ "زخموں کی سالگرہ" اور "کشمیر — جھیل جلتی ہے"۔

عمر مجید، شبنم قیوم، جان محمد آزاد اور فاروق رینزو میں ایک بات

قدرِ مشترک ہے کہ یہ سبھی کشمیر کے ساتھ، اہلِ وطن کے ساتھ گہری وابستگی رکھتے ہیں ۔ یہ ناول نگار کشمیریوں کی زندگی کے درد و داغ کو پیش کرتے ہیں۔ یہاں لوگوں نے جو چرکے کھائے، روحوں اور دلوں میں جو گھاؤ لگے ہیں، انہیں یہ یہ فنکار مقدور کے مطابق اپنے فن میں سمونے کی کوشش کرتے ہیں۔ خوش آیند بات یہ ہے کہ انہوں نے ناولوں کو اپنے فکر وفن کا مستقر بنایا ہے۔

شبنم قیوم سیاسی حکمرانوں کے چہروں پر پڑے پردوں کو بڑی بے باکی کے کے ساتھ چاک کر دیتے ہیں۔ "موت اور زندگی" اور "یہ کس کا لہو ہے کون مرا" اسی قبیل کے ناول ہیں۔ اس سے یہ غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہیئے کہ شبنم قیوم نے دیگر مسائل سے آنکھیں چُرالیں ہیں۔ "چراغ کا اندھیرا"، "انسان اور کتے" اور "جس دیش میں جہلم بہتی ہے" زندگی کے درد، تڑپ اور ظلم و استحصال کو پیش کرتے ہیں۔

فاروق رینزو نے بھی اپنا سفر افسانہ نگاری سے شروع کیا۔ "زخموں کی سالگرہ" اور "کشمیر — جھیل جلتی ہے"۔ ان کے قابلِ ذکر ناول ہیں۔ "زخموں کی سالگرہ" ۱۹۸۲ء میں منظرِ عام پر آیا تھا۔ فاروق رینزو نے اس ناول میں نئی نسل کی ناآسودگیوں، محرومیوں اور اس کے نتیجے میں پیدا شدہ نفسیاتی الجھنوں کو فنی چابکدستی سے پیش کیا۔ "کشمیر، جھیل جلتی ہے" ان کا تازہ ترین ناول ہے۔ یہ ایک سماجی اور اصلاحی ناول ہے جس میں مصنّف نے فریب، ریا، لالچ اور بے چہرگی کے مکروہ پہلو خاص طور سے ابھارے ہیں۔ اس ناول میں مصنّف کے لب و لہجے میں زبردست تلخی گھلی ہوئی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار جمال ابتدا میں اپنا تعارف اس طرح کراتا ہے۔

"جمال کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ زبان بھیڑیئے
کی طرح باہر لٹک رہی تھی۔ سُرخ زبان سے ٹپکتی رال خون
کی تپش سے سفید جھاگ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ وہ پھر اژدہے
کی طرح پھنکار اٹھا۔ لوہے کی سفید کلہاڑی ایک بار پھر ہوا میں چمکی۔"[1]

ڈاکٹر قمر جہاں "کشمیر، جھیل جلتی ہے" پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"جمال اس ناول کا سب سے نمایاں کردار ہے۔ وہ آج کے
جوشیلے نوجوان کی تصویر ہے جس نے بغاوت اور انتقام کی
کی آگ میں خود اپنی ہستی کو مٹا دیا۔ جمال نے قتل و خون کے
ساتھ کچھ نیک کام بھی کئے ہیں ۔۔۔۔ اس طرح فاروق صاحب
نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ بُری سیرت سب کے لئے
بُری نہیں ہوتی۔ انسان وقت اور حالات کے تقاضے کے تحت
بنتا اور بگڑتا ہے۔"[2]

جان محمد آزاد نے اردو ادب میں تین[3] قابلِ ذکر ناولوں کا اضافہ کیا ہے جن میں "کشمیر جاگ اٹھا"۔ "وادیاں بُلا رہی ہیں" اور "برفیلے لمحوں کا جنگل" شامل ہیں۔ ان کا نیا ناول "شہر ملال کے ہم سفر" اس وقت زیر طبع ہے۔ جان محمد آزاد کو ناول کے فن پر مکمل دسترس حاصل ہے۔ ان کا اسلوب اور لب و لہجہ بھی چونکا دینے والا ہے۔ وہ کہانی کہنے کا گُر جانتے ہیں اور اپنے گرد و پیش سے اپنے ناولوں کا تانا بانا بُنتے ہیں۔

---

[1] کشمیر جھیل جلتی ہے۔ صفحہ ۷

[2] اردو بک ریویو۔ جولائی اگست ۱۹۹۷ صفحہ ۲۵

جان محمد آزاد کے اسلوب پر کرشن چندر کا زبردست اثر ہے۔ وہ کرشن چندر کے زیرِ اثر کشمیر کی کہستانی زندگی کی چیرہ دستیوں، الجھنوں اور استحصال کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ کرشن چندر کا ناول "شکست" کشمیر کی کہستانی زندگی کو پیش کرتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جان محمد آزاد کرشن چندر کے تتبّع میں لکھ رہے ہیں۔ ان کی اپنی نظر ہے، اپنا انداز ہے، ان کا اپنا لہجہ ہے۔ ڈاکٹر محمد زماں آزردہؔ نے ان کے بارے میں بجا طور پر لکھا ہے:

"..... مصنّف (جان محمد آزاد) کو اپنی مادرِ وطن کشمیر سے بے پناہ محبّت ہے اور یہی محبّت ان سے لکھواتی ہے۔ وہ عام لکھنے والوں کی طرح سے اپنے پیشروؤں کی نقالی نہیں کرتے بلکہ اپنی محبّت سے مجبور ہو کر اپنے لئے اس کی تکمیل کا راستہ خود تلاش کرتے ہیں۔ وہ اپنا ایک اندازِ سفر رکھتے ہیں اور اپنے جادۂ شوق کی تراش خراش کرتے ہوئے وہ خود آگے بڑھتے ہیں۔"[1]

ڈاکٹر حامدی کاشمیری ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جان محمد آزاد بیدار ذہن کے مالک ہیں۔ وہ گہرے شعور کے ساتھ اپنے گرد و پیش کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ ایک شاعر کے نازک احساس، خواب آفرینی اور نازک مشاہدے سے آراستہ ہیں۔ لیکن ان کا ذہن معاشرتی، تاریخی اور سیاسی حالات کے تجزیے پر اصرار کرتا ہے ..... یہی وجہ ہے کہ ان کا ناول ______ سماجی، رومانی اور سیاسی فضا کا

---

[1] "کشمیر جاگ اٹھا"۔ تعارف صفحہ ۹

مشترکہ خاکہ بن کر ابھرتا ہے۔"[1]

جان محمد آزاد کا پہلا ناول "وادیاں بلا رہی ہیں" کے نام سے آیا۔ یہ جذبات میں ڈوبی ہوئی کہانی ہے۔ آزاد نے اس ناول میں کشمیر کی کہستانی زندگی کو پیش کیا۔ اس کے بعد ان کا دوسرا ناول "کشمیر جاگ اٹھا" شائع ہوا جو اوّل الذکر ناول کی ارتقائی، ارتفاعی اور توسیع شدہ صورت ہے۔ یہاں بھی دامنِ کوہ میں سسکتی اور تڑپتی زندگی نظر آتی ہے۔ لیکن اس ناول کا کینوس پہلے سے زیادہ پھیلا ہوا ہے۔ اس ناول میں آزاد نے بدلتی ہوئی قدروں اور بدلتے ہوئے سیاسی منظرنامے کو بھی بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ "برفیلے لمحوں کا جنگل" ان کا تازہ ناول ہے۔ اس ناول میں جان محمد آزاد نے اپنے اسلوب کی ندرت کا احساس دلایا ہے۔ اسلوب کی یہی نُدرت اور تازہ کاری اس ناول کی پہچان ہے۔

جان محمد آزاد نے اس ناول میں تحیّر کی ایک طلسماتی فضا پیدا کی ہے۔ یہ ان کے حیرت زا اسلوب کا ہی کرشمہ ہے۔ "برفیلے لمحوں کا جنگل" اس بات کا روشن ثبوت ہے کہ جان محمد آزاد اگر جاسوسی ناول لکھنا شروع کردیں تو معرکے کے جاسوسی ناول لکھ سکتے ہیں۔ جان محمد آزاد اس شاداب اور رسیلے اسلوب میں ادبی ناول پیش کریں تو بہتر ہے۔ ناول نگاری کے ضمن میں ان سے کافی توقعات وابستہ ہیں۔[2] وہ بلاشبہ ایک منجھے ہوئے ناول نگار ہیں۔

غرض کشمیر میں لکھے گئے ناولوں کا قابلِ ذکر سرمایہ موجود ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان ناولوں کو فن کی کسوٹی پر رکھ کر ان کے محاسن اور معائب کا جائزہ لیا جائے۔ یہ کام یہاں کے ناقدین کا ہے۔

○

---

[1] "کشمیر جاگ اٹھا"۔ حرف اوّل صفحہ ۱۲

سجود سیلانی

# جموں و کشمیر میں اردو ڈراما

## ۱۹۴۷ء کے بعد

۱۹۴۷ء کا ہنگامہ، جو سیاسی انقلاب کہلاتا ہے، ایک کند چھری تھی۔ جو بے تحاشا برِصغیر پر پھیر دی گئی۔ برِصغیر تقسیم ہوا تو انسانی خون میں لت پت دو الگ الگ مملکتیں وجود میں آئیں۔ وہ زمانہ بہت ہی لرزہ خیز رہا۔ ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔ سماجی اور اخلاقی قدریں بری طرح مجروح ہو رہی تھیں۔ حتیٰ کہ بٹوارے کے کارن انسانی رشتے بھی دو حصوں میں بٹ گئے۔ لیکن برِصغیر میں صدیوں سے پنپ رہا ہمارا تہذیبی ورثہ بٹ نہ سکا۔ ہماری مشترکہ ثقافت اور ادب تقسیم نہ ہو سکا۔ بلکہ ہماری تمام تر قدیم روایات جوں کی توں رہیں۔ اگرچہ اس جانب از۔ تمدنی اور ادبی روایات پر ہندی کا لبادہ چڑھا اور اُس پار دوسری سمت ان روایات کا پہناوا اُردو کا ہی رہنے دیا گیا۔ تاہم دونوں جانب پنپ رہی مشترکہ روایات کا مزاج نہ بدل سکا۔ البتہ اس سیاسی ہڑبونگ

---

* "تخلیق"۔ پاندریٹھن۔ نیشنل ہائی وے۔ سری نگر، کشمیر – ۱۹۱۱۵۱

سے پیدا ہونے والی افراتفری نے انسان کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔
قلم کار، چتر کار، فنکار اور تمثیل نگار فطرتاً حساس ہوتے ہی ہیں۔ اس لئے لرزہ خیز
خون خرابہ دیکھ کر ایسے حساس لوگوں کا متاثر ہونا فطری تھا۔ اس وجہ سے ریاست
جموں وکشمیر کے فنکاروں، ادیبوں اور ڈرامہ نگاروں کی سوچ اور فکر میں
ایک حیران کُن انقلاب برپا ہوا۔ اسی زمانے میں عالمی سطح پر ترقی پسند تحریک
کا نعرہ گونجنے لگا تھا اور اس کی بھنک یہاں کے دانشوروں، فن کاروں
اور تمثیل نگاروں کے کانوں میں بھی پڑ گئی۔ اسی نظریہ کے تحت ۱۹۴۷ء کی
ابتداء میں ہی کلچرل فرنٹ نامی تنظیم وجود میں آئی۔ اس طرح ریاست بھر
کے دانشور، ادیب، شاعر اور ڈرامہ نویس اسی کلچرل محاذ کی چھتر چھایا میں جمع
ہوگئے اور نئے تخیل اور نئے نظریئے کو لیکر بے تحاشا لکھنے لگے۔ ابتداء میں اکثر
ادیب، شاعر اور تمثیل نگار اردو زبان میں ہی طبع آزمائی کرتے رہے لیکن
تقریباً ہر قلم کار کی سوچ اور فکر کا دائرہ بہت ہی محدود رہا۔ اس لئے وہ موضوع
کا بہتر انتخاب کرنے میں معذور رہے۔ موجودہ دور کے ایک نوخیز قلم کار کو
ہی دیکھئے۔ اس کے ذہن کا کینواس اتنا کشادہ ہے کہ ذہنی طور پر وہ
Infinity تک پرواز کر سکتا ہے۔ لیکن ۱۹۴۷ء کے انقلابی ماحول میں جنم
لینے والا فنکاروں کا ریلا ترقی پسند تحریک کی محدود چار دیواری سے باہر نہ
آسکا۔ یہی وجہ ہے کہ موضوع کے اعتبار سے اس عہد کے ڈرامہ نویس وطن پرستی،
قومی ایک جہتی اور سیلاب کی تباہ کاریوں کے سوا کوئی تخلیقی شاہکار منظرِ عام
پر نہ لاسکے جو ادبی کسوٹی پر کھرا ثابت ہوتا اور جس کی بے دریغ سراہنا ہوتی۔
لیکن اس دور کے فنکار، چتر کار اور تمثیل نگار ایک خاص مصلحت کے

تحت ترقی پسند تحریک کا نعرہ لگانے میں ہی مصروف رہے۔ دراصل اس دور کے شائستہ سیاستدان غلام محمد صادق کو ترقی پسند تحریک نے متاثر کیا تھا۔ وہ اچھے سیاست داں ہونے کے ساتھ ساتھ ادب نواز بھی تھے۔ اس لئے حالات کے پیشِ نظر انہوں نے کلچرل فرنٹ کی سرپرستی قبول کی۔ اس طرح ان کی ہی وساطت سے مذکورہ تنظیم کو مالی معاونت بھی فراہم ہوتی رہی۔

کلچرل محاذ کے خوشگوار ماحول اور بہتر سرپرستی میں یہاں کے کچھ گنے چنے ڈراما نویسوں نے پے در پے کئی ڈرامے لکھے۔ اردو میں بھی اور کشمیری زبان میں بھی۔ لیکن اس زمانے میں پیدا شدہ ادب کا زیادہ تر حصہ ہمیں اردو میں ہی نظر آتا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس دور کے اکثر ڈرامے اشتہاری ہیں۔ گویا زیادہ تر ڈرامے پروپیگنڈے کے ارادے سے تخلیق کئے گئے ہیں۔ اس دور میں لوگوں کو وطن پرستی اور باہمی یک جہتی کا احساس دلانا ضروری تھا۔ ساتھ ہی ساتھ عوام کو سیلاب اور وبار کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہنے کی تلقین کرنا بھی لازم تھا۔ اس لئے پروپیگنڈوں کے لئے ڈرامے کو ہی موثر مانا گیا۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ تمام تر اصنافِ سخن میں ڈرامہ ہی بآسانی انسانی ذہنوں کو متاثر کرسکتا ہے۔ کیونکہ ڈرامے میں بیک وقت کلام بھی ہے اور موسیقی بھی، مصوری کے عناصر اور شاعری بھی موجود ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈرامہ بیک وقت انسان کے دل اور دماغ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اسی سہولت کو بروئے کار لاتے ہوئے کلچرل محاذ نے جگہ جگہ عارضی سٹیج بنا کر ڈرامے پیش کئے جو لوگوں نے بہت پسند کئے۔

کلچرل فرنٹ کے جھنڈے تلے بھلے ہی اشتہاری نوعیت کے ڈرامے لکھے

گئے، پھر بھی ہم مطمئن ہیں کہ ۱۹۴۷ء تک جو جمود وادی کے تھیٹر اور ڈرامانویسی پر طاری تھا، وہ ٹوٹ گیا۔ جہاں تک اردو ڈراموں کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس ضمن میں پروفیسر محمود ہاشمی نے ہی پہل کی اور ڈراما "یہ کشمیر ہے" لکھا۔ یہ ڈرامہ خالص وطن پرستی کے نعروں سے لبریز ہے اور ڈرامے کی نوعیت کا اندازہ اسکے عنوان سے ہی لگایا جاسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی کئی اور ڈرامے تحریر ہوئے اور عارضی سٹیجوں پر کھیلے بھی گئے۔ پریم ناتھ پردیسی نے یکے بعد دیگرے کئی ڈرامے لکھے جنمیں تین ناٹک "سوامی" "سنگھرش" اور "مستعصم کی آخری رات" قابلِ ذکر ہیں۔ مرحوم سوم ناتھ زتشی نے "نوائے سروش" کے عنوان سے مرزا اسداللہ خان غالب کے حالاتِ زندگی کو ڈرامائی شکل دی۔ مرحوم علی محمد لون نے "دیوانے کا خواب" نامی ڈرامہ لکھا جو فنی اعتبار سے سراسر تخلیقی ہے۔ اس دور میں کشمیر کے قلمکاروں کے متوازی ڈگر دیش میں بھی کچھ ناٹک کار سامنے آئے جن میں اکثر اردو زبان میں ہی لکھنے لگے۔ ایسے ڈرامانگاروں میں بحیثیت پیش رو منوہر رائے زادہ، رام کمار ابرول، زبیدہ سیمی اور پروفیسر مدن موہن شرما قابلِ ذکر ہیں۔ ادھر وادی میں کلچرل محاذ کے زیرِ اہتمام کئی ڈرامے پے در پے سٹیج پر کھیلے گئے جو لوگوں میں بہت مقبول ہوئے۔ اگرچہ زیادہ تر ڈرامے کشمیری زبان میں ہی لکھے گئے تھے۔ لیکن اردو ڈراموں کی بھی حوصلہ بخش سراہنا ہوتی رہی۔ لیکن بڑھتی ہوئی ثقافتی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے کچھ نااہل اور کم ظرف لوگوں نے ادیبوں اور فنکاروں کے درمیان ایسا رخنہ ڈالا کہ مضحکہ خیز رسہ کشی نے جنم لیا۔ ادیبوں، فنکاروں اور تمثیل نگاروں کی اسی رسہ کشی کی وجہ سے کلچرل محاذ کا شیرازہ جلد ہی بکھر گیا۔ دراصل اُس زمانے کے ادیبوں نے ترقی پسند تحریک کا جو نعرہ لگایا تھا وہ بظاہر کھوکھلا تھا۔

اصل میں کلچرل فرنٹ کے سرپرست مرحوم غلام محمد صادق ہی تنہا ترقی پسند تحریک کے حامی تھے۔ باقی حضرات اُن کی خوشنودی حاصل کرنے کی چاہت میں یوں ہی ترقی پسندی کا سوانگ رچا رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بنی بنائی تنظیم ٹوٹ گئی۔ کلچرل محاذ کا شیرازہ کیا بکھرا، مانو برسات تھم گئی اور برساتی مینڈک کچھ عرصہ کیلئے بلاوجہ اور بے ترتیب اِدھر اُدھر پُھدکتے رہے۔ لیکن کچھ ہی مدّت گزری تھی کہ ایک نئی تنظیم کلچرل کانگرس کے نام سے وجود میں آئی۔ بکھرے ہوئے ادیب، شاعر، فنکار اور ڈراما نویس پھر سے یکجا ہو گئے۔ تب یہاں کے قلم کاروں نے نئے ولولے اور نئی لگن سے نئی سوچ کو بروئے کار لانا شروع کیا۔

مرحوم دینا ناتھ نادمؔ نے "بومبُر یمبرزل" کے نام سے ایک منظوم ڈراما (اوپیرا) لکھا۔ معیار کے اعتبار سے یہ اوپیرا تخلیقی ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس منظوم ڈرامے میں پہلی بار علامتوں کا سہارا لیا گیا۔ چنانچہ دینا ناتھ نادمؔ کا یہ منظوم ڈرامہ کشمیری زبان میں لکھا ہوا ہے۔ پھر بھی راقم الحروف نے نمونۂ فن کے طور پر اس مقالے میں اس کی نشاندہی کی۔ حالانکہ راقم الحروف کو ۱۹۴۷ء سے اب تک تخلیق ہوئے اردو ڈراموں کا ہی جائزہ لینے کی تاکید ہے۔ غرض کہ دیگر ناٹک کاروں نے اُسی اوپیرا کو ماڈل سکرپٹ مانا۔ پھر اسی سٹائل کی تقلید کرتے ہوئے اپنے اپنے انفرادی انداز میں علامتوں سے استفادہ کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ تمام ڈراما نگاروں کے ذہنوں کے دریچے کُھلنے لگے۔ تب وہ روزمرہ رونما ہونے والے واقعات، حالات وغیرہ سے متاثر ہو کر ڈرامے لکھنے لگے۔ لیکن کچھ ڈرامے حقیقی واقعات کی ہو بہو نقل ثابت ہوئے جو تخلیقی عمل سے قطعی عاری ہیں۔ اس بارے میں کہہ دوں کہ کچھ عقل مندوں نے وقتاً فوقتاً غلط نظریات پیش

کیے۔ بے تحاشا کہا جاتا ہے کہ زندگی بذاتِ خود ڈراما ہے، جو قطعی درست نہیں۔ میں ذاتی طور سے کہونگا کہ بلا سوچے سمجھے کوئی فتویٰ دینا عقلمندی نہیں ہے۔ انسانی زندگی حقیقت پر مبنی ہے۔ انسان سے سرزد ہونے والی حرکات اور اس کے اردگرد رونما ہونے والے واقعات فطری ہیں۔ حقائق پر مبنی انسانی فطرت کو ڈراما کہنا درست نہیں، بلکہ غلط ہے۔ ڈراما اسی صورت کو کہا جاتا ہے جو حقیقی واقعات یا واقعہ سے متاثر ہوکر اپنے تخلیقی عمل کے سہارے پیش کیا جائے اور اُس عمل میں ارادۂ نمائش ہو۔ ریاست بھر میں پنپ رہے تمثیل نگاروں میں کچھ باصلاحیت قلم کار اسی نظریہ کے تحت ڈرامے لکھتے رہے اور کچھ نااہل یوں ہی ڈرامے لکھنے کے خبط میں صرف سر ہی کھپاتے رہے اور بلا ضرورت ضخامت کے اعتبار سے ادب میں اضافہ کرتے رہے اور متواتر کر رہے ہیں۔

کلچرل کانگرس کی چھاؤں میں زیادہ تر شاعر، نثر نگار اور مصور ہی جمع ہوگئے تھے جبکہ تمثیل نگار چند ہی تھے، انگلیوں پر گننے کے برابر۔ اُن میں نمایاں حیثیت جن کی رہی وہ ہیں علی محمد لون، سوم ناتھ زتشی، وجے سمن سوسن، قیصر قلندر، پریم ناتھ پردیسی، رام کمار ابرول، منوہر رائے زادہ اور بنسی نردوش۔ لیکن سرینگر کا ریڈیو سٹیشن قائم ہوتے ہی ایسے سب ڈراما نویس ریڈیو کی جانب متوجہ ہوگئے اور ریڈیائی ڈرامے لکھنے میں جُٹ گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بہت عرصہ تک وادی میں سٹیج ڈراموں کا فقدان رہا۔ اس پر طرہ یہ کہ پوری وادی میں کوئی مستقل سٹیج بہم نہ تھا۔ پھر بھی نئی نسل کے کچھ ڈراما نگار ایسے بھی اُبھر کر سامنے آئے جن میں اوتار کرشن رہبر، آفاق احمد اور راقم الحروف کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اوتار کرشن رہبر جیسے نئے ادیب کشمیری زبان میں ہی لکھنے لگے۔ تاہم راقم الحروف ریڈیائی ڈراموں کے ساتھ ساتھ

سٹیج کے لئے بھی لکھتا رہا۔ چنانچہ ان ہی دنوں راقم الحروف کے ایک ایکٹ کے چند ڈرامے منظرِ عام پر آئے۔ ۱۹۵۶ء میں راقم الحروف نے پہلا سٹیج ڈراما "ٹھگ" لکھا جو کردار طرازی کے پیشِ نظر بیک وقت اردو اور کشمیری میں تھا۔ وہ ڈراما مرحوم غلام محمد صادق کی موجودگی میں سدھار سمتی (کنہ کدل) کے رنگ منچ پر بڑے احتشام سے کھیلا گیا۔

سرینگر میں ٹیگور ہال تعمیر ہوتے ہی رہبر، کیمو اور سجود کے علاوہ ڈراما نویسوں کی ایک نئی پود ابھر کر سامنے آئی جو صرف اور صرف سٹیج کے لئے ہی لکھنے لگے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ابھرنے والی ڈراما نگاروں کی اس تیسری نسل میں شامل قابلِ ذکر نام ہیں شبنم قیوم، بھوشن بیتاب، ہی پروانہ، وجے سوری، جتندر شرما وغیرہ۔

کچھ عرصہ بعد جموں میں ابھینو تھیٹر تعمیر ہوا۔ تب وہاں بھی کچھ نئے تمثیل نگار منظرِ عام پر آئے جنہوں نے ڈوگری ناٹکوں کے علاوہ کئی اردو ڈرامے بھی تحریر کئے۔ ان میں سرِ فہرست پروفیسر مدن موہن شرما ہیں۔

دفعتاً کشمیر کے ادیبوں، شاعروں اور تمثیل نگاروں کو علاقائی زبانوں میں ادب تخلیق کرنے کی سوجھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اکثر قلمکار اردو سے منہ موڑ کر کشمیری زبان میں ہی طبع آزمائی کرنے میں مصروف ہو گئے۔ لے دے کے علی محمد لون اور بنسی نردوش کے شانہ بشانہ راقم الحروف ہی کشمیری کے علاوہ اردو میں بھی ڈرامے لکھتا رہا۔ ادھر جموں خطے کے ادیب اور شاعر ڈوگری اور دیگر علاقائی زبانوں کی جانب بہت دیر کے بعد راغب ہوئے یہی وجہ ہے کہ کشمیر کے مقابلے میں جموں میں اردو ڈراما نگاری خوب سے خوب تر پروان چڑھتی رہی اور وہی رجحان وہاں برابر جاری ہے۔ اس کے برعکس وادیٔ کشمیر میں علی محمد لون اور بنسی نردوش

کے بعد سجود سیلانی کے علاوہ کوئی چوتھا تمثیل نگار نظر ہی نہیں آتا جو کشمیری کے ساتھ ساتھ اردو ڈرامے بھی لکھتا رہا ہو۔ البتہ جموں خطے میں ناٹک کاروں کا بڑا سا ریلا موجود ہے جو خالص اردو میں ہی لکھتے ہیں۔

ٹیگور ہال اور ابھینو تھیٹر کے قیام کے ساتھ ہی ریاستی کلچرل اکادمی سالانہ ڈراموں کے میلے منعقد کرتی رہی۔ ان ڈراما میلوں میں غیر ریاستی ناٹک کاروں کے علاوہ کئی مقامی ڈراما نویسوں کے اردو ڈرامے بھی کھیلے گئے۔ ۱۹۷۲ء سے کشمیر تھیٹر فیڈریشن بھی سالانہ ڈرامہ فیسٹول منعقد کراتا رہا جس میں کشمیری ڈراموں کے ساتھ کچھ اردو ڈرامے بھی شامل رہے۔ غرضیکہ کشمیر میں اردو ڈراما آخری سانس لیتے ہوئے بھی وقتاً فوقتاً ناظرین کی نظروں سے گذرتا رہا۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۷ء تک لکھے گئے اردو سٹیج ڈراموں کا جائزہ لیتے ہوئے میں چاہوں گا کہ اپنے پیش رو مرحوم علی محمد لون کی ہی نگارشات کا اوّلین فرصت میں تذکرہ کروں۔ اُن کے ڈرامے "دیوانے کا خواب" کا ذکر سطحی طور پر پہلی سطور میں کر چکا ہوں جو ۱۹۵۶ء میں کلچرل کانگریس کے اہتمام سے کھیلا گیا تھا۔ اس کے بعد علی محمد لون نے "گھروندے" لکھا۔ جو ڈل جھیل کے ماحول میں رہائش پذیر ہانجیوں کی زندگی پر مبنی ہے۔

تخلیقی ڈراموں کے علاوہ انہوں نے کچھ غیر ملکی زبانوں کے ڈراموں کا بھی اردو میں ترجمہ کیا۔ جن میں "چور" کے عنوان سے سوفوکلیز کا ڈرامہ انٹی گونی اور داستوویسکی کے انگریزی ڈرامہ My Uncle's dream کا ترجمہ "خالو جان کا خواب" شامل ہے۔ ان ترجموں کے علاوہ علی محمد لون نے "چٹان" کے نام سے ایک اور تخلیقی ڈراما لکھا جو ان ہی دنوں امر سنگھ کالج کے طلباء نے کھیلا۔ اس کے علاوہ ریاستی

کلچرل اکادمی نے اپنی مالی وساطت سے لون صاحب کا ڈرامہ "جھیل بلا رہی ہے" پیش کیا۔ یہ کھیل بھی "گھروندے" کی طرح کشتیوں میں رہنے والے ہانجیوں کی گھریلو زندگی پر مبنی ہے۔

علی محمد لون کے انتقال کے بعد وادیٔ کشمیر میں موجود لے دے کے بنسی نردوش اور سجود سیلانی ہی دو ایسے ناٹک کار ہیں جو کشمیری کے علاوہ اردو میں بھی اسٹیج ڈرامے لکھتے ہیں۔ بنسی نردوش کا لکھا ہوا ڈراما "ایک رات کا مہمان" بہت عرصہ پہلے طبع شدہ صورت میں منظرِ عام پر آچکا ہے سرینگر میں ٹیگور ہال کے نام سے تھیٹر قائم ہوتے ہی ڈراموں کا مقابلہ شروع کیا۔ اس کے ابتدائی مرحلے میں راقم الحروف کا مزاحیہ تمثیل "شاہکار" اُسی اسٹیج پر کھیلا گیا۔ اس ڈرامے میں خوش فہمی میں مبتلا گھٹیا قسم کے شاعروں اور نااہل مصوّروں پر بھرپور طنز کیا گیا ہے۔ ۱۹۷۲ء میں راقم الحروف کے لکھے ہوئے ایک ایکٹ کے اردو ڈراموں کا مجموعہ "شاہکار" منظرِ عام پر آیا جس میں شاہکار کے علاوہ "مجنون کا مقدمہ"۔ "لقمان کا دادا"۔ "جنم جنم کے پھیرے" اور "ریت کی دیوار" شامل ہیں۔ اس کے بعد راقم الحروف کا طویل ناٹک "ہتکڑی" اسٹیج پر کھیلا گیا جو بہت مقبول ہوا۔ یہ ڈراما اردو اور بھوجپوری میں لکھا گیا ہے۔ کہانی کے لحاظ سے یہ ڈرامہ ہندوستانی خانہ بدوش بنجاروں کی معاشی بدحالی اور گھریلو کشمکش پر مبنی ایک پُر اثر المیہ ہے۔ غرضیکہ راقم الحروف نے ریڈیائی ڈراموں اور دوردرشن کے سیریلوں کے علاوہ ڈھیر سارے اردو ڈرامے لکھے ہیں جن میں کچھ ریاستی کلچرل اکادمی کے اشاعتی سلسلے کے طفیل منظرِ عام پر آچکے ہیں اور باقی کتابی صورت میں عنقریب شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں "گرگٹ کے رنگ"، "پتھر پگھلتا ہے"، "لوہے کے چنے"، "جلترنگ عرف تانت"

"سونے کی چڑیا"، "ساجھے کی ہانڈی"، "حیاتِ نو"، "آستین کا سانپ" اور "رائی کا پہاڑ" شامل ہیں۔

ادھر ڈگر دیش میں پنپ رہے ناٹک کاروں کا بڑا گروپ اردو ڈرامے لکھنے میں محو ہے۔ وہاں کے پیش رو ڈرامہ نگاروں میں منوہر رائے زادہ، زیڈ سیمی، وجے سمن سوسن، رام کمار ابرول اور مدن موہن شرما قابلِ تذکرہ ہیں۔ منوہر رائے زادہ کے ڈراموں کا مجموعہ "اردو ڈرامے" ۱۹۶۴ء میں چھپ کر منظرِ عام پر آ چکا ہے۔ اس مجموعے میں پانچ ڈرامے شامل ہیں، تاش کا گھر، پنجرا، ایک پتھر اور ایک محل، شمع جلاؤ شمع بجھاؤ، اور ہار کی جیت۔ مدن موہن شرما کے بھی کئی ڈرامے شائع ہو چکے ہیں اور وقتاً فوقتاً سٹیج پر بھی کھیلے جاتے ہیں۔ سرینگر کے ٹیگور ہال میں انکا ایک ڈرامہ "جانور" پیش ہو چکا ہے جو معیار کے اعتبار سے بہت ہی اعلیٰ ہے۔ اس میں چابکدستی سے ظاہر کیا گیا ہے کہ انسان اپنی جنسی خواہشات کی تکمیل کے لئے کب اور کیسے جانور بنتا ہے۔ رام کمار ابرول کا لکھا ہوا ناٹک "انسان جیت گیا"۔ ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا اور اسی سال بڑے احتشام سے رنگ منچ پر بھی پیش کیا گیا۔ اسی ناٹک کار کے مزید کچھ ڈرامے کتابی صورت میں منظرِ عام پر آئے۔ وہ ہیں؛ "دھرتی اور ہم"، "چکی کے پاٹ" وغیرہ۔ جموں کے ہی دیانند کپور کا کھیل "تاج" بھی کتابی صورت میں چھپ کر منظرِ عام پر آ چکا ہے۔

جب کبھی سماجی ماحول میں یا ملکی سطح پر کوئی حیرت انگیز مسئلہ یا کوئی تشویشناک واقعہ پیش آتا ہے تو بھلے ہی سطحی ذہن کا انسان اسے لاشعوری طور پر نظر انداز کرے لیکن ڈرامہ نگار ایسے واقعات کا کسی نہ کسی صورت میں نوٹس لیتا ہے۔ تبھی اسی واقعہ کی مناسبت سے ڈرامہ تخلیق کرتا ہے۔ کسی زمانے میں جبکہ ہندی چینی

دوستی کا خوب چرچا ہوا کرتا تھا۔ لیکن اُسی چین نے ہندوستان پر اچانک حملہ کر کے ہندوستانیوں کی اعتماد شکنی کی۔ اسی حالت سے متاثر ہو کر وجے سمن سوسن نے ناٹک "انگمان" لکھا، جس میں چینی حملے کے محرکات اور اس ضمن میں ڈرامانگار کے نجی احساسات کی بہتر ڈھنگ سے عکاسی کی گئی ہے۔

جہاں تک اوپیرا کے فارم میں لکھے گئے منظوم ڈراموں کا تعلق ہے ۱۹۴۷ء سے اب تک بھلے ہی کشمیری اور ڈوگری زبانوں میں کچھ اوپیرا لکھے گئے ہوں۔ لیکن ریاست بھر کے اُردو ادب میں اوپیرا بالکل ناپید ہے۔ البتہ قیصر قلندر کی لکھی ہوئی اسی نوعیت کی ایک چیز "کائناتِ گلِ نغمہ" کے عنوان سے میری نظر سے گزری ہے۔ اگرچہ مصنّف نے اُسے اوپیرا کا نام دیا ہے۔ لیکن اس میں اوپیرا میں موجود لوازمات قطعی مفقود ہیں۔ منظوم ڈراما ہی اوپیرا کہلاتا ہے۔ اوپیرا میں ڈرامائی عناصر موجود نہ ہوں تو ایسی چیز خالص غنائیہ رہ جاتی ہے قیصر قلندر کی تخلیق اچھا خاصا غنائیہ ہے، نہ کہ اوپیرا۔ اس کے علاوہ غیر ریاستی قلم کار وامق جونپوری نے بھی یہاں اپنے عارضی قیام کے دوران ایک سماعتی اوپیرا لکھا ہے "بہاروں میں ڈل کی شام" جو کلچرل اکادمی کے معروف میگزین میں شائع ہو چکا ہے۔

ریاستی کلچرل اکادمی نے اپنی نگہداشت اور مالی کفالت سے دو ڈرامے "جھیل بلا رہی ہے" اور "ٹیپو سلطان" کے علاوہ اردو کے دو اوپیرا "ہمالہ کے چشمے" اور "پیا باج پیالہ" پروڈیوس کئے اور بیرونِ ریاست جا کر کئی شہروں میں اُن کی نمائش کی اور دادِ تحسین حاصل کی۔ اِن پچاس برسوں کے دوران ریاست بھر میں کئی سیاسی اور اقتصادی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ یہاں تک کہ فنونِ لطیفہ میں بھی

کئی تجربے کئے گئے جو کامیاب ثابت ہوئے۔ خاص طور پر ڈراما Theatre of the Absered کے سانچے میں ڈھل گیا۔ کئی ماڈرن ڈرامے لکھے گئے۔ لیکن ایسے تجربوں کی زد میں زیادہ تر کشمیری اور ڈوگری ڈرامے ہی آئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو میں سٹیج ڈرامے تخلیق کرنے والے مصنّفین کی تعداد روز بروز گھٹتی رہی۔ اگرچہ جموں خطے میں اردو ڈراما ابھی بھی زندہ ہے۔ لیکن کشمیر میں اردو ڈراما آخری سانس لے رہا ہے۔

ریاست جموں و کشمیر میں موجود کچھ اور نامور اور کہنہ مشق ڈراما نگار ہیں، جو بھلے ہی اردو زبان میں بھی طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ لیکن صرف ریڈیو اور دور درشن کے لئے ہی لکھتے ہیں۔ ایسے سرکردہ تمثیل نگاروں میں شبنم قیوم، وید راہی، راجندر پٹواری اور شوکت شہری وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ یہاں کچھ غیر کشمیری ڈراما نویس بھی طویل مدّت تک رہائش پذیر رہے۔ ان میں ڈاکٹر شکیل الرحمٰن اور آفاق احمد سرفہرست ہیں۔ البتہ دونوں صاحبان ریڈیو کے لئے ہی لکھتے رہے۔ تاہم آفاق احمد نے "دہی والی" نامی ایک سماعتی تمثیل کو سٹیج کا روپ دے کر کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔

پچھلے چھ سات برسوں کے دوران ریاست بھر میں ڈراما نگاروں کا ایک "ٹڈی دل" اُبھر آیا ہے۔ جو ریڈیو کے لئے کم ہی سہی لیکن دوردرشن کیلئے بے تحاشا الم غلم نوعیت کے ناٹک لکھنے میں مصروف ہے۔ اُن کے خیال میں سٹیج کے لئے لکھنا بلا اجرت سر کھپانا ہے اور بس۔ اس تجارتی دوڑ میں نہ اُن کو سٹیج کے لئے لکھنے کی فرصت ہے اور نہ صلاحیت۔ خاص طور پر کشمیر کی وادی میں تھیٹریکل اردو ڈرامے بالکل مفقود ہو چکے ہیں۔ راقم الحروف کی دلیل کو خودستائی سے تعبیر نہ کیا جائے

تو مجھے اعتماد سے کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ مرحوم علی محمد لون کے بعد صرف راقم الحروف ہی واحد تمثیل نگار وادی میں موجود ہے جو وقتاً فوقتاً سٹیج کے لئے بھی ڈرامے لکھتا رہا اور وہ بھی اردو زبان میں۔

ان حالات کے پیشِ نظر وادی کے تھیٹر کے لئے مستقبل میں اردو ڈراما قطعی ناپید ہوگا۔ راقم الحروف کی یہ تشویش اگرچہ باعثِ تکلیف ہی ہے۔ تاہم اس درد کا درمان ریاستی کلچرل اکادمی کے سوا کسی کے پاس نہیں۔ کلچرل اکادمی کے پاس وسائل ہیں۔ وہ چاہے تو اس جانب متوجہ ہو کر قلم کاروں کی نئی پود کو اردو سٹیج ڈرامے تخلیق کرنے پر راغب کر سکتی ہے۔ ورنہ کشمیر میں اردو ڈرامے کا خدا ہی حافظ ہے۔

ضیاء الدین*

# جموں و کشمیر میں سفر نامے کی روایت

اگرچہ ہمارے ہاں سفر نامے تحریر کرنے کی روایت دیرینہ ہے مگر اس بات کا اعتراف کرنا ہوگا کہ مغربی ممالک نے اہم اور مشہور سفر ناموں سے جس طرح کا علمی استفادہ کیا ہم ویسا نہ کر سکے۔ اس کی اہم وجہ ہمارے ملک میں بے سواد لوگوں کی بڑی تعداد ہے جن تک سفر ناموں میں مندرج تفصیلات پہنچ نہیں پاتیں۔ ہماری اور ہر قوم کی قدیم تاریخ کا ایک اہم اور ضروری سرچشمہ سفر نامے ہی رہے ہیں جن کو تاریخ نویسی کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے۔ چناں چہ ہم مانتے ہیں کہ یونان کے عظیم مورخ ہرڈ ووٹس (HERODOTUS) یا ابوریحان البرونی کا سفر نامہ "مالا الہند" یا ہیونگ سانگ کا سفر نامہ "ہند" اِن سب قدیم ممالک کی تاریخ کا بنیادی منبع اور سرچشمہ ہیں۔ اور چنانچہ آج کل ان سفر ناموں کے حوالہ جات پر کوئی اعتراض نہیں کرتا اِس لئے کہ ان میں کوئی سیاسی اغراض و مقاصد نہیں جو تاریخ کو مسخ کر دیتے ہیں۔ اس زمانے میں غیر ملکوں کا سفر علم حاصل کرنے کا اہم ترین ذریعہ ہوا کرتا تھا۔ شاید اسی لئے مُسلمانوں نے سفر کو ایک نعمت، ایک ضروری حس اور انسانی فکر میں بلندی اور وُسعت حاصل کرنے کا ذریعہ بتایا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ عرب سیاحوں نے بڑی محنت اور ایمانداری کے ساتھ اپنے سفر ناموں میں مختلف اقوام کی زندگی اور عادات و رسوم کے بارے میں اہم تفصیلات سفر ناموں کی شکل میں باقی چھوڑ دی ہیں۔ اگر ہم

* شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں۔

ابتدائی دور میں عرب مصنفوں کی اہم تاریخوں پر نظر ڈالیں تو صاف معلوم ہوگا کہ ان میں سفرناموں کے خدوخال بہت اچھی طرح ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ان میں مثال کے طور پر ابن الندیم، ابن بطوطہ، بیہقی اور ابن خلدون جیسی ہستیاں شامل ہیں جن کو تاریخ اسلام اور تاریخ اقوام کے عظیم منابع بتایا گیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ عربوں کی تاریخ اصولی طور پر ان کے سفرنامے ہی ہیں۔

یہ تو عربوں کی بات ہوئی اس لئے کہ ایک زمانے میں ساتویں صدی عیسوی تک اسلامیوں کا دور دورہ ایسا کے ایک وسیع علاقے پر رہا۔ اسلامی حکومت کے بکھرنے کے بعد جب اقوام یورپ کی نوآبادیاتی سرگرمیاں شروع ہوئیں اور وہ سمندروں کا سینہ چیر کر اطراف واکناف عالم میں پھیل گئے تو انہیں بے شمار لوگوں اور قوموں کے ساتھ ملنا جلنا پڑا جس کے نتیجے میں انہیں اپنے سفرناموں کے لئے گراں بہا مواد ہاتھ لگا۔ سترہویں صدی کے بعد یورپی سیاحوں کو دنیا بھر کے ملکوں میں سیاحت کرتے دیکھا گیا جو ایشیا، چین، جاپان، منگولیا سے لے کر افریقہ کے ملکوں تک کا احاطہ کرتے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں ہم زیادہ تفصیل میں نہ جاتے ہوئے اگر صرف ریاست جموں وکشمیر ہی کا ذکر کریں تو معلوم ہوگا کہ انیسویں صدی کے آغاز سے ہی جب کہ سلطنت انگلشیہ کا ہندوستان پر قبضہ ہوا تو کئی یورپی سیاح کشمیر کے دور دراز علاقوں میں گھومتے پھرتے رہے۔ ان میں بوگل، ولیئنے، اسٹائن، بوہلر اور مور کرافٹ جیسے لوگ شامل ہیں جنہوں نے بڑے اہم اور تفصیلی سفرنامے لکھ کر کشمیر کی تاریخ، تمدن اور معیشت کے بارے میں ذی قیمت اطلاعات باقی چھوڑ دی ہیں۔ مثال کے طور پر اسٹائن کا سفرنامہ کشمیر و ترکستان بذات خود ثقافتی تاریخ کا ایک اہم سرچشمہ ہے جس کو آج تک ہر مورخ اور ہر صحافی کام میں لاتا رہا۔

سفرناموں میں ذاتی نگارشات یعنی ڈائریاں بھی شامل ہیں جو درحقیقت چھاپنے

کی غرض سے نہیں لکھی گئی تھیں۔ لیکن ان کی بھی تاریخی اور ثقافتی اہمیت اپنی جگہ ہے بلکہ بعض اوقات بہت زیادہ ہے۔ اس ضمن میں مور کرافٹ کی ڈائری قابل ذکر ہے۔

مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے دور حکومت میں ایک نیم سرکاری وفد مرکزی ایشیا یعنی ترکستان کے سفر پر روانہ ہوا۔ اس وفد کی قیادت کشتواڑ کے ایک سرکردہ خاندان کا ایک مقتدر فرد مہتہ شیر سنگھ کر رہا تھا جو کشمیر سے چل کر براستہ قابل سمرقند اور بخارا پہنچا اور پھر واپسی پر خوقند، ختن اور کاشغر کے راستے سے ہوتا ہوا تبت اور لداخ میں چلا آیا اور واپس سرینگر پہنچا۔ اس سارے سفر میں ایک سال سے بھی زیادہ وقت لگا تھا اور واپسی پر وفد نے فارسی زبان میں اپنا سفرنامہ تحریر کر کے ڈوگرہ حکومت کو پیش کیا جس کے ایک بڑے حصے کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے اور بعض محققین نے اس کو استعمال کیا ہے۔ اسی زمانے کا ایک اور سفرنامہ عزت اللہ نے تحریر کیا تھا جس کو "سفرنامہ عزت اللہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

یہ مثالیں ہم نے اس لئے پیش کی ہیں کہ قارئین کرام سفرناموں کی تاریخی اہمیت کے عنصر کو پس پردہ نہ ڈال کر انہیں درحقیقت تاریخ کا ہی ایک حصہ خیال کریں۔

ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب کی قریب قریب تمام اصناف کے نہایت عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ یعنی شاعری، افسانہ، ناول، ڈراما، انشائیہ، خودنوشت سوانح عمری اور سفرنامے وغیرہ۔ یہاں کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے اردو زبان وادب کے پودے کو اپنی بساط کے مطابق سینچنے کی کوشش کی ہے۔ عہد بہ عہد بدلتے سیاسی اور سماجی حالات نے بھی یہاں کے ذہنوں کو متاثر کیا اور انہوں نے ہر صنف ادب میں طبع آزمائی کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ دوسری تمام اصناف کی

روایات کے ساتھ ریاست جموں وکشمیر میں سفر نامے کی روایت بھی ملتی ہے۔

ہماری ریاست میں سفر نامے کے ابتدائی نقوش ہمیں پنڈت سالگرام سالک (۱۸۵۷ء۔ ۱۹۲۹ء) کے سفر نامے "تحفہ سالک" میں ملتے ہیں۔ بقول برج پریمی "تحفہ سالک ان کا سفر نامہ ہے جس میں دوسرے ممالک کی تواریخ اور جغرافیہ کا سہارا لے کر وہاں کی ترقی کا حال لکھا گیا ہے۔ اس کتاب میں قصے کی تیکنیک کا التزام کیا گیا ہے[1]۔

ابھی تک ریاست جموں وکشمیر میں جو سفر نامے لکھے گئے ہیں ان کے نام کچھ اس طرح سے ہیں:۔

۱۔ میری پاکستان یاترا — ملک راج صراف

۲۔ پاکستان میں دو دن — اوم پرکاش صراف

۳۔ پشکن کے دیس میں — جگن ناتھ آزاد

۴۔ کولمبس کے دیس میں — جگن ناتھ آزاد

۵۔ روس کا سفر — صوفی غلام محمد
(سرینگر ٹائمز میں قسط وار چھپتا رہا)

۶۔ پاکستان کا سفر — خواجہ ثناء اللہ بٹ۔
(روزنامہ آفتاب میں قسط وار چھپتا رہا)

۷۔ پاکستان کا سفر — حامدی کاشمیری
(روزنامہ آفتاب میں قسط وار چھپتا رہا)

۸۔ پاکستان کا سفر — وجیہہ احمد اندرابی۔
(ہفتہ وار چٹان میں قسط وار چھپتا رہا)

مذکورہ بالا سفر ناموں میں صرف چار سفر نامے کتابی صورت میں منظر عام پر

[1] برج پریمی۔ جلوۂ صد رنگ ۱۹۸۹ء۔ ص۔ ۱۹۲۔

آ چکے ہیں۔ باقی ریاست کے مختلف اخبارات میں وقتاً فوقتاً چھپتے رہے۔ میں نے اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کی کہ میری ان سبھی سفرناموں تک رسائی ہو جائے لیکن افسوس کہ جو سفرنامے اخبارات میں شائع ہوئے تھے انہیں میں حاصل نہیں کر پایا لیکن اس کے برعکس جو سفرنامے کتابی صورت میں شائع ہوئے تھے انہیں بھی میں تلاش بسیار کے بعد ہی حاصل کر سکا ہوں۔ ہمارے ہاں جو سفرنامے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں ان میں پہلا سفرنامہ جیسا کہ پہلے ہی عرض کر چکا ہوں، ملک راج صراف کا، دوسرا اوم پرکاش صراف کا، دو سفرنامے پشکن کے دیس میں، اور کولمبس کے دیس میں، پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے ہیں۔ ان کے علاوہ میری نظر سے ایک انگریزی کا اور ایک ہندی کا سفرنامہ بھی گزرا ہے جو ریاست کے ادیبوں کی ہی تحریریں ہیں۔ انگریزی میں ڈاکٹر کاشی ناتھ پنڈتا نے "MY TAJIK FRIENDS" کے عنوان سے تاجکستان اور ازبکستان کا سفرنامہ تحریر کیا اور ۱۹۹۶ء میں کشمیر کے ایک اور ادیب اور تاریخ دان موتی لال ساقی نے ہندی زبان میں قزاقستان کا سفرنامہ شائع کیا۔ ان دونوں سفرناموں کی بھی کم و بیش تفصیل اس مقالے میں دی گئی ہے۔

پہلا سفرنامہ "میری پاکستان یاترا"، جموں کے ایک مشہور صحافی اور دانشور ملک راج صراف کا ہے۔ آپ ۲۰ نومبر ۱۹۷۹ء کو پاکستان گئے اور وہاں پر انہوں نے دو ہفتے قیام کیا۔ آپ پاکستان کے تین شہروں لاہور، فیصل آباد اور سیالکوٹ بھی گئے۔ صراف صاحب کے دورے کا مقصد اپنے عزیز دوستوں اور رفیقوں سے ملنا تھا اور اس مقصد کے تحت انہوں نے یہ سفر کیا۔ اس میں وہ پوری طرح کامیاب رہے۔ لکھتے ہیں: "میں محض اپنی انفرادی حیثیت میں ایک ہندوستانی ہونے کے ناطے اپنے ہمسایہ ملک پاکستان میں انسان کو دیکھنے گیا تھا اور مجھے اطمینان اور خوشی ہے کہ میرا یہ تجربہ ناکام نہیں رہا۔"[1]

---

[1] ملک راج صراف۔ میری پاکستان یاترا، ۱۹۸۰ء، ص ۳۔

وہاں کے لوگ صراف صاحب سے جس گرم جوشی، محبت، خلوص اور عقیدت سے ملے اُسے دیکھ کر اُن کی آنکھیں خیرہ رہ گئیں۔ انہیں مستحکم یقین ہونے لگا کہ انسانیت ابھی زندہ ہے۔ تقسیم وطن کے دوران جس طرح مسلمانوں کو ہندوستان چھوڑ کر پاکستان جانا پڑا اس سانحے نے لوگوں کے درمیان ایک غلط فہمی کی دیوار کھڑی کردی تھی اور یہاں کے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ پاکستان کے عوام متعصب اور تنگ نظر ہیں، لیکن اس سفرنامے کو پڑھتے ہوئے ایک بڑی فہمی دور ہو جاتی ہے۔ وہ لوگ نہ متعصب ہیں نہ تنگ نظر بلکہ انتہائی پرخلوص اور مہمان نواز ہیں۔ ملک راج صراف نے وہاں کے لوگوں کی مہمان نوازی، اپنائیت اور خلوص کو سراہا ہے۔ اپنے پندرہ روزہ قیام پاکستان کے دوران ایک لمحے کے لئے بھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ میں کسی غیر ملک یا اجنبی مقام پر آیا ہوں۔

صراف صاحب نے ایک صحافی کی نظر سے پاکستان کے سیاسی اور سماجی حالات کا جائزہ لیا ہے اور وہاں کے مختلف بازاروں، تاریخی مقامات، مندروں اور گردواروں کا ذکر بھی کیا ہے۔ پاکستان میں ہو رہی ترقی اور تعمیری کاموں کے ساتھ ساتھ روزمرہ زندگی کا حال بیان کیا ہے۔ یہاں تک کہ وہاں کی چھوٹی چھوٹی باتوں مثلاً کھانے پینے کی اشیاء تک کو نظرانداز نہیں کیا۔ اس سفرنامے میں ملک راج صراف نے وہاں کی زندگی کے ہر پہلو کو بڑے خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے اور پاکستانیوں کی مہمان نوازی کی خاص تعریف کی ہے۔

پاکستان کے دیہاتی بھائیوں سے بات چیت کرتے ہوئے انہیں اندازہ ہوا کہ وہ سیاسی طور پر ہندوستانی بھائیوں سے کافی پیچھے ہیں۔ ہندوستانی دیہاتیوں میں انہیں سیاسی بیداری کے آثار نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے سیاسی سرگرمیوں، اخبارات، رسائل وجرائد کی کتابت اور چھپائی کے انتظامات کا جائزہ بھی لیا ہے۔

لیکن سب سے اہم بات جس کا ذکر صراف صاحب نے اپنے سفر کی روداد میں بار بار کیا ہے وہ ہے وہاں کے لوگوں کا بے پناہ خلوص اور اپنائیت کا جذبہ خاص کر جموں کے مہاجرین کا پرتپاک خیر مقدم۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے انہیں مدعو کیا، انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا۔ گلے مل کر روئے اور آپ کے ڈوگرہ طرز کے لباس کو دیکھ کر جموں کی یاد تازہ کی۔ ڈوگری میں بات چیت ہونے لگی اور ڈوگری نظمیں پڑھی جانے لگیں۔ اس سفر نامے کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشیدگی کی لکیر نقلی ہے۔ دونوں ملکوں کے عوام اب بھی ایک دوسرے کو ویسے ہی چاہتے ہیں جیسے تقسیم سے پہلے۔ مہاجرین جموں کے مابین ملاقات کا جذبہ یکساں طور پر مضطرب و بے قرار کر دینے والا تھا۔ اور وطنی محبت کے لئے دونوں جگہوں کے عوام کے دل یکساں طور پر دھڑکتے ہیں۔ اس سفر نامے میں صراف صاحب نے اپنے اعزاز میں پاکستان میں بسنے والے جموں کے بھائیوں کی طرف سے منعقد کی ہوئی نشست میں پڑھی چند نظموں اور مضامین کو بھی پیش کیا ہے۔ اس میں جموں کی یاد ــــ "اشکِ رواں کی نہر ہے اور ہم ہیں دوستو"۔ کے عنوان سے محبت اور عقیدت کا بے پناہ جذبہ سامنے آتا ہے۔ اگر ہندوستان اور پاکستان کے عوام کا ایک دوسرے کے تئیں خلوص اور ہمدردی کی جھلک دیکھنا مقصود ہو تو اس کا مطالعہ کرنا لازمی ہے۔ اس سفر نامے میں جذبات کا ایک طوفان ہے۔ اُن لوگوں کو، جو جموں چھوڑ کر پاکستان جانے پر مجبور ہو گئے تھے اب بھی جموں کی یاد ستاتی ہے۔ وہ جموں کی گلیوں، بازاروں اور روایات کو ابھی تک نہیں بھول پائے ہیں۔ ان لوگوں کو اب بھی یقین ہے کہ ہم ایک روز ضرور اپنے وطن واپس جائیں گے۔

اس سفر نامے کو پڑھنے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسانیت

ناقابل تقسیم ہے اور عوام خواہ کسی جگہ کے رہنے والے ہوں طبعاً معصوم اور روادار ہوتے ہیں۔ یہ سیاست ہی ہے جو کبھی رنگ و نسل اور کبھی مذہب کے نام پر ان کا استحصال کرتی ہے جس کا خمیازہ نسلوں کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ ملک راج صراف نے اس سفرنامے میں حب وطن کے جذبے کو اس طرح بیان کیا ہے کہ لطیف جذبۂ انسانیت سبھی نفاستوں کے ساتھ ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔

دوسرا سفرنامہ بہ عنوان "پاکستان میں دو دن" اوم پرکاش صراف کا ہے یہ سفرنامہ سیاسی نوعیت کا ہے۔ تقسیم وطن کے بعد پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جموں و کشمیر کا مسئلہ تنازعے کا باعث بنا۔ بقول اوم پرکاش صراف "مہاراجہ ہری سنگھ جموں و کشمیر کو آزاد رکھنا چاہتے تھے مگر بڑے پڑوسیوں کی خوشنودی کے بغیر آزادی کا خواب زیادہ اور حقیقت کم معلوم ہوتی ہے۔"[1] چنانچہ ریاست دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ کشمیر کی بھاگ ڈور شیخ محمد عبداللہ نے سنبھالی لیکن کئی وجوہات کی بنا پر انہیں ۱۹۵۳ء میں نظر بند کر دیا گیا۔ دس گیارہ برس کی قید کے بعد ۸ اپریل ۱۹۶۴ء کو خواجہ غلام محمد صادق کے دور حکومت میں انہیں رہا کیا گیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے انہیں بات چیت کے لئے بلایا اور انہیں یہ مشورہ دیا کہ دونوں ملکوں کے عوام کو ذہنی طور پر نزدیک لائیں چنانچہ شیخ صاحب نے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بڑھتی ہوئی کشیدگی ختم کرنے کے لئے پاکستان کا دورہ کیا۔ اوم پرکاش صراف بھی بطور صحافی اُن کے ہمراہ تھے۔ انہوں نے اپنے سفر کی روداد کو بڑے دل چسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ سفرنامہ سیاسی نوعیت کا ہونے کے باوجود اور پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ مثلاً اسے پڑھتے ہوئے

---

[1] اوم پرکاش صراف۔ "پاکستان میں دو دن" مرتب: ملک راج صراف۔ انسانیت ابھی زندہ ہے۔ ۱۹۸۲ء۔ ص۔ ۸۶۔

ملک کی تقسیم کا المیہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ کیونکہ وہاں انہیں کئی مہاجرین جموں سے ملنے کا اتفاق ہوا جو بے شک وہاں روزمرہ زندگی میں مصروف ہیں لیکن جن کی روح اپنے وطن میں رہ گئی ہے۔ انہوں نے اس جذباتی پہلو کو ابھارا ہے۔ بطور صحافی انہوں نے پاکستان کی روزمرہ زندگی کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کیں، جیسے تحصیل عمر کوٹ میں ستر فی صدی آبادی غیر مسلم ہے، عمر کوٹ میونسپلٹی کے چیئرمین بھی ایک ہندو ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے وہاں کے اخبارات کا جائزہ بھی لیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"راولپنڈی میں اردو روزناموں کی صوری اور معنوی خوبیوں نے مجھے خاص طور سے متاثر کیا۔ دلی کے اردو اخبارات بلکہ وسیع تر حلقہ اشاعت رکھنے والے ہندی روزنامے بھی پاکستان کے اردو پریس سے کہیں پیچھے ہیں۔"[1] اس کے علاوہ صراف نے وہاں پر شیخ صاحب کے پرتپاک استقبال کا بھی ذکر کیا ہے اور اس طرح کئی سیاسی اور تاریخی حقیقتیں سامنے آتی ہیں۔ مثلاً پریس کانفرنس میں شیخ صاحب نے اعلان کیا کہ وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور صدر ایوب عنقریب ملاقات کریں گے۔ اس تاریخی اعلان کے بارہ گھنٹے بعد پنڈت جواہر لال نہرو انتقال کر گئے چنانچہ شیخ صاحب کو اپنا سیاسی دورہ ادھورا چھوڑ کر واپس آنا پڑا۔

مختصر یہ کہ اس سفرنامے کو پڑھتے ہوئے یہ تاثر ملتا ہے کہ اگر اچانک پنڈت نہرو کی موت واقع نہ ہوئی ہوتی تو یہ دورہ کامیاب رہتا اور دونوں ملکوں کے درمیان مسئلہ کشمیر کے حوالے سے جو کشیدگی اب ملتی ہے، شاید وہ باقی نہ رہتی۔

---

[1] اوم پرکاش صراف۔ پاکستان میں دو دن۔ مرتبہ، ملک راج صراف۔ "انسانیت ابھی زندہ ہے"، ۱۹۸۲ء، ص ۹۰۔

سفر نامہ لکھنے والوں میں تیسرا اور سب سے اہم نام پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا ہے۔ انہوں نے جموں میں بیٹھ کر جو کام کیا ہے اس سے نہ صرف ہمارے بیش بہا ادبی خزانے میں اضافہ ہوا ہے بلکہ عالمی سطح پر جموں کا نام بھی روشن ہوا ہے۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو اکثر و بیشتر بین الاقوامی سیمیناروں میں شرکت کرنے، توسیعی خطبات دینے اور مشاعروں میں شرکت کرنے کے لئے کسی نہ کسی ملک کا سفر کرنا پڑتا ہے۔ انہیں مختلف ممالک کی سیر و سیاحت سے جو تجربات و مشاہدات حاصل ہوتے ہیں انہوں نے انہیں سفر ناموں کی شکل میں قلمبند کیا ہے اور یہ سفر نامے جہاں ہمارے ادبی خزانے میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں وہیں آنے والی نسلوں کے لئے معلومات کا خزانہ بھی ہیں اور بصیرت کی شمع بھی روشن کرتے ہیں۔ ان کے تین سفر نامے ابھی تک کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا سفر نامہ "جنوبی ہند میں دو ہفتے" دوسرا "پشکن کے دیس میں" اور تیسرا "کولمبس کے دیس میں"۔ اس کے علاوہ ان کے نامکمل سفر ناموں کے بعض حصے جرائد میں چھپ چکے ہیں۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد اس صنف سے گہرا شغف رکھتے ہیں اور ان سفر ناموں کو پڑھتے ہوئے کہیں بھی کوئی کمی نظر نہیں آتی بلکہ ان میں کہیں کہیں ڈائری اور ٹیبل ٹاک کا انداز بھی ملتا ہے جس سے یہ سفر نامے مزید جاندار لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے مناظر فطرت کی عکاسی اور اکثر موضوعات کے تقابلی مطالعے سے مزید لطف پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں اپنے اس مقالے میں ان کے ان سفر ناموں کا ذکر کروں گا جو انہوں نے جموں میں بیٹھ کر لکھے اور ہمارے سامنے کتابی صورت میں آ چکے ہیں۔

● پشکن کے دیس میں — آزاد صاحب کا وہ سفر نامہ ہے جس میں انہوں نے روس کے سفر کی روداد لکھی ہے۔ یہ سفر انہوں نے ۳ ستمبر ۱۹۸۰ء میں کیا۔ یہ کل اکیس دن کا سفر تھا۔ لیکن اس مختصر سے سفر میں انہوں نے روس میں جو کچھ دیکھا بلا کم و کاست

بیان کر دیا ہے۔ خصوصاً روس میں علمی اور ادبی سرگرمیوں کا جائزہ بھرپور انداز میں لیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"علم و فن کی قدر کا ایک بہت اونچا معیار مجھے اس ملک میں دیکھنے کو ملا ۔ بازاروں میں خریداروں کے لمبے لمبے "کیو" یہاں آلو، پیاز اور مٹی کے تیل کی دکانوں پر نظر نہ آئے بلکہ کتابوں کی دکانوں پر نظر آئے۔ یہاں وہ بھوک اور پیاس نہیں ہے جو مشرق کے اکثر ملکوں کا مقدر بن چکی ہے، بلکہ علم کی تشنگی ہے، کتابوں کی پیاس ہے اور کتابیں لاکھوں کی تعداد میں چھپتے ہی فوراً اپنے عشاق کے ہاتھوں میں پہنچ جاتی ہیں۔"[1]

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبان اور ادب کے ایک استاد اور دانشور نے وہاں کی تاریخ، سیاست اور صنعت و حرفت سے متعلق لکھنے کے بجائے وہاں کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا جائزہ لیا ہے اور ہماری معلومات میں کئی طرح سے اضافہ کیا۔ مثلاً سوویت یونین میں ہر سال ایک لاکھ نئی کتابیں چھپتی ہیں اور یہ کتابیں دیگر ممالک کی تقریباً ایک سو پینتالیس زبانوں میں چھاپی جاتی ہیں۔ یہاں کے مستند اور بلند پایہ مصنفین کی حیثیت اور مرتبے کو دیکھتے ہوئے جگن ناتھ آزاد کو اپنے ملک کے بلند پایہ شاعر اور ادیب اقبال اور پریم چند یاد آگئے، لکھتے ہیں:

" علامہ اقبال کے پائے کا شاعر روس میں پیدا ہوتا تو یہ ممکن نہیں تھا کہ عمر کے آخری حصے میں کسی قدر دان والی ریاست کی طرف سے پانچ سو روپے ماہانہ کی اسے ضرورت ہوتی۔ یا پریم چند کے پائے کا ادیب روس میں ہوتا تو اس صورت حال کا تصور ہی غیر ممکن تھا جس افلاس زدہ

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ پشکن کے دیس میں۔ ۱۹۸۶ء۔ ص ۱۰۔

صورت حال میں یہ عظیم فن کار اس دنیا سے رخصت ہوا۔" [1]

اس کے علاوہ انہوں نے روس میں اردو زبان کی مقبولیت، ہندوستان کے بلند پایہ شاعروں اور ادیبوں کی شہرت، یہاں کے ادیبوں کی تخلیقات کے روسی تراجم، روس میں قانون کی بالادستی، سوویت ہند دوستی، احساسِ فرض اور محنت کا وقار اور وہاں کے طرزِ حیات کے متعدد پہلوؤں کا جائزہ بھرپور انداز میں لیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے خیالات اور نظریات کا اظہار بھی کیا ہے۔ وہ مختلف شہروں دوشنبہ، تاجکستان، لٹویا، ماسکو اور لینن گراڈ، جہاں بھی گئے وہاں کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا انہوں نے جائزہ لیا ہے اور ساتھ ہی انہوں نے وہاں کے فطری نظاروں کو بھی سراہا ہے۔ انہیں وہاں کا موسم اور مناظر وادیٔ کشمیر کی یاد دلا رہے تھے۔

"پشکن کے دیس میں" بے شک ایک سفرنامہ ہے اور سفرنامے میں عموماً خارجی اور معروضی صفات کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے لیکن اس سفرنامے کی سب سے اہم خصوصیت اس کا تخلیقی انداز ہے۔ فن کار کی اپنی ذات اور اس کا تخلیقی عمل جابجا کارفرما ہے۔

یہ سفرنامہ اپنی ایک تاریخی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ بے شک آج روس ایک عظیم طاقت کے طور پر دنیا کے نقشے پر نہیں رہا لیکن "پشکن کے دیس میں" وہ ایک عظیم ملک کے طور پر ہمیشہ قائم و دائم رہے گا اور جب آنے والی نسلیں روس کی تاریخ لکھیں گی اور متحدہ روس کے بارے میں جاننا چاہیں گی تو ان کے لئے یہ کتاب خاصی اہم ہوگی۔

● — کولمبس کے دیس میں — جگن ناتھ آزاد کا دوسرا اہم سفرنامہ ہے۔ آپ

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ "پشکن کے دیس میں"۔ ۱۹۸۶ء۔ ص ۱۰۱۔

چودہ اگست ۱۹۸۱ء کو ایسٹ ویسٹ شکاگو یونیورسٹی کے چانسلر وصی اللہ خان کے دعوت نامے پر ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے امریکہ گئے۔ آپ کے اس سفر میں اُن کی خاص توجہ کا مرکز وہاں کی یونیورسٹیاں رہیں۔ روس کے سفر کی طرح اس سفر میں بھی انہوں نے امریکہ میں علمی و ادبی سرگرمیوں کا جائزہ بھرپور انداز میں لیا ہے اور وہاں مختلف شہروں میں اُن کی ملاقاتیں بڑے بڑے شاعروں، دانشوروں اور عالموں سے رہیں۔ چنانچہ اُن کی بات چیت کا موضوع شعر و ادب ہی تھا۔ یہ سفر نامہ ادبی اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے تاریخی، سیاسی اور سماجی موضوعات پر لکھنے کے بجائے زیادہ تر وہاں کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا جائزہ لیا ہے۔ ان کے اس سفرنامے سے امریکہ میں اردو کی صورت حال اور اقبال کی شہرت اور مقبولیت کا پتہ چلتا ہے۔ امریکہ کی بائیس تئیس یونیورسٹیوں سے باہر بھی کئی انجمنیں قائم ہیں جو اردو کے فروغ کے لئے کام کر رہی ہیں۔

ادبی جلسوں اور مشاعروں کی بدولت امریکہ میں اردو ادب کافی فروغ پا رہا ہے۔ اقبال سے متعلق لکھتے ہیں۔ "امریکہ کی متعدد یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور طلبہ اور یونیورسٹیوں سے باہر علم و ادب سے ذوق رکھنے والے دانشور حضرات اور بالخصوص نئی نسل کے لوگ اقبال کے متعلق زیادہ سے زیادہ جاننے کے آرزومند ہیں اور ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کی اقبال کے نام پر قائم کی ہوئی انجمنیں ہیں جو اس سلسلے میں کام کر رہی ہیں۔ اقبال کے متعلق جاننے کی تشنگی باہر کے ملکوں میں کس قدر زیادہ ہے اس کا اظہار لفظوں میں ممکن نہیں۔ جگن ناتھ آزاد نے امریکہ اور کینیڈا کی تین یونیورسٹیوں میں اقبال کے فکر و فن سے متعلق لیکچر بھی دیئے۔

اس سفر نامے کو پڑھتے ہوئے قاری پر ایک ماورائی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور وہ بھی اُن کے ساتھ اس سفر میں شریک ہو جاتا ہے۔ اس سفر نامے کو پڑھتے ہوتے

مسرت کے ساتھ ساتھ بصیرت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ امریکہ میں جن چیزوں سے وہ متاثر ہوئے اُس کا ذکر بھی جابجا ملتا ہے۔ سائینس اور ٹیکنالوجی کے کارناموں کے ساتھ ساتھ وہاں کے عجائب خانوں نے بھی انہیں متاثر کیا۔ لکھتے ہیں:-

"یہاں ایک اور دنیا بھی آباد ہے اور وہ ہے عجائب خانوں کی دنیا اور یہ دنیا پرانی تاریخ اور تہذیب و تمدن کے ساتھ اس نئی دنیا سے وابستگی اور دل بستگی کا ایک خوبصورت اظہار ہے۔"[1]

اس کے علاوہ وہاں کے مناظر فطرت جنگل، دریا اور جھیلوں نے بھی انہیں متاثر کیا۔ آپ نے سفر امریکہ کی روداد کے ساتھ ساتھ ہمیں کنیڈا اور برطانیہ کے سفر کی جھلک بھی دکھائی ہے۔ اس سفر کا آغاز و اختتام جموں ہے۔ آپ نے زیادہ تر ملکی اور غیر ملکی سفر جموں سے ہی کئے ہیں اس لئے وہ اپنی پُر وقار شخصیت کے ساتھ جہاں بھی جاتے ہیں اپنی ریاست اور اپنی یونیورسٹی کا نام ساتھ لے جاتے ہیں جس سے باہر کے ملکوں میں علمی اور ادبی حوالے سے ریاست جموں و کشمیر کا نام بھی روشن ہوتا ہے۔

جگن ناتھ آزاد نے اپنے سفر کے تجربات کو نہ صرف اپنے تخلیقی عمل کا حصہ بنایا ہے بلکہ اس تجربے کو تخلیقات کی صورت دے کر آئندہ نسلوں کے لئے بصیرت اور آگاہی کا سامان بھی فراہم کیا ہے۔ اس سے اُن کی ذاتی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے جس سے ہم اُن کی شخصیت اور فکر و فن کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ ٹی ایس ایلیٹ نے یہ بات بالکل صحیح کہی ہے کہ ادیب بعض اوقات اپنے زمانے کے بارے میں لکھتے ہوئے اپنی ذات کے بارے میں بھی لکھ جاتا ہے۔ ان سفرناموں میں زمانی واقعات، عصری تاثرات، سیاسی اور سماجی علمی اور فکری تغیرات بھی سامنے آتے ہیں، اور

[1] جگن ناتھ آزاد۔ کولمبس کے دیس میں۔ ۱۹۸۶ء۔ ص ۳۷۔

ایک شاعر، ادیب اور مفکر کی شخصیت کے مخفی پہلو بھی روشن ہوتے ہیں، یہ سفر نامے ادب میں ایک دائمی شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سال ۱۹۸۲ء میں کشمیر یونیورسٹی میں سینٹرل ایشین سٹیڈیز کے سابق ڈائریکٹر ڈاکٹر کاشی ناتھ پنڈتا نے مرکزی ایشیا کا اپنا سفر نامہ انگریزی زبان میں "MY TAJIK FRIENDS" کے نام سے چھپوایا، ڈاکٹر صاحب تاجیک اکادمی کی دعوت پر ایک مہینہ تک وسط ایشیا کی ریاستوں میں سیر و سیاحت کرتے رہے، مگر اس سفر نامے کا بیشتر حصہ تاجکستان سے ہی مربوط رہا ہے۔

ایک سو بیس صفحات پر مشتمل یہ سفر نامہ درحقیقت وسطی ایشیا کی سماجی اور ثقافتی زندگی کی عکاسی کرتا ہے جو دورِ معاصر سے متعلق ہے اگرچہ صاحبِ سفر نامہ اس زمانے میں وسطی ایشیا کا دورہ کر چکا ہے جس وقت سوویت یونین کی عملداری اپنے عروج پر تھی تاہم سیاسی نظریات اور رجحانات سے بالاتر ہو کر یہ سفر نامہ وسط ایشیا کے لوگوں کے معاشرے، ان کی طرز زندگی اور اُن کے ثقافتی ورثے پر بڑی گہری اور سود مند نظر ڈالتا ہے سفر نامے کا مطالعہ ہمیں وسط ایشیا کی تاریخ، تمدن، ادب، سماج اور آرٹ گویا زندگی کے ہر شعبے سے چلتے چلتے آشنا کرتا ہے۔

سوویت حکومت کے دوران وسط ایشیا تک عام انسان کی رسائی بے حد مشکل ہوا کرتی تھی۔ اس لئے ایک عام تصور یہ بن چکا تھا کہ اس خطہ میں پسماندگی اور جبر و استبداد کا دور دورہ ہے۔ اس میں کچھ غرض مند حلقوں کا پروپگنڈا بھی شامل تھا۔ چونکہ ڈاکٹر پنڈتا کو تاجک اور فارسی زبان پر کافی دسترس حاصل ہے اور وہ ان زبانوں کو مادری زبان کی طرح بڑی صراحت سے بول سکتے ہیں اس لئے انہیں وسط ایشیا میں لوگوں سے ملنے جلنے اور اُن کے ساتھ تبادلۂ خیال کرنے میں بڑی سہولت رہی ہے۔ اسی حوالے سے وہ دورِ معاصر کی صحیح تصویر پیش کرنے میں بڑی

حد تک کامیاب رہے ہیں - ان کے زیر نظر سفر نامے کی یہ ایک اہم خصوصیت مانی جائے گی۔

جس طرح پاکستان کے سفر نامے تحریر کرنے والوں نے اکثر ہند و پاکستان کے لوگوں کے درمیان مخلصانہ جذبات کی بات کہی ہے اسی طرح وسط ایشیا کے اس سفر نامے میں ہندوستان اور وسطی ایشیا کے درمیان قدیم تاریخی اور ثقافتی روابط کی طرف بار بار اشارہ ہوا ہے۔ اس طرح کے سفر نامے ملکوں اور قوموں کے درمیان بہتر دوستانہ تعلقات بنانے میں بہت حد تک ممد اور معاون ہو سکتے ہیں۔

ڈاکٹر پنڈتا کا سفر نامہ انگریزی سے روسی زبان میں تاجک اکادمی برائے علوم کے اہتمام سے دوشنبہ میں سال ۱۹۸۶ء میں چھپا۔ اس سفر نامے کے لئے انہیں ۱۹۸۷ء میں سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ بھی ملا جو ادب اور ثقافت کی خدمات انجام دینے کے سلسلے میں روس اور ہندوستان کے ثقافتی اداروں نے مشترک طور پر دائر کیا ہے اس سفر نامے کی وجہ سے ڈاکٹر پنڈتا کو تاجکستان کے علمی اور ادبی حلقوں میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ہے، چنانچہ اس کے بعد انہیں لگ بھگ ہر سال تاجک اکادمی کسی نہ کسی سیمینار یا کانفرنس میں شمولیت کی دعوت دیتی رہی جو تاجکیوں کی تاریخ اور ثقافت سے تعلق رکھتے ہوں۔ اسی سال یعنی ۱۹۹۰ء میں تاجکستان کی نیم سرکاری ثقافتی تنظیم بنام "پیوند" نے ڈاکٹر پنڈتا کو اپنی تنظیم کی تاحیات اعزازی رکنیت سے نوازا ہے جو درحقیقت ہند تاجکستان ثقافتی رشتوں کو مضبوط کرنے کی خدمات کا شایان شان اعتراف ہے۔

حال ہی میں ریاست کے ایک جانے پہچانے ادیب، شاعر اور قلم کار جناب موتی لال ساقی کا ایک چھوٹا سا قزاخستان کا سفر نامہ چھپا ہے۔ یہ ہندی زبان میں ہے۔ ساقی صاحب ایک ثقافتی وفد کے ہمراہ قزاخستان کے پندرہ روزہ سفر پر سال

۱۹۹۷ء میں گئے تھے، ساقی صاحب پہلی بار وسط ایشیا کے سفر پر گئے۔ اس لئے انہیں سوویت دورِ حکومت کے وسطی ایشیا کے بارے میں ذاتی اور عملی علم نہ تھا اب جب کہ قزاخستان باقی وسطی ریاستوں کی طرح ایک آزاد ملک ہے، وہ بھی اُن بے شمار مسائل سے دوچار ہے جن سے سوویت حکومت کے ٹوٹ جانے کے بعد پورا سابقہ سوویت یونین دوچار ہوا۔ بہرحال چونکہ قزاخستان قدرتی وسائل سے سرشار ہے اس لئے وہاں باقی ریاستوں کی نسبت تعمیری اور ترقیات کے کام بڑے شدومد سے شروع کئے گئے ہیں۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ سوویت دورِ حکومت میں جس طرح کا بنیادی ڈھانچہ یعنی INFRASTRUCTURE بنایا گیا تھا وہ ظاہر کرتا ہے کہ ان ریاستوں میں صنعت کو کم عرصہ میں بھاری فروغ ملا تھا جو اور بھی پیش رفت کر سکتا تھا۔ ساقی صاحب کا سفر نامہ اس وقت تک کسی ریاستی باشندے کا تازہ ترین سفر نامہ شمار ہو سکتا ہے۔

ان سفر ناموں کا جائزہ لینے کے بعد اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ریاست میں یہ صنف اپنی کم سنی کے باوجود ہیتی، موضوعاتی اور تکنیکی سطح پر اعلیٰ روایات قائم کر چکی ہے اور یہ سفر نامے ملکی اور بین الاقوامی سفر ناموں کے مقابلے میں رکھے جا سکتے ہیں۔

نور شاہ *

# ۱۹۴۷ء کے بعد کی بعض یادگار ادبی محفلیں

ادبی محفلیں اور مشاعرے برس ہا برس سے برصغیر کی تہذیبی اور تمدنی روایات کا ایک حصہ رہے ہیں۔ مشاعروں کی روایت اگرچہ اب بھی باقی ہے تاہم اِن کی نوعیت اب ادبی سے زیادہ کاروباری ہو گئی ہے۔ ملک اور ملک سے باہر بالخصوص عرب امارات میں آئے دن مشاعرے منعقد کرائے جاتے ہیں اور بھارت اور پاکستان کے شعرا ان میں پابندی سے شریک ہوتے ہیں۔ ادبی محفلوں کا انعقاد اب قریب قریب متروک ہے، اس کی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں، ایک تو یہ کہ اب ادب میں اجتماعیت سے زیادہ انفرادیت پر زور ہے۔ ادب ایک طرح سے انفرادیت پسندانہ ہو گیا ہے۔ ادبی محفلیں نہ جمنے کی ایک وجہ آج کی دوڑتی جاگتی زندگی بھی ہے۔ انسان کی عدیم الفرصتی ہے، اب چونکہ ذرائع ابلاغ کا دائرہ بھی خاصا وسیع ہو گیا ہے، اس لئے بھی اِن محفلوں کی ضرورت غالباً باقی نہ رہی، جب سماجی زندگی کا شیرازہ ہی بکھر رہا ہو تو محفلیں کہاں اور کیسے منعقد ہوں گی۔ بہرصورت ملک دوسرے حصوں کی طرح ریاست کے اس حصے میں بھی ادبی محفلوں کی ایک اپنی روایت رہی ہے۔ اس کا

* مسکن، لل دید کالونی، گوری پورہ لنک روڈ راول پورہ۔ سرینگر۔ ۱۹۰۰۰۵

سلسلہ اصل میں تب سے چل پڑا تھا جب لوگ خاص طور سے ہمارے بزرگ کسی ایک گھر میں یکجا ہوکر صوفیانہ موسیقی کی محفلیں آراستہ کیا کرتے تھے اور ان سے حظ اٹھاتے تھے۔ شعر و ادب کو فروغ ملنے لگا اور لوگوں کا ادبی ذوق پروان چڑھا تو ادبی محفلوں کی داغ بیل بھی پڑ گئی ——!!

وادی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ۱۹۴۶ء میں رکھی گئی لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد بھی کچھ عرصہ اسی نام سے کام کرتی رہی اس میں کم و بیش اس وقت کے سارے ادیب اور شاعر شامل ہوئے تھے۔ اس انجمن کی کارکردگیوں میں ایک اہم سرگرمی ہفتہ وار محفلوں کا انعقاد تھا جو جمعہ کو منعقد ہوا کرتی تھیں، ایک جگہ یکجا ہوکر چھوٹے بڑے سبھی ادیب اور شاعر اپنی تخلیقات پیش کیا کرتے، ان پر جوش و خروش کے ساتھ اور بڑی دیانت داری سے بحث ہوا کرتی تھی۔ یہ سنجیدہ مگر پر خلوص محفلیں علی محمد لون، حبیب کامران، سوم ناتھ زتشی، شوریدہ کاشمیری، صلاح الدین احمد، اختر محی الدین، دیپک کول، مہندر رینہ، ایش کول، نور محمد روشن، امین کامل، رحمان راہی، پران کشور اور دوسرے قلم کاروں کو آگے بڑھانے اور انہیں ایک مقام دلوانے میں خاصی معاون ثابت ہوئیں۔ اس سے پہلے بھی حلقۂ ارباب ذوق اور دیگر ادبی محفلوں میں وادی کے قلم کار برابر حصہ لیتے رہے تھے۔ اس ضمن میں راما نند ساگر، پروفیسر نندلال طالب، پریم ناتھ پردیسی، پروفیسر پشپ، رنجور کاشمیری، پروفیسر حاجنی، کنول نین پرواز، شہ روز کاشمیری، غ۔ م۔ طاؤس، میر غلام رسول نازکی، صوفی محی الدین، دینا ناتھ نادم، مرزا غلام حسن بیگ، پریم ناتھ در، عبدالحق برق، مکھن لعل محو اور قیصر قلندر کے نام فوراً ہی ذہن میں آتے ہیں۔ مقامی سطح پر انجمن ترقی پسند مصنفین کی اکثر محفلوں میں پروفیسر محمود ہاشمی، بلراج ماہنی، راما نند ساگر، میر غلام رسول نازکی، پریم ناتھ پردیسی اور پریم ناتھ در شریک ہوا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک

دلچسپ بات یہ ہے کہ نومشق اور نوجواں لکھنے والوں کے تئیں معروف قلم کاروں کا رویہ نہایت ہی دوستانہ، ہمدردانہ اور رہبرانہ تھا۔ وادی میں ترقی پسند تحریک کو ایک نیا موڑ دینے اور ترویج و ترقی سے ہمکنار کرانے میں اِن کہنہ مشق ادیبوں کو یقیناً پیش روؤں کی حیثیت ہے۔ کوئی مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ وادی میں ایک متحرک اور جاندار ادبی فضا کو پروان چڑھانے میں اِن ادیبوں، شاعروں اور ناقدوں نے ایک تاریخی رول ادا کیا ہے۔ یہ ان ہی حضرات اور ان ہی قدم ملانے والے دوسرے نوآموز ادیبوں اور شاعروں کی ان تھک محنت اور لگن کا نتیجہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد کشمیر میں اُردو اور کشمیری کو ایک مسلّمہ ادبی اور فنی زبان کا مرتبہ ملا۔ وادی میں ترقی پسند ادبا کے اس رول رول کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا جو انہوں نے ایک ادبی تحریک کو منظم کرنے کے سلسلے میں ادا کیا ہے۔ نئی پود کے ہمارے ادیب شاعر اور ناقد جو ملک بھر میں آج اپنا ایک مقام رکھتے ہیں، اسی ادبی تحریک سے براہ راست متاثر ہوئے ہیں اور کارواں بنتا گیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین کے بہت سارے اراکین شعر و ادب اور دوسرے فنوں کی مختلف اکائیوں میں تقسیم ہو گئے اور اس طرح انجمن کی کارکردگی کا اثر کم ہوتا گیا۔

۱۹۴۷ء کے بعد وادی کشمیر میں ایک تمدنی محاذ، ایک کلچرل فرنٹ کی بنیاد رکھی گئی۔ اس پلیٹ فارم پر جو حضرات یکجا ہوئے وہ قریب قریب وہی ترقی پسند ادیب اور شاعر تھے یہ وہ زمانہ تھا جب برصغیر تقسیم ہو چکا تھا ہر طرف افراتفری تھی، خوف و ہراس کا عالم تھا اس پسِ منظر میں کلچرل فرنٹ کا قیام ریاست کی ادبی، تہذیبی اور تمدنی تحریک میں ایک سنہری باب کا درجہ رکھتا ہے۔ اس محاذ سے منسلک ادیبوں، شاعروں، ڈرامہ نگاروں، مصوّروں اور دوسرے فنکاروں

نے جو شاندار اور قابل تحسین کام کیا اس کو کشمیر کی تہذیبی تاریخ کبھی نہیں بھلا سکتی۔ وادی میں ایک مرتبہ پھر مختلف فنون سے وابستہ فنکار ایک جگہ جمع ہو گئے۔ محاذ کی ان ہی سرگرمیوں کے دوران کشمیری زبان کے بہت سے ادیب اور شاعر سامنے آئے یہی وہ فن کار ہیں جنہوں نے آنے والے دنوں میں اپنے لئے نام بھی پیدا کیا اور مقام بھی، یہ سب اسی تحریک کی پیداوار ہیں۔ امین کامل، نور محمد روشن، غلام نبی فراق، رحمان راہی، گھنشام سیٹھی، سوم ناتھ زتشی، امیش کول، علی محمد لون، دیپک کول، پشکر بھان، مہندر رینہ اور غلام رسول سنتوش وغیرہ اسی دور سے وابستہ ہیں۔ کچھ عرصہ بعد کلچرل فرنٹ کا شیرازہ بکھر گیا اس کے بعد کلچرل کانفرنس وجود میں آئی۔ ادھر ریڈیو کشمیر کے قیام سے ادیبوں اور شاعروں کو ایک زیادہ بہتر فورم مل گیا۔ ریڈیو کشمیر کی توسط سے بعض کل ہند مشاعروں کا اہتمام کیا گیا اور ان مشاعروں میں مجاز، جذبی، جگر، فراق، راہی معصوم رضا، ساحر ایسے شعرا کو اکٹھا کرنا ریڈیو کشمیر کا ایک کارنامہ ہے، ان مشاعروں میں اہلِ ذوق جوق در جوق شامل ہوئے اور ادبی محفلوں کا سماں بندھ جاتا تھا۔

۱۹۵۳ء اور اس کے بعد ادبی افق پر طلوع والے ادیبوں، قلم کاروں اور صحافیوں میں حامدی کاشمیری، شمیم احمد شمیم، محمد یوسف ٹینگ، اکبر لداخی، پشکر ناتھ تیج بہادر بھان، مخمور بدخشی، حکیم منظور، سلطان الحق شہیدی، ڈاکٹر اکبر حیدری، غلام نبی خیال، ثناء اللہ بٹ، صوفی غلام محمد، موتی لال ساقی، اوتار کرشن رہبر، ویدراہی، سرن سنگھ، رتن لعل شانت، چمن لال چمن، مکھن لال بیکس، نور محمد بٹ، طاہر مظفر، خضر مغربی، برج پریمی، نشاط انصاری، تنہا انصاری، ارجن دیو مجبور اور پروفیسر شمس الدین احمد فوراً ہی ذہن میں آتے ہیں — ۱۹۶۵ء کے بعد ملک گیر پیمانے پر شعر و ادب کی دنیا نئے نئے موضوعات اور تجربات لے کر سامنے آئی ملک کے

قلم کار ادب میں نئی جہتوں اور نئے راستوں کی نشاندہی میں جُٹ گئے۔ ظاہر ہے کہ کشمیر کے ادیب، شاعر اور فنکار، وہ چاہے کشمیری میں لکھتے ہوں یا اُردو میں، ان تبدیلیوں سے متاثر ہوئے، نئی ضرورتوں اور نئے تقاضوں کا ساتھ دینے کے لئے لکھنے والوں نے اپنی منتشر صفوں کو نئے سرے سے سمیٹنا اور سنوارنا شروع کیا۔ اس دوراں کہنہ مشق لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ کچھ نئے نام توجہ کا مرکز ہو گئے۔ اس ضمن میں فاروق نازکی، فرحت گیلانی، صادق علی اسیر، ہردے کول بھارتی، نور شاہ، مرغوب بانہالی، وجیہہ احمد اندرابی، غلام نبی ناظر، ایوب بیتاب، رشید نازکی، رسول پوتپر، شاہد بڈگامی، ڈاکٹر شنکر رینہ اور محمد الزماں آزردہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اس دوران ریاست میں تمدن، زبان اور فنون لطیفہ سے متعلق اکادمی کا وجود میں آنا ایک اہم قدم بھی تھا اور وقت کی اہم ضرورت بھی۔

۱۹۷۰ء کے بعد جموں وکشمیر رائٹرس اور آرٹسٹس کواپریٹو سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا اس سوسائٹی کو جنم دینے والے تھے مدموہن ملہوترہ جو نہ افسانہ نگار تھے اور نہ ہی شاعر یا مصور، اس کے باوجود قلم کاران کے ادبی اور انسانی دوستی کے قائل تھے۔ ریاست اکثر و بیشتر شاعر، ادیب، ناقد اور مصور اُن کے دوستوں میں سے تھے اس سوسائٹی کا دفتر بابا بلڈنگ (بنڈ سرینگر) میں تھا۔ مشہور مصور غلام رسول سنتوش سوسائٹی کے چیئرمین تھے۔ علی محمد لون، پران کشور، بنسی پاریمو، اکبر لداخی، نور شاہ، بنسی نردوش، پشکر بھان، فاروق نازکی، سوم ناتھ سادھو، موہن چراغی اور پروفیسر اجیت کمار اس کے ممبران میں سے تھے۔ یہاں ہر شام ادیب اور شاعر یکجا ہوتے مل جُھل کر ادب کے مختلف گوشوں پر گفتگو ہوتی، غیر رسمی طور پر خیالات کا تبادلہ ہوتا، شرکا ایک دوسرے سے مستفید بھی ہوتے اور ایک دوسرے کے دُکھ سکھ میں شریک بھی ہوتے۔ ہر اتوار کو ایک خاص ادبی محفل کا انعقاد ہوتا۔ افسانے پڑھے جاتے، غزلیں اور نظمیں

پیش کی جاتیں، تنقیدی مقالے پڑھے جاتے اور ان پر بھرپور تبصرہ ہوتا، اس ادبی محفل میں شریک ہونے والوں کے لئے عمر کی، مقام یا رتبے کی کوئی قید نہ تھی، متذکرہ سوسائٹی کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ رامانند ساگر جیسے معروف فلم کار اور فلم ساز جب کبھی بمبئی سے کشمیر آتے تو بابا بلڈنگ چلے آتے اور ان محفلوں میں شریک ہوتے۔ ویدراہی بھی کبھی کبھی واردِ کشمیر ہوتے اور اپنی کوئی تخلیق سناتے، مدن موہن شرما، رام کمار ابرول، نریندر کھجوریہ، جتیندر شرما، موہن یاور، عرش صہبائی اور عابد مناوری اس محفل ادب میں شریک ہونے کے لئے کئی بار جموں سے آئے۔ ٹھاکر پونچھی جو دہلی میں مقیم تھے کئی بار اس محفل کی زینت بنے، انہوں نے اپنا ناول "یہ من بڑا چنچل ہے" ایک ہی نشست میں پیش کر کے سب کو چونکا دیا تھا، ایسی ایک محفل میں محترمہ رضیہ سجاد ظہیر نے اپنا مشہور افسانہ "اللہ دے بندے" پڑھا تھا، ان کے ہمراہ سجاد ظہیر بھی تھے، ان محفلوں کو شمیم احمد شمیم اپنی زبان، شگفتگی، روانی اور انداز بیان سے کبھی سنجیدہ اور کبھی قہقہہ زار بنا دیتے تھے۔ سنتوش نے بابا بلڈنگ کے ایک کمرے کو اپنے سٹوڈیو میں تبدیل کر لیا تھا اور اس طرح کئی شاہکار تصاویر کو اسی ماحول میں تخلیق کیا۔ مصور نثار عزیز اور بنسی پارمو نے بھی یہیں اپنی کئی یادگار تصویروں کی تخلیق کی، کشمیری فلم "ماجۂ زراتھ" کی کہانی، منظر نامہ، گیت اور مکالمے یہیں اسی ادبی ماحول کے پس منظر میں قلم بند ہوتے۔ اس دوران کئی نئے ادیب اور شاعر ادبی افق پر نمودار ہوئے ان میں ریاض پنجابی، بشیر شاہ، محمد یٰسین بیگ، کلدیپ رعنا، شجاع سلطان، شبنم قیوم، بشیر احمد بشیر، عبد الغنی شیخ، اشرف ساحل، خالد حسین، وحشی سید ساحل، عمر مجید اور شمس الدین شمیم فوراً ہی ذہن میں آتے ہیں، مسعود سامون، فاروق مسعودی، ڈی کے کنول، مظفر ایرج، اقبال فہیم، مجید مضمر، م۔ ح۔ ظفر، جوتشور پتھک، رفیق راز، محمد احمد اندرابی، فاروق رینزو، جان محمد آزاد، دویندر پٹواری،

بشیر اختر، ڈاکٹر غلام محمد آجمہ اور کئی دوسرے شاعر اور افسانہ نگار اس قافلے سے جا ملے۔

مدھوسودن ملہوترہ کی وفات کے بعد جموں و کشمیر رائٹرس اور آرٹسٹس کوآپریٹو سوسائٹی کا بکھر گیا اور رفتہ رفتہ اس کا وجود ہی مٹ گیا۔

اُن ادبی محفلوں کی اہمیت کچھ کم نہ تھی جو محکمہ انفارمیشن کے ایک ہال میں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ ان کا انعقاد اور اہتمام مرحوم شمیم احمد شمیم کیا کرتے تھے، مجھے یاد ہے کہ ایک ایسی ہی محفل میں اختر محی الدین نے اپنا ایک طویل افسانہ پڑھا تھا (نام ذہن میں محفوظ نہیں) اس افسانے پر لگ بھگ آٹھ گھنٹے بحث جاری رہی تھی نشست کی صدارت میر غلام رسول نازکی کے سپرد تھی، اس مخصوص نشست میں محمد یوسف ٹینگ نے اپنی ناقدانہ صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا تھا۔ یہ سلسلہ کچھ برس جاری رہا۔۔۔ !!

پھر سید قیصر قلندر کی قیادت میں یہاں کے ادیب اور شاعر ایک بار پھر اکٹھا ہونے لگے اور قیصر قلندر کی رہائش گاہ پر (وہ اُن دنوں کرن نگر میں رہتے تھے) ہر اتوار کو ادیب اور شاعر جمع ہونے لگے، اتوار کی یہ محفل تین بجے شروع ہو کر رات کے آٹھ بجے تک جاری رہتی تھی، یہاں ہونے والی ادبی محفلیں کشمیر کی ادبی فضا کو سنوارنے میں پیش پیش رہیں جو شاعر اور ادیب ان محفلوں میں باقاعدگی کیساتھ شمولیت کرتے تھے ان میں سید قیصر قلندر کے علاوہ بنسی تردوش، علی محمد لون، پران کشور، پشکر بھان، سومناتھ سادھو، سومناتھ زتشی، اختر محی الدین، امین کامل، غلام رسول سنتوش، وید راہی، نور شاہ، پشکر ناتھ، تیج بہادر بھان، حامدی کاشمیری، مہندر رینہ، رحمان راہی، غلام نبی فراق، فاروق نازکی، فرحت گیلانی، ہری کرشن کول، رتن لعل شانت، مکھن لعل، صوفی غلام محمد، ہردے کو بھارتی، موتی لعل ساقی،

شاہد بڈگامی، غلام نبی خیال، صادق علی اسیر، قاضی غلام محمد سنتوش اور غ۔ م۔ جانباز کے نام قابل ذکر ہیں۔ میر غلام رسول نازکی، عبدالحق برق، پروفیسر حاجنی، دینا ناتھ نادم، پروفیسر جے۔ ایل کول اور غلام نبی گوہر بھی کبھی کبھی ان محفلوں کی زینت بڑھاتے اور اپنی تخلیقات سے شرکائے محفل کو نوازتے ان کی رائے حاصل کرتے۔ سوال وجواب کا ایک صحت مند سلسلہ چلتا اور دیر گئے تک خیالات کی اور ذہن ودل کی روشنی بانٹی جاتی۔ یہ ادبی محفلیں نہ صرف پرسکون اور پرکشش ماحول میں تکمیل پاتیں، ان محفلوں میں ذاتی رنجشوں کے لئے اور ذاتیات کیلئے کوئی جگہ نہ تھی۔ ایک بڑی بات یہ ہے کہ یہ محفلیں خالص ادبی ہوتی تھیں اور ان پر کبھی کسی طرح کی سیاست کو حاوی نہ ہونے دیا گیا ——— !!

نصرت چودھری

# جموں میں اردو افسانہ

## ۱۹۴۷ء—۱۹۹۷ء

موجودہ صدی میں شاعری کے ساتھ ساتھ جس صنف نے سب سے زیادہ مقبولیت حاصل کی وہ افسانہ ہے۔ افسانہ نثری ادب کی سب سے مقبول صنف ہے اور شاید اردو کی تمام اصناف میں یہ واحد صنف ہے جو تیزی سے ارتقا کے منازل طے کر کے ایسے مقام پر پہنچ چکی ہے جہاں وہ آج کے انسان کی کھوکھلی، میکانکی اور شکست خوردہ زندگی کو اپنے دامن میں سمیٹ سکے۔

ریاستی سطح پر جب ہم اس صنف کا جائزہ لیتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کے لکھنے والے عہد بہ عہد زندگی کے بدلتے رنگوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے رہے ہیں۔ لگ بھگ سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء کے دوران جب یہاں اس صنف کا آغاز ہوا تو ریاست کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی زندگی ایک انتشار کے دور سے گزر رہی تھی۔ ایک جانب ڈوگرہ شاہی کی غلامی کا سیاہ طوق عوام کے گلوں میں پڑا تھا تو دوسری جانب نیشنل کانفرنس عوام کے اندر بیداری، ہمت اور حوصلہ کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا کر رہی تھی۔ یہاں کے عوام انتہائی بے چارگی اور بے چینی میں مبتلا تھے۔ چنانچہ اُس وقت کے افسانہ نگاروں میں پریم ناتھ پردیسی، پریم ناتھ در، کرشن چندر، نند گوپال باوا، قدرت اللہ شہاب، رامانند ساگر، نرسنگھ داس نرگس، کشمیری لال ذاکر، ٹھاکر پونچھی، سومناتھ زتشی اور موہن یاور وغیرہ نے ریاستی عوام کی بے چینی، انتشار، مظلومیت، بے چارگی اور بے بسی

* شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں۔

کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ انہوں نے اُن حقائق کو بھی بے نقاب کیا جس نے یہاں کے لوگوں کو غربت اور مفلسی کی زندگی گزارنے پر مجبور کیا تھا۔

ان افسانہ نگاروں نے سیدھے سادے انداز میں عوامی زندگی کے مختلف مسائل، غربت، جہالت، غلامی، طبقاتی کشمکش، بیکاری اور اقتصادی بدحالی کو اُبھارنے کی کوشش کی۔ یہ ادیب اپنے معاشرے کے نامساعد حالات کا گہرا شعور رکھتے ہوئے ادبی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں اور سرگرمیوں سے بھی متاثر ہوتے رہے۔ ان کے ہاں رومانیت اور سماجی حقیقت نگاری کے گہرے اثرات ملتے ہیں۔ انہوں نے موضوع، ہیئت اور تیکنیک کی سطح پر سجاد حیدر یلدرم اور پریم چند کی روایت کا اثر قبول کیا۔ اور ترقی پسند رجحانات نے جب باضابطہ تحریک کی صورت اختیار کر لی تو انہوں نے زیادہ تر ترقی پسند نظریات کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ ان افسانہ نگاروں کے یہاں جاگیردارانہ نظام سے نفرت اور جمہوری اقدار کی پاسداری کا عنصر بھی ملتا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں کے لئے موضوعات زیادہ تر اپنی گرد و پیش کی زندگی سے اخذ کئے اور اس صنف کی روایت کو اپنی بساط کے مطابق آگے بڑھایا۔ تقسیم وطن تک ریاست میں افسانہ نگاری کا فن ہیئت، تیکنیک اور موضوع کے اعتبار سے اپنی کم عمری کے باوجود ایک مستحکم روایت قائم کر چکا تھا۔ تقسیم کے بعد کچھ سالوں تک لوگ افراتفری اور انتشار کا شکار رہے۔ ادیبوں اور افسانہ نگاروں کا شیرازہ بھی بکھر گیا۔ کچھ افسانہ نگار ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے اور کچھ جموں سے باہر۔ تقسیم وطن کے بعد جہاں سیاسی اور سماجی حالات میں تبدیلی رونما ہوئی وہیں ادبی زندگی بھی نئے مرحلے میں داخل ہوئی۔ افسانے کے اُفق پر چند پرانے لکھنے والوں کے ساتھ کچھ نئے نام بھی ابھرے جن میں وید راہی، پُشکر ناتھ، جگدیش کمل، رام کمار ابرول، وجے سوری، اشوک پٹواری، مالک رام آنند، مدن موہن شرما اور کشوری منچندہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان افسانہ نگاروں

نے مارکس کے اشتراکی نظریات کے ساتھ ساتھ فرائڈ کے نظریات سے بھی اثر قبول کر کے لاشعور، نفسیات اور جنس کو اپنا محور بنایا۔ غرض ان افسانہ نگاروں نے نہ صرف بیسویں صدی کے پیچیدہ اور نفسیاتی مسائل کو افسانے میں پیش کر کے معاصرین سے ایک قدم آگے بڑھایا بلکہ وقت اور زمانے کے ساتھ بدلتی ہوئی اقدار زندگی کے نئے مسائل اور ہیئت کے تحت نئے تجربات کو اپنے فن میں سمو کر افسانے کی روایت میں توسیع کی۔ یہ بھی افسانہ نگار زیادہ تر ترقی پسند تحریک کے اثرات کے تحت ریاستی عوام کے محنت کش طبقہ کی ترجمانی اور ان کے مسائل کو پیش کرتے رہے۔

۱۹۵۵ء اور ۱۹۶۰ء کے درمیان ملکی اور بین الاقوامی سطح پر بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان تبدیلیوں کی بنیاد بدلتے حالات، فحاشی و اخلاقی زوال، دو عظیم جنگوں کی تباہ کاری، ملک کی تقسیم کا المیہ، آزادی کی بے معنویت، فرد کی تنہائی اور کرب سے منسلک تھی۔ اور ان تبدیلیوں کا براہ راست تعلق افسانے کی فکری، موضوعاتی اور اسلوبیاتی سطح سے بھی تھا کیونکہ افسانے کا تعلق زندگی سے رہا ہے اور زندگی جس طرح تبدیل ہو رہی تھی افسانہ نگاروں نے نیا انداز اختیار کر کے اُسے زندگی سے مشروط رکھا۔ چنانچہ ان بدلتے حالات کے ساتھ افسانے کی عمومی فضا میں تغیرات کا احساس پیدا ہونے لگا اور جس کا آخری روپ علامتی اور تجریدی کہانی کا روپ ہے۔

لیکن ریاست کے افسانہ نگاروں میں ان تغیرات اور تبدیلیوں کا احساس بہت دیر سے ملتا ہے۔ دراصل یہاں افسانہ طویل عرصے تک ترقی پسند تحریک کے تحت ہی پروان چڑھتا رہا۔ اس کی وجہ بھی یہاں کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات کے ساتھ ساتھ ترقی پسند تحریک کی شہرت اور مقبولیت بھی۔

تقسیم کے بعد ۱۵۔۲۰ سالوں میں جس طرح ملکی سطح پر افسانہ علامتی اور تجریدی صورت اختیار کرنے لگا تھا، مروجہ روایت سے انحراف کرتا ہوا علامتوں، تشبیہوں اور استعارات

کے سہارے آگے بڑھنے لگا تھا یا خارجی اور معروضی سمتوں سے دامن بچاتا ہوا موضوعی داخلی اور ذاتی رنگ اختیار کرنے لگا تھا اس کے واضح اثرات صوبہ جموں کے افسانہ نگاروں کے ہاں فوراً نہیں ملتے۔ یہاں کے لکھنے والوں نے زیادہ سے زیادہ مارکس کے اشتراکی نظریات اور فرائڈ کے تحلیل نفسی کے نظریات کے ساتھ عصری مسائل اور کشمیریت کے احساس کو ابھارنے کی کوشش کی۔ جموں خطے سے تعلق رکھنے والوں نے یہاں کی کہانیاں لکھیں یا پھر ہیئتی سطح پر شعور کی رَو کے تجربات کئے۔

ہمارے ہاں نئے افسانے کے خدوخال صحیح معنوں میں ۱۹۷۰ء کے بعد ابھرتے ہیں۔ ساتویں دہائی میں معاصرین کے ساتھ چند نوجوان افسانہ نگار بھی سامنے آئے جنہوں نے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر ہوئے تغیرات اور رجحانات کا گہرا اثر قبول کیا۔ ملکی سطح پر ابھرنے والے نئے علامتی افسانہ نگار سریندر پرکاش، انتظار حسین، بلراج مین را اور انور سجاد کے افسانوں کا مطالعہ کرنے کے ساتھ مغرب کے اہم علامتی اور وجودی مفکرین جیمز جائس، ورجینا ولف، ایلیٹ، سارتر، کامو اور کافکا کے اثرات بھی قبول کئے اور مغربی رجحانات اور تحریکات مثلاً وجودیت، اشاریت، سرریلزم کے افسانے پر پڑتے ہوئے اثرات کا جائزہ بھی لیا۔ اور دُوسری جانب جب انہوں نے اپنے گرد و پیش کی زندگی کا جائزہ بھرپور انداز میں لیا تو انہیں زندگی قدرے بدلی ہوئی نظر آئی۔ چنانچہ کئی ایسے افسانہ نگار سامنے آئے جنہوں نے عصرِ حاضر کی زندگی کو نئے افسانے میں پیش کیا ہے۔

ان افسانہ نگاروں میں معاصرین میں سے پشکر ناتھ اور مالک رام آنند اور نئے لکھنے والوں میں ظہور الدین، آنند لہر، خالد حسین، دیریندر پٹواری، کے ڈی مینی اور اقبال نارش کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

ان افسانہ نگاروں نے جب بیسویں صدی کے ادب کا جائزہ لیا تو انہیں کہیں

شعوری اور کہیں لاشعوری طور پر ایسے نظریے نظر آئے جن کی بازگشت اُردو افسانے میں بھی سُنائی دے رہی تھی۔ نفسیات کے مختلف پہلو علامیت، اظہاریت، وجودیت اور سرریلزم کے اثرات بھی اردو افسانے پر مرتسم تھے۔ افسانہ علامتی اور تجریدی انداز اختیار کر چکا تھا۔ یہ علامتی اور تجریدی انداز دراصل عصری انتشار، گھٹن، تنہائی، بے گانگی اور زندگی کی گہما گہمی اور اکتاہٹ سے بیزاری کا اظہار تھا۔ معاشرتی زندگی جس طرح غیر مربوط تھی افسانہ بھی اسی طرح بکھری غیر مربوط زندگی کا عکس بن گیا۔ گزشتہ بیس پچیس سالوں کے دوران ان افسانہ نگاروں نے دور کی میکانیکی کھوکھلی، بے کیف اور بے رنگ زندگی کو نئے افسانے کی تیکنیک اور علامتی پیرائے میں سمونے کی کوشش کی۔

نئے افسانہ نگاروں میں پہلا نام پشکر ناتھ کا ہے۔ پشکر ناتھ ان افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنہوں نے اپنے تخلیقی سفر کے دوران ارتقا کی کئی منزلیں طے کی ہیں۔ انہوں نے وقت کے تغیرات کے ساتھ اور نئے رجحانات کے تحت روایتی حقیقی انداز سے ذرا ہٹ کر زندگی کے تلخ حقائق، اقدار کی شکست اور زندگی کی بے معنویت اور بے سمتی کا نوحہ پیش کیا ہے۔ ان کے انداز اور سوچ میں پہلے سے زیادہ فکری گہرائی ملتی ہے۔ جدید عصری مسائل ان کے ہاں ابہامی اور علامتی پیکروں میں سامنے آتے ہیں ان کے ہاں صنعتی اور سائنسی ترقی کے باعث ابھرتے بحران، سیاسی استبدادیت، شکست و ریخت میں مبتلا معاشرہ زندگی کی بے معنویت اور بے سمتی کا عکس نمایاں ہے۔ ان کا افسانہ "پل بنر صفر کے گدھ" علامتی اور نئے افسانے کی عمدہ مثال ہے۔ یہ افسانہ بلاشبہ ان کا ایک اہم افسانہ ہے جس میں نہ صرف آج کے دور بلکہ آنے والے دور کی کہانی بھی پوشیدہ ہے۔ اس افسانے میں ہمارے عہد کے جبر و استبداد اور نئی نسل کے لیے کو نہایت چابکدستی اور فنکاری سے علامتی پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ افسانہ جبر کے ایک ایسے دائرے کے متعلق بھی ہے جس سے نکلنا شاید انسانی تقدیر میں نہیں۔ پشکر ناتھ

نے اس مختصر سے افسانے میں پوری ریاست کی تاریخ رقم کر دی ہے، انسانی تاریخ کا بھی جس کا ازل سے استحصال ہوتا رہا ہے۔ یہ افسانہ نہ صرف دورِ حاضر کی صداقتوں کا عکاس ہے بلکہ اس افسانے میں گدھ اور بوڑھے ملاح کی علامت سے بڑی معنویت پیدا کی گئی ہے۔ گدھ آنے والی وہ نسل ہے جو جبر و استبداد کا نمونہ ہے۔ جن کے ہاں ترجیحات، خود غرضی اور چھینا جھپٹی ہے اور دوسری طرف بوڑھا ملاح ماضی کی علامت ہے، ماضی کی وہ نسل جو خاموشی سے ظلم سہتی رہی، اپنی ذات کا استحصال ہوتا دیکھتی رہی لیکن پھر بھی جس نے انسانیت پر حرف نہیں آنے دیا۔

"غبارے کی واپسی" ان کا ایک اور علامتی افسانہ ہے۔ اس کا موضوع زندگی کی بے مقصدیت اور بے سمتی ہے۔ آج کا انسان اپنا مقصدِ حیات اور سمت کھو چکا ہے۔ اس کے پاس نہ کوئی مقصد رہا ہے، نہ کوئی امید۔ افسانے میں غبارہ انسان کی ازلی معصومیت اور حقیقی خوشی کی علامت بن کر ابھرتا ہے۔ اس افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> "بہت پہلے میرے ہاتھ سے بھی اسی طرح ایک غبارہ چھوٹ کر آسمان کی جانب لپکا تھا اور پھر اوپر ہی اوپر وسیع تر خلا کی جانب چلا گیا تھا اور نگاہ کی حد سے بھی پرے کہیں جا کر اوجھل ہو گیا تھا۔ اس لمحے میں بھی خوب دہاڑیں مار مار کر رویا تھا اور رو رو کر اور تھک ہار کر اپنی متاع لٹا کر اور اپنی بے چارگی کا احساس پا کر اور اپنی بے بسی کا ڈراؤنا چہرہ دیکھ کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا تھا۔"

انسان کی ازلی معصومیت اور حقیقی مسرت و انبساط کے لٹ جانے کے نوحے کو دلکش پیرائے میں ابھارا گیا ہے۔

"شہرِ بے چراغ" بھی ایک علامتی افسانہ ہے جس میں آج کے دور کی نراجیت،

طوائف الملوکی، افراتفری، خود غرضی اور آپا دھاپی کے اندھے طوفان کو موضوع بنایا گیا ہے۔

غرض دور حاضر میں تیزی سے بدلتی سماجی اور اقتصادی قدروں اور زندگی کی ناپائیداری نے جس طرح انسان کو متاثر کیا ہے اور وقت کے اس نئے تصور و تغیر سے افسانے کے موضوعات، تیکنیک، ہیئت اور زبان میں جو تبدیلی آتی ہے۔ اس کے واضح نشانات بشکر ناتھ کے ہاں ملتے ہیں۔

نئے اور علامتی افسانے کی روش کے بانیوں میں اہم نام ظہور الدین کا ہے وہ اُن افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنہوں نے جدیدیت کے اندھے طوفان کو فوراً قبول نہیں کیا بلکہ فنی اور تیکنیکی سطح پر افسانوں میں کئے گئے تجربات کا گہرا شعور حاصل کرنے کے بعد انہیں اپنے افسانوں میں برتا ہے۔ انہوں نے زمانے کے انتشار و اضطراب، بے معنویت اور بدلتے اقدار کو فوراً افسانوں کا موضوع نہیں بنایا۔ بلکہ خوب سوچ سمجھ کر نئے افسانے کے فن سے گہری واقفیت اور مطابقت رکھنے کے بعد انہیں پیش کیا ہے۔ اُن کے افسانے اُن کے گہرے مشاہدے اور فکری پختگی کا احساس دلاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں میں الگ پہچانے جاتے ہیں۔ انہوں نے عصری زندگی کے اضطرار و اضطراب، بے مقصدیت اور انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں کو اپنے افسانوں۔ "نجات" "بدروح"، "دشہوار" "بیگ والا" اور "کیبنی بلز" میں اُبھارا ہے۔ مثلاً "نجات" میں انہوں نے آج کے دور کے انسانی المیے کو پیش کیا ہے۔ سائینسی اور صنعتی ترقی نے انسان کو جو مادی خوشحالی دی ہے اُس نے انسان کے ذاتی اوصاف کو مسخ کر دیا ہے وہ ذہنی پراگندگی اور روحانی انتشار کا شکار ہو گیا ہے۔ افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"تعین و تقدس کا وہ عصا جس نے سمندروں کے سینے پر موسیٰ کے لئے راہ

نکالی تھی۔ تشکیک کی بجلیوں کی ایک ہی باڑھ میں خاکستر ہو کر رہ گیا۔ بھلا ایمان کے چند تنکے اس طوفان بے تمیزی کا کیا مقابلہ کرتے۔ جن دلوں اور دماغوں میں پہلے خلوص کی دیوی براجمان تھی وہاں اب غرور و تکبر کے عفریت خرمستیاں کرنے لگے اور وہ بے چارہ اپنے خواب کی تعبیر دیکھ کر ششدر رہ گیا۔"

بلاشبہ جن معاشی اور اخلاقی بنیادوں پر معاشرے کی خوشحالی کا انحصار تھا وہ منہدم ہوتی جارہی ہیں۔ صنعتی اور سائنسی ترقی نے اسے بے شمار واہموں اور وسوسوں کے ساتھ بے یقینی اور بے اطمینانی کا شکار بنا دیا ہے۔ اس افسانے کے آخر میں کردار کا شہر سے بھاگ کر غار میں پناہ لینا صنعتی تہذیب کی بدصورتی کو واضح کرتا ہے۔

"در شہوار" بھی ایک علامتی افسانہ ہے جسے پڑھتے ہوئے شو کی غوطہ زنی کا تصور ابھرتا ہے۔ ہندوستانی اسطور میں غوطہ قلب ماہیت کا استعارہ ہے۔ اس افسانے میں کردار سمندر میں غوطہ لگا کر مسلسل طوفانوں کا مقابلہ کرنے کے بعد نایاب در شہوار حاصل کرتا ہے گویا اسے اپنی منزل مل جاتی ہے۔

افسانہ "بد روح" ہمارے معاشرے پر بھرپور طنز ہے۔ آج کے معاشرے میں سچا اور دل کی آنکھ روشن رکھنے والا انسان بد روح تصور کیا جاتا ہے۔

ظہور الدین اپنے افسانوں میں پلاٹ اور کردار نگاری کی سطح پر مروج روایتی انداز سے انحراف کرتے ہوئے ایک طلسمی فضا ابھارتے ہیں۔ ان کے یہاں آزاد تلازمہ خیال، نفسیات اور سرریلزم کا انداز نمایاں ہے۔ ان کے یہاں کردار عام طور پر علامتوں کی صورت میں ابھرتے ہیں۔ بد روح، بیگ والا اور کینی بلز کا ابلیس علامتی کرداروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس کے علاوہ انہوں نے شعور کی رو، اظہاریت، سرریلزم اور وجودیت سے

مدد لے کر افسانے کی ہیئت میں تجربے بھی کئے ہیں۔ اُن کا طویل افسانہ اوڈی سوز ایک نیا تجربہ ہے جس میں انھوں نے نثری نظم اور آزاد نظم کا اسلوب اختیار کیا ہے۔ اس منظوم افسانے کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ادیب خارج کی دنیا سے رشتہ توڑ کر لاشعور کے آفاق میں گم ہو گیا ہے؟ اور ایسے تصورات میں زندہ ہے جو خواب اور بیداری سے اوپر نہیں اٹھتے۔ اوڈی سوز کی پوری فضا ایک طلسمی کیفیت سے متصف ہے۔ یہ تجربہ بلاشبہ اس صنف میں افسانے کی حیثیت رکھتا ہے۔

ظہور الدین نے زیادہ تر اپنے افسانوں میں سماجی زندگی سے کٹ کر اپنے لاشعور سے موضوعات تلاش کئے ہیں اور ان میں وجودیت کا فلسفہ پوری معنویت کے ساتھ کارفرما ہے۔

آنند لہر کے یہاں زیادہ تر اینٹی اور تجریدی کہانی ملتی ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں بغیر پلاٹ اور کرداروں کے ایک خواب آور کیفیت کو ابھارا ہے۔ نئے افسانوں میں جہاں موضوعاتی سطح پر زندگی کی بے معنویت، معاشی ناہمواری، طبقاتی تضادات، بے چینی، تنفر، مادیت اور میکانکی عمل کا احساس ملتا ہے وہیں افسانے کے فن میں کئی تجربے بھی ہوئے ہیں۔ نئے افسانے میں کہانی پن، پلاٹ اور کرداروں سے قطع نظر اینٹی پلاٹ اور اینٹی کہانی کی جھلک ملتی ہے۔ نئے تجریدی افسانوں کی تکنیک اور ہیئت روایتی افسانوں سے قدرے مختلف ہے۔ آنند لہر کے ہاں زیادہ تر یہی نیا انداز کارفرما ہے۔ ان کے افسانوں میں واقعات کی ترتیب، پلاٹ کی تعمیر اور کرداروں کے روایتی ارتقاء کے بجائے منتشر خیالات و واقعات کو یکجا کر کے پیش کیا گیا ہے۔ جس طرح خواب میں ہم زمان و مکان کی حدود سے ماورا ہو جاتے ہیں اسی طرح "انحراف" جیسے افسانے کو پڑھتے ہوئے خواب کے سے عمل کے تحت زمانی و مکانی حدود کے بجائے واقعات کا ایک منتشر عمل سامنے آتا ہے۔ اُن کے افسانے سڑک، عدالت، رفتار، راستے کا

پہاڑ اور وجود تجریدی افسانے کے اعلیٰ نمونے کہے جا سکتے ہیں۔

۱۹۷۰ء کے بعد منظر عام پر آنے والے افسانہ نگاروں میں خالد حسین بھی شامل ہیں۔ انہوں نے دور حاضر کے فرد کے داخلی احساسات اور محسوسات کو فکری سطح پر محسوس کیا اور مختلف پیچیدہ نفسیاتی اور جنسی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ ان کے ہاں زندگی کے خارجی مظاہر کی معرفت انسان کے داخلی، ذہنی، نفسیاتی تاثرات تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش بھی ملتی ہے۔ کہیں کہیں انہوں نے ابہامی اور علامتی طرز بھی اختیار کیا ہے۔ لیکن وہ اس میں پوری طرح کامیاب نہیں۔ وہ بنیادی طور پر روایت پسند افسانہ نگار ہیں۔ ان کے ہاں پلاٹ، کردار اور تیکنیک کی سطح پر روایتی انداز ملتا ہے۔ لیکن موضوعات کی سطح پر ان کے ہاں نیا پن ضرور ملتا ہے۔ انہوں نے موجودہ دور کی سطحی اور میکانیکی زندگی کے مسائل پر قلم اٹھا کر اپنے افسانوں کو فرسودہ اور غیر فطری ہونے سے بچا لیا ہے۔ اجمال اور ابہام سے دامن بچا کر ابلاغ کا صاف ستھرا انداز ان کی نمایاں خصوصیت ہے۔ جہاں کہیں وہ علامتی اور تجریدی حدود کو عبور کرتے ہیں۔ قاری اور خالق کے درمیان کچھ فاصلے جنم لینے لگتے ہیں۔ علامتوں کی بہتات اصل مفہوم تک رسائی ناممکن بنا دیتی ہے۔ تاہم انہوں نے اپنے افسانے بھوشیہ وانی، نئے آدم کا خواب، اندھیر نگری اور گھاس پر چلنا منع ہے، میں موجودہ دور کی زندگی کی بے چینی، بے قراری اور بے سمتی کو علامتوں کے ذریعے ابھارا ہے۔

ویریندر پٹواری بھی خالد حسین کی طرح آج کے عہد کے مسائل کو روایتی پلاٹ میں پیش کرتے ہیں۔ وہ استعاروں اور علامتوں کے ذریعے عصری زندگی کے درد و کرب اور اضطراب کے احساس کو زندہ کرتے ہیں۔ ان کے یہاں علامتیں اور استعارے گنجلک، مبہم اور غیر واضح نہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں آہستہ آہستہ خود ہی علامتوں سے پردے اٹھاتے ہیں اور کہانی کے اختتام تک سارا بھید کھل جاتا ہے۔ انہوں نے زیادہ تر

آج کے معاشرے میں گھرے ہوئے انسان کی کھوکھلی اور بے کیف زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ اُن کے افسانے "بے چین لمحوں کا تنہا سفر"۔ "مینا بازار"۔ "خواب خواب"۔ "فتنہ"۔ "بود نابود" میں انسانی غم، درد و کرب اور میکانیکی دور میں رشتوں کے عدم استحکام کی تصویر ملتی ہے۔

ان نمائندہ افسانہ نگاروں کے علاوہ نئی نسل کے چند نوجوان افسانہ نگار کے ڈی مینی، اقبال نازش، اقبال شال اور اسلم مرزا بھی علامتی اور تجریدی افسانے لکھ رہے ہیں۔ یہ افسانہ نگار موجودہ صدی کے انسان کی تبدیل ہوتی ہوئی زندگی سے پوری طرح باخبر ہیں۔ انہیں احساس ہے کہ خارجی حادثات اور واقعات انسان کی داخلی شکست و ریخت کو ظاہر کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کا سفر خارجی اور معروضی واقعات کے بجائے انسان کی داخلیت اور لاشعوری عوامل کی طرف ہے۔ ان پیچیدہ نفسیاتی عوامل کو پیش کرنے کے لئے علامتی اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔

صوبہ جموں میں نئے افسانے کا مختصر جائزہ اس امر کا غماز ہے کہ یہاں کے افسانہ نگاروں کے ہاں وہ تخلیقی صلاحیت موجود ہے۔ جس کے باعث وہ آج کے فرد کے مسائل دہشت، تنہائی اور ذہنی کشمکش کا گہرا شعور رکھتے ہوئے انہیں افسانے کی نئی ہیئت اور اسلوب میں ڈھالنے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔

محمد اسداللہ وانی*

# اقبالیات میں ریاستی ادیبوں کا حصہ

اُردو دنیا میں صرف اقبال ہی کی ایک ایسی ہستی ہے جس پر اس وقت تک سب سے زیادہ ادب تخلیق ہوا ہے۔ اقبال کے تعلق سے یہ حقیقت ریاست جموں وکشمیر کے سلسلے میں بھی مسلم ہے۔ یہاں گزشتہ بیس پچیس برسوں میں اقبال کی شاعری، فکر اُن کے فن اور فلسفہ کے مختلف پہلوؤں کا کسی نہ کسی زاویے سے جائزہ لیا گیا ہے جس کا سلسلہ ابھی تک نہ صرف قائم ہے بلکہ انشاء اللہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

کشمیر میں اقبال کی شاعری اور فکر کے اثرات قبول کرنے کے ساتھ ساتھ اقبال شناسی اور اقبال فہمی کا آغاز اقبال ہی کی زندگی میں ہوا۔ منشی محمد الدین فوق، منشی سراج الدین احمد، چودھری خوشی محمد ناظر، خلیفہ عبدالحکیم، غلام احمد مہجور اور عبدالاحد آزاد کشمیر کے اوّلین اقبال شناس تھے۔ ان میں منشی محمد الدین فوق کا نام سرفہرست ہے جنہوں نے سب سے پہلے اقبال کے حالاتِ زندگی مع تصویر "کشمیری میگزین" بابت اپریل ۱۹۰۹ء میں شائع کیے۔ یہ اقبال کے بارے میں جاننے اور بتانے کی اگرچہ پہلی مربوط کوشش تھی مگر حقیقت یہ ہے کہ فوق کا انداز نہایت سرسری تھا جس کی

* گورنمنٹ فلیٹ نمبر ۱۳، نیو فلیٹس، گاندھی نگر جموں۔

بدولت ایسی قیاس آرائیوں نے جنم لیا جو ابھی تک بحث و تمحیص کا موضوع بنی ہوئی ہیں۔ فوق نے اس کے بعد مشاہیرِ کشمیر (۱۹۳۰ء) نیرنگِ خیال (۱۹۳۲ء) اور تاریخِ اقوامِ کشمیر جلد اول (۱۹۳۴ء) اور جلد دوم (۱۹۴۳ء) میں اقبال کے حالاتِ زندگی، آبائی گاؤں اور ذات وغیرہ سے متعلق بہت بحث کی ہے۔

فوق کے علاوہ مولوی احمد الدین نے ۱۹۲۴ء میں اقبال کے بارے میں "اقبال" کے عنوان سے ایک کتاب شائع کی لیکن اقبال کی ناپسندیدگی کی وجہ سے انہوں نے اس کتاب کی ساری کاپیاں جلا ڈالیں اور پھر علامہ اقبال ہی کے کہنے پر اسے ۱۹۲۶ء میں از سرِ نو شائع کیا۔

کشمیر میں ابتدا میں اقبال سے متعلق زیادہ تر ادب مضامین کی صورت میں تخلیق ہوا ہے۔ اقبال کی شاعری اور اُن کے فکر و فلسفہ کے بارے میں اُس عہد میں مضامین تحریر کرنے والوں میں خلیفہ عبدالحکیم، محمد دین تاثیر، جعفر علی خان اثر اور غلام السیدین کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ شہزادی کلثوم کو اس ضمن میں اولیت حاصل ہے جنہوں نے "شاعرات اور اقبال" کے عنوان سے اقبال کے بارے میں ایک کتاب تحریر کی جسے اُن کے بھائی اکبر جے پوری نے ترتیب دے کر ۱۹۵۵ء میں منظرِ عام پر لایا لیکن چونکہ مصنفہ کا انتقال ۱۹۴۹ء میں ہوا ہے اس لئے کتاب کا اصل مسودہ اس سے قبل تیار ہوا ہوگا۔

ریاست جموں و کشمیر میں اقبال شناسی اور اقبال فہمی کی تحریک باقاعدہ طور پر ۱۹۴۷ء کے بعد شروع ہوئی۔ پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اس تحریک کو کافی تقویت پہنچائی۔ ان کی کوششوں سے اقبال کی زندگی، شاعری اور فکر و فلسفہ سے متعلق مختلف گوشوں کی نقاب کشائی ہوئی اور کسی حد تک اقبال کی حقیقی تصویر ابھر کر سامنے آئی۔ اِن دونوں ماہرینِ اقبالیات کی

بدولت ریاست کے تعلیم یافتہ طبقے میں اقبال سے دلچسپی رکھنے والوں میں ایک نیا شعور بیدار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نیا رجحان بھی پیدا ہوا، اور ان کی رفاقت میں پروفیسر حامدی کاشمیری، محمد یوسف ٹینگ، مرزا کمال الدین شیدا، مرزا غلام حسن بیگ عارف اور محمد امین بچھ نے کشمیر میں اقبال کا عرفان عام کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ ان سے اختلاف رکھنے والوں میں ڈاکٹر اکبر حیدری کا نام قابلِ ذکر ہے۔ یہ انہی حضرات کی توجہ اور انہماک کا نتیجہ ہے کہ آج اقبال ہمارے روزمرہ سے لے کر محراب گہہ وعظ و نصیحت تک، عوامی اجتماعوں سے لیکر سیاسی ایوانوں تک اور مکتبوں سے لے کر دانش گاہوں تک مختلف مکاتب فکر کی توجہ کا باعث بنے ہوئے ہیں۔

جموں و کشمیر میں اقبال کے بارے میں سب سے پہلا لیکچر پروفیسر آلِ احمد سرور نے ۱۹۵۳ء میں شیخ محمد عبداللہ کی وزارت عظمیٰ کے دوران انہی کی فرمائش پر کشمیر یونیورسٹی میں دیا۔ ان کے بعد ۱۹۵۵ء میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے کشمیر یونیورسٹی کی دعوت پر اقبال سے متعلق تین لیکچر تیار تو کئے لیکن دفتر سے رخصت نہ ملنے کی وجہ سے پیش نہ کرسکے البتہ بعد میں یہ تینوں لیکچر "اقبال اور اُس کا عہد" کے عنوان سے شائع ہوئے۔ پروفیسر آزاد ۱۹۶۸ء میں اپنی ملازمت کے سلسلے میں دہلی سے تبدیل ہو کر کشمیر آئے اور تب سے آج تک وہ مختلف حیثیتوں سے ریاست ہی میں مقیم ہیں۔ اپنے قیامِ کشمیر کے دوران انہوں نے اقبال کے بارے میں متعدد کتب اور مضامین تحریر کرکے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔

۱۹۷۵ء میں شیخ محمد عبداللہ جب ایک طویل مدت کے بعد دوبارہ برسرِ اقتدار آئے تو انہوں نے ۱۹۷۷ء میں اقبال کے بارے میں سب سے پہلا کام یہ کیا کہ کشمیر یونیورسٹی میں مسندِ اقبال قائم کروائی جسے بعد میں اقبال انسٹی ٹیوٹ میں تبدیل کیا گیا

اور مشہور دانشور اور ماہر اقبالیات پروفیسر آل احمد سرور کو اس کا پروفیسر اور پھر ڈائریکٹر مقرر کیا گیا، جو اس ادارے سے تقریباً دس برس وابستہ رہے۔ ۱۹۷۷ء کا سال اقبال صدی تقاریب کے انعقاد کا سال بھی مقرر ہوا اور ریاستی سطح پر کلچرل اکیڈیمی اِن تمام سرگرمیوں کا مرکز قرار پائی، جس کے ارباب بست و کشاد بالخصوص محمد یوسف ٹینگ کی کاوشوں سے ریاست بھر میں اقبال سیمناروں، مباحثوں، مذاکروں، مشاعروں اور موسیقی اور مصوری کے مقابلوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ ریاست کی مختلف زبانوں میں شیرازہ کے خصوصی نمبروں کے علاوہ کلام اقبال کے تراجم بھی کئے گئے اور کتابیں بھی تحریر کی گئیں۔ یوں ریاست گیر پیمانے پر اقبال سے متعلق تصانیف و تالیفات کا ایک ایسا دور شروع ہوا جو اپنی کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے اقبالیات کی ادب میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

کشمیر میں اقبال کا پیغام عام کرنے میں ریڈیو، ٹی وی، محکمہ اطلاعات، شعبہ ہائے اُردو، جموں اور کشمیر یونیورسٹی، اقبال انسٹی ٹیوٹ اور دوسری ادبی انجمنوں نے حصّہ بقدر جثہ ادا کیا۔ اس ضمن میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کی کوششیں قابلِ ستائش ہیں جن کی بدولت اقبال کے فکر و فن کو ایک نئے تناظر میں دیکھنے اور پرکھنے کا آغاز ہوا اور اقبال کا ایک طرح سے از سرِ نو احیا ہوا جس کی گونج پورے برِ صغیر میں سنائی دینے لگی۔

جموں و کشمیر میں اقبالیات کا جائزہ مختلف جہات اور حیثیتوں کا حامل ہے۔ اس زُمرے میں وہ تمام کُتب آتی ہیں جو براہِ راست جموں و کشمیر کے حوالے سے یا کسی نہ کسی طرح یہاں کے تعلق سے ضبط تحریر میں لائی گئی ہیں۔ اس ضمن میں اُن تمام ادیبوں کے مضامین کا شمار بھی آتا ہے جو ریاست کی مختلف زبانوں میں شائع ہونے والے رسائل و جرائد میں وقتاً فوقتاً چھپتے رہے ہیں یا کسی ریاستی ادیب کا کوئی مضمون بیرون ریاست کے کسی جریدے میں شاملِ اشاعت ہوا ہو۔ اقبالیات کے جائزے

میں ریاستی زبانوں میں کلام اقبال کے تراجم اور مختلف اداروں اور انجمنوں کا تذکرہ بھی شامل ہے جو اقبالیاتی ادب کو منصۂ شہود پر لانے کا موجب بنے۔

جہاں تک ریاست جموں وکشمیر کے حوالے سے مطالعۂ اقبال سے متعلق کُتب کا تعلق ہے حروفِ تہجی کے اعتبار سے اس سلسلے میں سب سے پہلا نام پروفیسر آل احمد سرور کا آتا ہے۔ اُردو ادب میں پروفیسر سرور اور اقبال کا ذکر لازم وملزوم ہے۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی میں کسی خاص موضوع پر کتاب لکھنے کے بجائے زیادہ تر مضامین تحریر کئے ہیں جن کا ایک خاص اسلوب اور انداز ہے اور جن کی کوئی نہ کوئی قدرِ مشترک ان میں وحدت پیدا کر کے متعلقہ موضوع پر کتاب کا درجہ عطا کرتی ہے چونکہ اقبال ان کا ایک محبوب موضوع ہے جس پر انہوں نے اب تک مسلسل بے تکان لکھا ہے اور اس سلسلے میں اُن کے خطبات اور مضامین کے متعدد مجموعے معرضِ وجود میں آئے ہیں۔ کشمیر کے حوالے سے "اقبال کے مطالعے کے تناظرات' اقبال اور اُن کا فلسفہ' عرفانِ اقبال' اقبال کا نظریۂ شعر وشاعری اور دانشور اقبال' اقبال کے بارے میں ان کی اہم کتابیں ہیں۔ اقبال کے ساتھ ان کی دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ اُن کی خودنوشت سوانح عمری "خواب باقی ہیں" اوّل تا آخر ذکرِ اقبالؔ سے بھری پڑی ہے۔

ڈاکٹر اکبر حیدری اُردو ادب میں اپنے ایک خاص اندازِ تحقیق کے لئے مشہور ہیں اقبالؔ کے بارے میں اُن کا اپنا ایک زاویہ نگاہ ہے اور انکے متعدد مضامین فکر انگیز ہیں۔ اقبالؔ پر کم وبیش پچاس مقالات لکھنے کے باوجود وہ ابھی تک اقبال پر کوئی کتاب شائع نہیں کرسکے ہیں[1]۔ البتہ "ذبحِ عظیم" کے عنوان سے انہوں نے ایک کتابچہ شہادتِ امام حسینؓ اور اقبالؔ کے تعلق سے شائع کیا ہے۔

بشیر احمد نحوی کشمیر کے ایک ابھرتے ہوئے ادیب ہیں۔ اقبالؔ سے اُن کی



[1] دیکھئے صفحہ نمبر ۲۶۰ پر

دلچسپی عشق کا روپ اختیار کر گئی ہے۔ اقبال کے بارے میں "اقبال — افکار و احوال" اور "وحدت الوجود اور اقبال" ان کی دو اہم کتابیں ہیں۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو اقبال کا مقلد، نقیب اور چلتا پھرتا قاموس کہا جاتا ہے وہ اقبال کے بارے میں ایک ادارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اقبال کے سلسلے میں اُن کی تصانیف و تالیفات کا سلسلہ ایک منظم ادارے کے سلسلہ اشاعت سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔ اقبالیات کے موضوع سے ہٹ کر اگر اُن کی کسی اور تصنیف کا مطالعہ کیا جائے تو اُس میں بھی کہیں نہ کہیں اقبال کا تذکرہ ضرور ملے گا۔ اقبال کے بارے میں اُن کی کُتب کی تفصیل یہ ہے، اقبال اور اُن کا عہد، اقبال اور مغربی مفکرین، اقبال کی کہانی، اقبال اور کشمیر، بچوں کا اقبال، محمد اقبال — ایک ادبی سوانح حیات، مرقعِ اقبال، اقبال: زندگی، شخصیت اور شاعری، اقبال ہز پوائٹری اینڈ فلاسفی، اقبال: مائنڈ اینڈ آرٹ، ہندوستان میں اقبالیات — آزادی کے بعد اور دوسرے لیکچر، ان کے علاوہ میرے گزشتہ روز و شب، پشکن کے دیس میں، کولمبس کے دیس میں اور حیاتِ محروم، شخصیت اور فن جیسی ان کی دوسری کتابوں میں بھی ذکرِ اقبال موجود ہے۔ اقبال کی شخصیت، شاعری، فکر اور فن کے بارے میں آزاد کی یہ تخلیقات جموں و کشمیر میں اقبالیات کے سلسلے میں ایک اہم اضافہ ہے۔

اقبال سے متعلق ڈاکٹر چمن لال رینہ کی کتاب "اقبال اور انڈین ہیریٹیج" اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے ایک نادر اور معلومات افزا کتاب ہے۔

پروفیسر حامدی کاشمیری نہ صرف جموں و کشمیر کے ایک قدر آور ادیب اور شاعر ہیں بلکہ اپنے منفرد تنقیدی اسلوب کے جسے انہوں نے اکتشافی تنقید کا نام دیا ہے، کی بدولت پورے اُردو ادب میں اپنا ایک مقام اور مرتبہ رکھتے ہیں۔ یوں تو اقبال کا ذکر ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے "جدید اُردو نظم اور یورپی اثرات"

کے ساتویں اور آٹھویں باب میں بھی موجود ہے لیکن اقبال سے متعلق انہوں نے اقبال اور غالب، حرفِ راز اور آئینہ ادراک جیسی اہم کتب تحریر کی ہیں اور اپنے اکتشافی اصولِ نقد کے اسلوب و انداز کا احسن طریقے سے مظاہرہ کیا ہے۔

اقبال کے بارے میں سسر کمار گھوش نے ٹیگور، سری اربندو اور اقبال، سعید احمد اکبر آبادی نے خطباتِ اقبال پر ایک نظر، سید امان اللہ بخاری نے پیغام اقبال اور ہم، سید وحید الدین نے اقبال اور مغربی فکر، حکمتِ گوئٹے اور فکرِ اقبال اور تفکرِ اقبال اور شام لال پردیسی نے تتم گلے زخیابانِ جنت کشمیر (کشمیری) کی بدولت کشمیر کے اقبالیاتی ادب میں قابلِ قدر حصہ ادا کیا ہے۔

پروفیسر شکیل الرحمٰن نے اپنی ملازمت کی تقریباً ساری مدت کشمیر یونیورسٹی میں گزاری۔ انہوں نے اپنے قیامِ کشمیر کے دوران اقبال روشنی کی جمالیات، اقبال اور فنونِ لطیفہ اور محمد اقبال کے نام سے اقبال کے بارے میں کتابیں تخلیق کیں۔

شہزادی کلثوم (جن کا ذکر ابتدا میں ہو چکا ہے)، عالم خوندمیری اور عبداللہ خاور نے اقبال کے بارے میں بالترتیب شاعرات اور اقبال SOME ASPECTS OF IQBALS POETIC PHILOSOPHY اور مفتاحِ اقبال جیسی کتابیں قلم بند کیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ عبداللہ خاور کی مفتاحِ اقبال اقبال انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری میں اقبالیات سے متعلق دستیاب مختلف جرائد اور رسائل کے مضامین کا موضوعاتی اشاریہ ہے۔

پروفیسر غلام رسول ملک اقبال کے شیدائی ہیں۔ انہیں اقبال سے صرف عقیدت برائے عقیدت نہیں ہے بلکہ وہ اُن کے فکر و فلسفہ سے کافی متاثر ہیں۔ اقبال کے اسی فکر و فلسفہ کے بارے میں انہوں نے "اقبال اینڈ دی انگلش رومانٹکس" "دی بلڈی ہورائزن — اے سٹیڈی آف اقبالس ریسپانس ٹو دی ویسٹ" اور "سرودِ سحر آفریں"

جیسی فکر انگیز اور معلوماتی کتابیں سپردِ قلم کیں۔

قاری سیف الدین نے "اقبال ــ عشقِ رسول کی دہلیز پر" لکھ کر اپنے آپ کو اس صف میں شامل کیا ہے۔

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی کچھ مدت تک اقبال انسٹی ٹیوٹ سرینگر کے ساتھ وابستہ رہے۔ اس دوران انہوں نے علامہ اقبال کے ایک ایرانی عقیدت مند ڈاکٹر علی شریعتی کی کتاب "علامہ اقبال مصلحِ قرنِ آخر" اور تاجکستان کے سابق صدر میر سید میر شکر کی کتاب "محمد اقبال" کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ ان کے علاوہ انہوں نے "اقبال انسٹی ٹیوٹ ــ منزل بہ منزل" میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کی خدمات کا جائزہ پیش کیا ہے جو کافی معلوماتی ہے۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ کے موجودہ ڈائریکٹر پروفیسر محمد امین اندرابی، محمد سید قادری سیار، پروفیسر مسعود حسین خان اور ڈاکٹر نصرت اندرابی نے بالترتیب مطالعۂ مکاتیب اقبال، اقبال اور نظریۂ خودی، اقبال کی نظری اور عملی شعریات اور پیامی شاعری: حالی، اکبر اور اقبال تصنیف کر کے اقبالیاتی ادب کے دامن میں وسعت اور ہمہ گیری پیدا کی۔

اس میں شک نہیں کہ جموں و کشمیر میں اقبالیاتی ادب سے متعلق ان کتابوں میں سے بعض برائے نام کتابیں ہیں جبکہ بعض اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے پورے اقبالیاتی ادب میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ابتدا میں اس امر کا ذکر ہو چکا ہے کہ اقبال پر مضمون لکھنے کی ابتدا محمد دین فوق نے کی اور تب سے اب تک اقبال کے بارے میں قومی اور بین الاقوامی سطح پر ہزاروں کی تعداد میں مضامین لکھے اور شائع ہوئے ہوں گے۔ جموں و کشمیر میں کالج میگزینوں اور عام اخباروں میں شائع ہونے والے مضامین کو شامل کئے بغیر اگر ہم اقبالیات

سے متعلق مضامین کا سرسری جائزہ لیں تو ایسے مضامین کی تعداد تقریباً آٹھ سو تک پہنچتی ہے اور مضمون نگاروں کی تعداد تین سو کے قریب بنتی ہے۔ ان میں سے آلِ احمد سرور، اکبر حیدری، جگن ناتھ آزاد اور حامدی کاشمیری نے بالترتیب چالیس، پچاس، اسی اور تیس کے قریب تحریر کئے ہیں۔ ان ادبا کے علاوہ مضمون نگاروں میں مندرجہ ذیل ادبا کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں:۔ اسلوب احمد انصاری، تارا چرن رستوگی، جعفر علی خان اثر، جاوید اقبال، خلیفہ عبدالحکیم، خواجہ غلام السیدین، رفیع الدین ہاشمی، سید محی الدین قادری زور، شکیل الرحمٰن، شمس الرحمٰن فاروقی، عالم خوندمیری، علی سردار جعفری، غلام رسول ملک، قمر رئیس، گوپی چند نارنگ، گیان چند، محمد دین تاثیر، محمد عمر نور الٰہی، محمد یوسف ٹینگ، مسعود حسین خان، مرغوب بانہالی، منظر اعظمی، میکش اکبرآبادی اور وحید اختر وغیرہ۔

یہاں اس بات کی وضاحت کر لینی بے جا نہ ہوگی کہ ان مضامین کی تعداد اردو میں پونے سات سو (۶۷۵)، انگریزی میں تیئس، پنجابی میں دس، ڈوگری کا آٹھ، سنسکرت میں تین، کشمیری کا میں چالیس اور ہندی میں پچیس کے قریب ہے۔ اور یہ کہ ان میں تبصرے، مراسلے، اداریئے، خبریں اور انٹرویو شامل نہیں ہیں۔ یہ مضامین شیرازہ، اقبالیات، بازیافت، ہماری زبان، آج کل اور تعمیر جیسے اہم جریدوں کے علاوہ کلچرل اکیڈمی، اقبال انسٹی ٹیوٹ اور اقبال اکیڈیمی سری نگر کی جانب سے شائع ہونے والے مختلف مجموعہ ہائے مقالات میں شاملِ اشاعت ہیں۔

اقبال کی شاعری کی آفاقیت، ہمہ گیری اور وسعت کے پیشِ نظر ریاست کی مختلف زبانوں میں اس کے جو تراجم کئے گئے ہیں اُن کا اجمالاً ذکر حسبِ ذیل ہے۔

اُردو: سلطان الحق شہیدی نے پیامِ مشرق کا اُردو ترجمہ کیا ہے جس کے بعض حصے شیرازہ اُردو میں شائع ہوئے ہیں لیکن پورا ترجمہ چھپ کر ابھی تک منظرِ عام پر

نہیں آیا ہے۔

کشمیری: کشمیری زباں میں عبدالستار عاصی نے شکوہ اور جواب شکوہ کا ترجمہ کیا تھا جو اب دستیاب نہیں ہے۔ غلام رسول کامگار کشتواڑی نے "رموزِ بے خودی" کا منظوم کشمیری ترجمہ ۱۳۷۹ھ میں شائع کیا ہے۔ اسی طرح ناز کولگامی اور غلام نبی گوہر نے "اسرارِ خودی" اور "گلشنِ رازِ جدید" کو کشمیری پیکر عطا کیا ہے۔ سید غلام قادر اندرابی نے بالِ جبریل، ضربِ کلیم، پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق، ارمغانِ حجاز، جاوید نامہ اور زبورِ عجم کا کشمیری ترجمہ کیا ہے جن میں سے بالِ جبریل، پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق اور جاوید نامہ کے تراجم زیورِ طبع آراستہ ہو چکے ہیں۔ سلطان الحق شہیدی نے اردو کی طرح کشمیری میں بھی پیامِ مشرق کا ترجمہ کیا ہے جو کلچرل اکیڈیمی کی طرف سے ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا ہے۔ امین کامل نے اقبالؔ کے منتخب کلام کا کشمیری ترجمہ "زٹہ ہلم (کرتوں کی آغوش)" کے عنوان سے کیا ہے جو کلچرل اکیڈیمی کی جانب سے ۱۹۸۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔ سید رسول پونپر نے بھی کلامِ اقبال کا انتخاب "پرتو" کے نام سے ترجمہ کر کے شائع کیا ہے۔

کلچرل اکیڈیمی نے ۱۹۷۷ء میں اقبالؔ صدی تقریبات کے دوران محمد امین کاملؔ کی ادارت میں شائع ہونے والے کشمیری شیرازہ کا خصوصی نمبر "اقبال نامہ" کے نام سے شائع کیا جس میں منتخب کلامِ اقبالؔ کا ترجمہ بھی شامل ہے۔ اقبال صدی تقریبات کے دوران کلچرل اکیڈیمی نے علامہ اقبالؔ کے اُردو اور فارسی کلام کی تمام اہم منظومات اور غزلیات کا کشمیری میں ترجمہ کروایا۔ اور "پرتوِ اقبال" کے نام سے ۴۰۰ صفحات کا ایک ضخیم مجموعہ شائع کیا۔

ھندی: ریاستی کلچرل اکیڈیمی نے اقبال صدی تقریبات کے دوران رمیش مہتہ کی ادارت میں شائع ہونے والے ہندی شیرازہ کا اقبال نمبر شائع کیا جس میں

اقبال کی منظومات، غزلیات اور قطعات کا انتخاب دیوناگری رسم الخط میں شامل اشاعت کیا اس کام کو اقبال انسٹی ٹیوٹ نے آگے بڑھایا اور ڈاکٹر چمن لال رینہ کا ترتیب دیا ہوا، ۲۲۰ صفحات کا اقبال کا دیہ درشن ۱۹۸۷ء میں شائع کیا۔ ظاہر ہے اس میں بھی اقبال کا منتخب کلام شامل ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ ہر غزل اور نظم کے آخر میں مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی دی گئی ہے۔

ڈوگری اور پنجابی :- کلچرل اکیڈیمی نے ڈوگری اور پنجابی میں شیرازہ کے اقبال نمبر بالترتیب اوم گوسوامی اور سردار امریک سنگھ کی ادارت میں شائع کئے جن میں کلامِ اقبال کے ڈوگری اور پنجابی تراجم شامل ہیں۔

سنسکرت :- اقبال کی شاعری کا سنسکرت زبان میں منظوم ترجمہ غالباً پہلی بار پنڈت موتی لال پُشکر نے "اقبال کا دیہ درشنم" کے عنوان سے کیا ہے۔ یہ ترجمہ انہوں نے اقبال صدی تقاریب کے دوران کیا تھا جو ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ کلامِ اقبال کا انتخاب انہوں نے مختلف آٹھ موضوعات کے تحت کیا ہے۔ حواشی میں مشکل الفاظ کے معانی اور ترجمہ شدہ ہر تخلیق کے آخر میں اُس کا لبِ لباب بھی دیا ہے۔

پہاڑی :- اقبال کی منظومات شکوہ اور جوابِ شکوہ کا منظوم ترجمہ پہاڑی زبان میں ہوا ہے جو شیرازہ پہاڑی میں شائع ہوا ہے۔

جموں و کشمیر میں اقبالیات کا جائزہ لیتے وقت اُن اداروں اور انجمنوں کی خدمات کا ذکر کرنا بھی لازمی ہے جن کی بدولت اقبالیاتی ادب معرضِ وجود میں آیا۔ اس ضمن میں سب سے پہلے جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز جسے کلچرل اکیڈیمی کہتے ہیں کی خدمات کا اعتراف اس لئے ضروری ہے کہ اس ادارے کی بدولت ریاست کے اطراف و اکناف میں اقبال کے افکار و نظریات کی ترویج اور تبلیغ ہوئی اور ان کے فکر و فن کے فیوض برکات کو دُور دُور تک پھیلانے کا کام ہوا۔ اس ادارے نے

اقبال کی شاعری اور اُن کے فکر و فلسفہ کی تفہیم و تفسیر اور تشہیر و تبلیغ میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ ۱۹۷۷ء میں ریاستی پیمانے پر اقبال صدی تقاریب کا انعقاد کلچرل اکیڈیمی کی وسیلے سے ہوا اور اس نے اس کام کی شروعات اسکولوں اور کالجوں میں اقبال کے مباحثوں سے کی اور آخر میں ضلعی اور ریاستی سطح پر انٹر اسکول اور انٹر کالج مباحثے منعقد ہوئے۔ طلبہ و طالبات کو نقد انعامات کے علاوہ اقبال شناسی کی اسناد بھی عطا کی گیئں۔ اس کام کو اور دلچسپ بنانے کی خاطر کلام اقبال پر مبنی موسیقی کے مقابلے منعقد کیے گئے اور بہترین فنکاروں کو انعامات سے نوازا گیا۔ اقبال کے پیغام کو عام کرنے کے لئے طرحی شاعروں کا اہتمام کیا گیا جن میں اُردو اور کشمیری شعرا نے حصہ لیا۔ جیسا کہ اس سے قبل ذکر ہوا ہے کہ اقبال کی اُردو اور فارسی کی تقریباً تمام شاہکار نظموں کے ریاست کی مختلف زبانوں میں تراجم کرائے گئے تاکہ اقبال کی شاعری سے دوسری زبانوں کے شعرا اور ادبا بھی واقفیت حاصل کر سکیں۔ یہی نہیں کشمیر سے متعلق اقبال کے مختلف اشعار پر مبنی مصوری کا مقابلہ بھی منعقد ہوا اور بہترین فن پاروں پر انعامات دیئے گئے جب کہ بقیہ فن پارے اکیڈیمی نے خرید لئے اور ان کی ایک نمائش بھی آراستہ کی گئی۔

کلام اقبال کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لینے کے لئے قومی سطح پر جموں اور کشمیر میں دو سیمناروں کا انعقاد ہوا جن میں پڑھے گئے مقالات شیرازہ اُردو کے پہلے اقبال نمبر (زیر ادارت پروفیسر رشید نازکیؔ) اور محفل اقبال نام کے ایک مجموعے میں شامل ہیں۔

اقبال صدی تقریبات کے دوران اکیڈیمی نے شیرازہ کے اُردو، کشمیری، ہندی، ڈوگری اور پنجابی زبانوں میں اقبال نمبر شائع کئے۔ اُردو شیرازہ گزشتہ دس بارہ برسوں سے اپریل کے شمارے کا اچھا خاصا حصہ "گوشۂ اقبال" کے نام سے شاعر مشرق کی نذر کرتا رہا ہے۔ گوشۂ اقبال میں اب تک کئی تحقیقی اور معلوماتی مضامین شائع ہو چکے



ؔ دیکھئے صفحہ نمبر ۲۶۰ پر

ہیں جن کی ادبی حلقوں میں کافی سراہنا کی گئی ہے۔ اقبال صدی کے دوران اکیڈیمی نے حامدی کاشمیری کی کتاب اقبال اور غالب شائع کرنے میں مالی معاونت بھی کی۔ مختصر یہ کہ کلچرل اکیڈیمی کی وجہ سے ریاست میں اقبال شناسی اور اقبال فہمی ایک نیا ماحول پیدا ہوا اور اقبال سے متعلق کئی سرکاری، نیم سرکاری اور ادبی انجمنوں نے کام کرنا شروع کیا۔ اس سلسلے میں شعبہ ہائے اردو جموں یونیورسٹی اور کشمیر یونیورسٹی کی خدمات بھی قابل ذکر ہیں۔ جہاں اقبال سے متعلق وقتاً فوقتاً توسیعی خطبات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ سرینگر نے اقبال کے بارے میں اپنے قیام سے لے کر اس وقت تک جس نوعیت کا تحقیقی اور تنقیدی کام کیا ہے اور جس طرح سے اس کے ارباب بست وکشاد اس عظیم کام کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں وہ قابلِ ستائش ہے۔ اس انسٹی ٹیوٹ کا آغاز پروفیسر آل احمد سرور کے ہاتھوں ہوا اور اس وقت پروفیسر محمد امین اندرابی اس کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہیں۔ یہ ادارہ خالص علمی اور تحقیقی ہے جہاں اس وقت تک سولہ ایم فل اور نو پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ اقبال کے بارے میں یہ ادارہ مختلف موضوعات پر درجن سے زیادہ سیمنار منعقد کرا چکا ہے اور تقریباً ۱۵ ماہرینِ اقبالیات نے توسیعی خطبات پیش کئے ہیں۔ اس کی مطبوعات کی تعداد چالیس تک پہنچ چکی ہے۔ اس ادارے کا کتب خانہ اقبال سے متعلق برصغیر کا اہم کتب خانہ ہے جہاں تقریباً چھ ہزار کتب اور رسائل موجود ہیں۔ اقبال کا عرفان عام کرنے، اقبال کے سلسلے میں ماضی کے تجزیئے، حال کی تفہیم اور مستقبل کے منصوبوں کو ان کی فکر اور اُن کے فن کی روشنی میں عملی کام کرنے کی جانب اس ادارے کی کاوشیں قابلِ قدر ہیں۔ ریاست میں اقبالیاتی ادب کی تخلیق میں اس کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔

اس جائزے میں اقبال اکیڈیمی سرینگر کا ذکر بھی ضروری ہے جو اقبال کی حیات، شاعری، اُنکے پیغام اور فکر و فلسفہ کو عوام و خواص تک پہنچانے کا کام انجام

دے رہی ہے۔ اقبال کے سلسلے میں ریاست میں یہ واحد غیر سرکاری ادارہ ہے جو گزشتہ دس برسوں سے سرگرم عمل ہے اس کے موجودہ صدر اقبال کے شیدائی پروفیسر غلام رسول اور سیکریٹری بشیر احمد نحوی ہیں۔ اس ادارے نے اپنے محدود مالی وسائل کے باوجود اقبال کے بارے میں سیمناروں اور محفلوں کے انعقاد، توسیعی خطبات کے اہتمام اور اقبال سے متعلق مطبوعات پیش کرنے میں بڑی ہمت اور حوصلے سے کام لیا ہے جو اُن کی اقبال دوستی کا بین ثبوت ہے۔

میری بات نامکمل رہے گی اگر میں اقبال نمائش کا ذکر نہ کروں جو یوں تو کئی اداروں کے اشتراک سے ترتیب پائی تھی مگر اس کے پس پردہ صرف پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی شخصیت کارفرما تھی۔ اس نمائش کا انعقاد ۲۷ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو سرینگر میں ہوا تھا۔ جسے اقبال اور اقبالیات سے متعلق ۶۵ تصاویر سے آراستہ کیا گیا تھا اور بعد میں جس کی نمائش ہندوستان کے تقریباً تمام بڑے علمی اور ادبی مراکز میں ہوئی تھی۔ آزاد کا ترتیب دیا ہوا "مرقع اقبال" اسی نمائش کی تصاویر پر مشتمل ہے۔

ریاست میں اقبالیات کو ریڈیو، ٹی وی اور محکمۂ اطلاعات کی بدولت بھی کافی فروغ ملا ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی کے پروگراموں میں اقبال اور اقبال کے تعلق سے گاہ بگاہ ادبی پروگرام منعقد ہوتے ہیں جو ان دو اداروں کے وسیلے سے عوام الناس تک پہنچتے ہیں۔ محکمۂ اطلاعات کا جریدہ تعمیر بھی وقتاً فوقتاً اقبال سے متعلق مقالات سے مزین نظر آتا ہے۔ ان کے علاوہ ریاست میں دوسری درجنوں انجمنیں اپنے اپنے طور پر اقبال کی شاعری، فکر اور ان کے پیغام کو عام کرنے میں مصروف ہیں۔

جموں و کشمیر میں اقبالیات کے اس جائزے سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں اقبال کے تعلق سے قابلِ ذکر تحقیقی اور تنقیدی کام ہوا ہے مگر اسکا بہت سا

حصہ یک رُخا ہی ہے۔ اس لئے یہ اُمید کی جاسکتی ہے کہ اقبال کی مدح اور قدح میں اختیار کئے ہوئے یک رخے پن کو ترک کرکے ان کا مطالعہ نئے تناظرات میں کیا جائے اور ان کی شاعری کی شعریت، آفاقیت، عظمت اور اُن کے فلسفے کے بنیادی پہلوؤں اور اُن کے مضمرات پر ازسرِ نو غور کیا جائے۔

○

---

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۲۵۰ سے

اب تک ڈاکٹر حیدری کی اقبال پر کچھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں "اقبال کی صحت زبان" اور "اقبال اور معاصرین" قابل ذکر ہیں ● ——— (ادارہ)

صفحہ نمبر ۲۵۷ سے ۸/۳۰×۲۰ سائز کا یہ خصوصی نمبر پروفیسر رشید نازکی کی ادارت میں شائع ہوا تھا۔ اس کے چند سال بعد اقبال نمبر بار دوم محمد احمد اندرابی کی ادارت میں ۸/۲۲×۱۸ سائز میں شائع کیا گیا جس میں پہلے خصوصی نمبر میں شامل کئی مضامین شامل اشاعت نہیں کئے گئے۔ بلکہ ان کی جگہ کئی تحقیقی اور پرمغز مضامین کا اضافہ کیا گیا۔ اسی طرح تصاویر وغیرہ کا بھی ازسرنو انتخاب کرکے اسے زیادہ بامعنی بنانے کی کوشش کی گئی۔

○

محمد اشرف ٹاک*

# کشمیر میں خطاطی کا احیائے نو

## ——— ۱۹۴۷ء کے بعد

۱۹۴۷ء کے بعد جموں و کشمیر میں خطاطی کی بات کرنے سے قبل یہ امر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر میں خطاطی کی قدیم روایات کا جائزہ پیش کیا جائے تاکہ اس کے پسِ منظر میں ہمیں ریاست میں خطاطی کی موجودہ صورتِ حال کا تجزیہ کرنے میں مدد مل سکے۔

تاریخ خطاطی کے سرکردہ محقق سید امیر حسن نورانی رقمطراز ہیں کہ جس طرح شعر و سخن سامع نواز اور فردوس گوش ہے اسی طرح خوشنویسی باصرہ نواز اور جنت نگاہ ہے۔ دونوں فن اپنی زیبائی اور دلربائی کے باعث علمی دنیا کی رونق اور ادبی محفلوں کی زینت کو دوبالا کرتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں دونوں فن معزز و مقبول ہیں۔ جس طرح شاعر اپنی تخلیق سے ممتاز تھے اسی طرح خوشنویس فخر کے ساتھ اپنے نام کے آگے کاتب لکھتے تھے۔ بلند پایہ شعراء ملک الشعراء کا خطاب پاتے تو خطاط فخر الکتاب کے لقب سے نوازے جاتے۔

محققین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ علمی دنیا کی ستم ظریفی ہے کہ شاعروں کے تذکرے ہر دور میں مرتب کئے گئے۔ اُن کے نام اور کلام کو زندہ

* 221/2B۔ بمنہ ہاؤسنگ کالونی۔ سرینگر۔ ۱۹۰۰۱۰

رکھا گیا لیکن خطاطی کی مستند اور مبسوط تاریخ مرتب کرنے کی طرف بہت کم توجہ دی گئی۔ نتیجہ یہ ہے خطاطی اور خطاطی کے بارے میں مواد بکھرا پڑا ہے۔ آج ہمارے پاس اس فن کے بلند پایہ فنکاروں کے حالات اور کارناموں سے واقف ہونے کے بہت کم مستند ذرائع ہیں۔ اردو اور فارسی میں خطاطوں کے کئی تذکرے ضرور موجود ہیں لیکن کشمیر کی خطاطی پر بہت ہی کم لکھا گیا ہے اور یہ سرزمین جو خطاطی کا بہت بڑا اور منفرد مرکز تسلیم کی گئی ہے پر یہاں کے باکمال خطاطوں کے حالات اور کارنامے پردۂ اخفا میں ہیں جن کے فن کا لوہا پوری دنیائے خطاطی نے مانا ہے۔

کشمیر صدیوں سے علم و دانش اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں لکھنے پڑھنے کی روایات اُس وقت ترقی پا چکی تھیں جب کہ دنیا کی بہت سی قوموں میں اس کا تصوّر بھی نہ تھا۔ ویدک دور ہی سے کشمیریوں نے بھوج پتر پر لکھنے میں فنکاری کا آغاز کیا تھا۔ بُدھ مت کے ورود کے ساتھ کشمیر اس مذہب کا بہت بڑا مرکز بنا۔ مہاراجہ اشوک نے سرینگر شہر بسایا۔ کنشک نے پہلی صدی عیسوی میں سرینگر میں بودھ عالموں کی بین الاقوامی کانفرنس کروائی۔ اس کانفرنس کے فیصلے تانبے کے تختوں پر کندہ کروائے گئے اور اُنہیں کشمیر ہی میں کسی نا معلوم مقام پر دفن کیا گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کشمیریوں نے پہلی صدی عیسوی سے قبل ہی خوشنویسی اور کتبہ سازی کا فن سیکھا تھا۔ اس بات کے ثبوت میں کہ کشمیر میں خوشنویسی کی روایات بہت ہی قدیم ہیں اور دنیا کی بہت سی مہذب قوموں کی طرح کشمیریوں کو بھی خوشنویسی کا فن بہت پہلے معلوم تھا۔

چھٹی صدی عیسوی میں ظہورِ اسلام کے بعد اسلامی خطاطی کی داغ بیل پڑی۔ یہ محض روایتی خوشنویسی نہیں بلکہ مصوّری اور نقاشی

کا ہم پلہ تھی۔ خطِ حیری، سامی اور اس کے بعد شہرۂ آفاق خطِ کوفی کئی صدیوں
تک مستعمل رہے۔ اِس کے بعد خطِ نسخ کا چلن ہوا۔ یہ خط بہت جلد مقبولِ عام
ہوا، کیوں کہ اس خط میں ایسا لوچ اور ایسی کشش تھی کہ رفتہ رفتہ قدیم خطوط
متروک ہو گئے۔ خطِ نسخ سے متعدد خوشنما طرزِ تحریر معرضِ وجود میں آئے
اس طرح یہ خط دلکش نقوش کی بدولت زیبائش کا مرکز بنا۔ حتیٰ کہ لوگ آرائش
کے لئے عربی زبان کے الفاظ اور جملے، نسخ میں اپنے لباسوں اور ہتھیاروں پر
کندہ کراتے تھے۔ خطِ نسخ کو اصل عروج اُس وقت حاصل ہوا جب ۳۲۰ھ میں
اِبنِ مقلہ نے باقاعدہ خط کی بنیاد ڈالی اور اس خط کو خوشنما بنانے کے لئے چھ
طرزیں ایجاد کیں۔ جو اس طرح ہیں۔ توقیع، محقق، ثلث، نسخ، رقاع اور
ریحان۔ مسلمان جہاں جہاں گئے خطاطی اور خوشنویسی کی شاندار روایتیں اپنے
ہمراہ لے گئے۔ خطاطی کا ایک اہم پڑاو ایران تھا۔ جب ایران پر عربوں کا اقتدار
قایم ہوا۔ اُس وقت وہاں فارسی زبان رائج تھی جو قدیم پہلوی زبان کی ترقی
یافتہ شکل ہے۔ قدیم پہلوی زبان کا رسم الخط جو بھی رہا ہو لیکن فارسی زبان کیلئے
عربی رسم الخط کا استعمال کیا گیا۔ ایرانیوں کے ذوقِ جمال اور اُن کی نفاست
پسندی نے انہیں اس بات کے لئے آمادہ کیا کہ عربی کے خطِ نسخ میں رد و بدل کر کے
کوئی نیا خوبصورت خط ایجاد کیا جائے کیوں کہ خطِ نسخ لکھنے میں قلم ہر لفظ اور حرف
یکساں رہتا ہے۔ نقاشی اور مصوری کے شیدائیوں کو یہ ناموزونی ناہمواری ایک
آنکھ نہ بھاتی تھی۔ چوتھی صدی ہجری کے وسط میں حسن بن علی فارسی نے
توقیع اور رقاع کی آمیزش سے ایک نیا خط ایجاد کیا جس کا نام تعلیق رکھا گیا
ایرانیوں نے تعلیق پر ہی قناعت نہیں کی بلکہ اور بہتر خط کے اختراع کی کاوشیں
جاری رکھیں۔ یہاں تک کہ امیر تیمور کے عہد میں میر علی تبریزی نے نسخ اور تعلیق

کی آمیزش سے ایک اور خط ایجاد کیا جو حسن و نفاست میں سابقہ خطوں سے زیادہ مقبول ہوا۔ اس کا نام نستعلیق ہے۔ ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں اس بات سے اختلاف کیا کہ خط نستعلیق میر علی تبریزی نے ایجاد کیا۔ ابوالفضل کا کہنا ہے کہ امیر تیمور سے قبل یہ خط معرضِ وجود میں آ چکا تھا۔ اگر ابوالفضل کی تحقیق کو درست بھی تسلیم کیا جائے تب بھی اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ میر علی تبریزی نے خطِ نستعلیق کو باضابطہ شکل دی۔ اس کے قواعد و ضوابط مرتب کئے۔ نستعلیق کو مزید ترقی دینے اور اس کو مزید خوبصورت بنانے میں میر علی تبریزی کے فرزند میر عبداللہ تبریزی نے بہت محنت کی۔

ظہورِ اسلام کے فوراً بعد عرب باشندے ہندوستان پہنچ گئے اور اس بات کی بھی شہادتیں ہیں کہ مسلمانوں کی اس وقت سے قبل کشمیر میں آمد و رفت تھی جس کا ہم رسمی طور تعین کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ اسلامی علوم اور فنون کا کشمیر آنا لازمی امر تھا۔

چودھویں صدی عیسوی میں جب رینچن نے اپنا نام سلطان صدرالدین رکھ کر حضرت شرف الدین عبدالرحمان بلبلؒ کے ہاتھوں اسلام قبول کیا تو کشمیر میں اسلامی حکومت کی داغ بیل پڑ گئی۔ وسطِ ایشیا کے اسلامی مُبلغین کی پہلے ہی سے کسی نہ کسی طور کشمیر میں آمد و رفت تھی۔ حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ اور دیگر مبلغین اُن علاقوں سے آئے تھے جو اس وقت اسلامی خطاطی کے بڑے بڑے مراکز تھے۔ اس طرح سے خطاطی باضابطہ کشمیر پہنچ گئی۔ حضرت امیر کبیرؒ جب کشمیر آئے تو اُن کے ساتھ اُن کا ذاتی کُتب خانہ بھی تھا۔ سید محمد کاظم حضرتِ امیر کبیرؒ کے ذاتی کُتب خانے کا نگران تھا۔ یہ خدا دوست شخص عالم و فاضل ہونے کے علاوہ خطاط بھی تھا۔ حضرتِ امیر کبیرؒ کی ایماء پر ہی سلطان

قطب الدین نے اپنے نام پر بسائے شہر قطب الدین پورہ میں دار العلوم قایم کروایا۔ مذکورہ دار العلوم سکھ دور تک قایم تھا اور فنِ خوشنویسی کی تربیت پانے والوں کی رہنمائی کرتا تھا۔

سلطان زین العابدین (۱۴۲۰۔۷۰ء) کا زمانہ کشمیر میں مختلف علوم و فنون کی ترقی کا دور تسلیم کیا جاتا ہے۔ انہوں نے کشمیر سے لوگوں کو مختلف علوم و فنون کی تربیت حاصل کرنے کے لئے وسط ایشیا بھیج دیا۔ بڈشاہ نے نوشہرہ میں دار العلوم اور دار الترجمہ قایم کروایا جہاں مختلف کتابوں کی تصنیف و تالیف کے علاوہ سنسکرت کتابوں کے ترجمے بھی کئے جاتے تھے۔ اس دور کے خطاطوں میں ملا جمیل احمد حیدر، ابراہیم کشمیری اور یعقوب وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ سلطان سرکردہ خطاطوں کو گناتی (اہلِ قلم) کے خطاب سے سرفراز کرتا۔ بڈشاہ خوشنویسی کا اس قدر دلدادہ تھا کہ جب اس کے درباری کاتب بابا عثمان اوچپ گنائی کا انتقال ہوا تو سلطان بذاتِ خود اُس کے جنازے میں شامل ہوا اور اُسے مزارِ سلاطین میں سپردِ خاک کیا گیا۔ یہ مزار صرف شاہی خاندان کے لئے مخصوص تھا۔ سنسکرت اور شارادا خوشخط لکھنے کے لئے اسلامی خطاطی کے تجربات سے استفادہ کیا گیا۔ شاہمیری دور کے اکثر کتبے عربی اور فارسی کے ساتھ ساتھ شاردا اور سنسکرت میں بھی لکھے گئے۔ جن میں سے کچھ اس وقت بھی موجود ہیں۔

شاہمیریوں کے بعد چکوں نے بھی کھلے دل سے اس فن کی سرپرستی کی۔ اکثر چک سلاطین خود بھی خوشنویس تھے۔ کشمیر کے آخری خود مختار بادشاہ یوسف شاہ چک کی خطاطی کی تعریف بو حنیفہ ثانی حضرت بابا داؤد خاکیؒ نے بھی اپنی ایک تصنیف میں کی ہے۔ حضرت بابا داؤد خاکیؒ خود بھی خوشنویس تھے جامع الکمالات حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ بھی ایک سرکردہ خطاط تھے۔

جب کشمیر مغلوں کے زیرِ نگین آگیا تو اس وقت یہاں خطاطی کی روایات پختہ ہو چکی تھیں۔ مغل علوم و فنون کے قدر دان تھے۔ دو تہذیبوں کے میل جول سے فن کے نئے معیار وجود میں آگئے جس کے دایرے میں خطاطی بھی آگئی۔ ماہرین کی تحقیق ہے کہ انسان کی طرح فن بھی اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ فن کا ماخذ اور سرچشمہ کہیں بھی رہا ہو لیکن جب وہ کسی نئے ماحول کو پہنچتا ہے تو اس علاقے کی جغرافیائی خصوصیات، وہاں کے باشندوں کا مزاج، ان کی تہذیب و ثقافت اور دوسرے عناصر اس پر گہرا اثر ڈالتے ہیں اور اس کی نشو و نما ایک خاص انداز سے ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کا رنگ و روپ اور ظاہری شکل بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ خطاطی بھی جب اپنے ماحول سے نکل کر دوسرے علاقوں تک پہنچی تو اس نے مختلف رنگ اختیار کئے۔ اس کی مختلف اور دلچسپ شکلیں نمودار ہوئیں۔ ان سب میں نمایاں فرق دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہی حال کشمیر پر بھی صادق آتا ہے جب یہاں کئی تہذیبوں کا سنگم ہوا تو اور فنون کے ساتھ خطاطی نے بھی ایک نیا اسلوب اختیار کیا جو "کشمیری قلم" یا "طرحِ کشمیری" کے نام سے موسوم ہے۔ کشمیری خطاطوں کی شہرت ہندوستان سے نکل کر ایران اور وسط ایشیا کے ممالک تک پہنچ گئی۔ کشمیری خطاطوں نے اس فن کو نکھارنے کے لئے ایسے اُستادانہ کمالات دکھائے جنکو دیکھ کر ایرانی بھی انگشت بدنداں رہ گئے۔ مغل دور کے سرکردہ خطاطوں میں محمد حسین زریں قلم، مُلا محمد مراد شیریں قلم، مُلا محمد محسن، مرشد الکاتب، میر حسن، احمد ابن ابراہیم، میر سید افضل اندرابی، شاہ محمد صفا، علی چین کشمیری، بابا صالح، مُلا حبیب گنائی مُلا عبداللہ، عبدالوہاب، علی نسب، سید عنایت اللہ، میر کمال الدین اندرابی خواجہ محمد نقشبندی، محمد اسلم ٹوپیگرو، محمد اسماعیل، میر محمد اشرف، محمد اعظم مانجھی

محمد امین دانا، میر محمد باقر، محمد رضا، مشتاق، میر محمد معروف، مرزا بیگ ہدایت اللہ اور ابو البرکات شامل ہیں۔

مغلوں کی حکمرانی ختم ہو جانے کے بعد اگرچہ کشمیر میں خطاطی کا سنہرا دور اپنے اختتام کو آپہنچا تھا لیکن اس کے باوجود کشمیر میں خطاطی نے اپنا سفر برابر جاری رکھا۔ افغان دور میں کشمیر میں ظلم وستم کا بازار گرم تھا۔ خطاطی کی شمع کو فروزاں رکھنے کی خاطر کشمیری خطاط افغان دربار سے وابستہ ہو گئے۔ افغان دور کے نامور کشمیری خطاطوں میں محمد ہاشم کشمیری، محمد تقی، عبد الصبور، محمد یوسف کشمیری، عبدالکریم قادری، حافظ عبدالوہاب، پنڈت بیربل کاچرو، پنڈت دیارام خوشدل سید جمال الدین، بابا عبداللہ مخدومی، ملا نافع، فاخر اور مرزا مجرم وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

افغانوں کے بعد کشمیر سکھوں کے قبضے میں آگیا اور اس کے بعد یہاں ڈوگرہ راج قایم ہوا۔ سرکاری سرپرستی نہ ہونے کی وجہ سے یہ فن بتدریج روبہ زوال ہوتا گیا۔ اس کے باوجود اس دور کے ممتاز خطاطوں میں ملا حیدر، میر محی الدین مہدی، محمد الرسول، اکمل احمد علی، محمد یوسف ٹوپیگرو اور پنڈت دیارام شاد خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

مہاراجہ پرتاپ کے عہدِ حکومت میں فارسی کی جگہ اردو کو سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں جب ڈوگرہ راج کا خاتمہ ہوا تو اس حقیقت کو تسلیم کیا گیا اور آئین میں اس کی صراحت کی گئی اور اردو کو ریاست میں اس کا حق دلوانے کی کوششیں کی گئیں۔ پورے بھارت میں جموں کشمیر ایسی واحد ریاست ہے جس کی سرکاری زبان اردو ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور

لکھتے ہیں کہ جموں و کشمیر جغرافیائی اعتبار سے وسط ایشیا کے قریب ہے بلکہ اسی عمومی خطے میں آتی ہے جو افغانستان، ازبکستان اور تاجکستان تک پھیلا ہوا ہے۔ دوسرے علاقوں کے مقابلے میں اس پر وسط ایشیائی اور مغربی ایشیائی اثرات زیادہ ہیں۔ یہ اثرات اُردو اور کشمیری میں خاص طور سے مشترک ہیں لیکن شخصی راج میں ان چیزوں کے بارے میں حکام کا اپنا محدود نکتہ نظر تھا۔ خطاطی تو دُور کی چیز تھی۔ دیگر فنون اور ہنروں کو اس درجہ ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا کہ کشمیری کاریگر اپنے ہاتھوں کی انگلیاں کاٹنے پر مجبور ہوتے۔ اس دور میں خطاطی سمٹتے سمٹتے چند علاقوں کے کچھ گھرانوں تک محدود ہو کے رہ گئی تھی مثلاً خانیار، جامع مسجد، رعناواری اور اس کے گرد و نواح میں رہائش پذیر بعض گھرانے۔ ڈوگرہ دور کے آخری ایام میں جو خطاط اور خوشنویس فن کاری کی اس علم کو بلند رکھے ہوئے تھے اُن میں محمد سیف الدین بنڈت، محمد سعید قادری، قاضی عزیز الدین عاشق کاشمیری، شاعرِ کشمیر پیرزادہ غلام احمد مہجور اور منشی محمد حسن کے نام مشہور ہیں۔

۱۹۴۷ء میں خطاطی اور خوشنویسی قریب المعدوم تھی۔ قدر دانوں کی کمی اور عدم توجہی اپنے عروج پر تھی۔ چھاپہ خانوں کے بڑھتے رواج اور اُردو اخبارات کی بڑھتی ہوئی اشاعت کی وجہ سے اگرچہ کاتبوں کی مانگ بڑھی تھی لیکن خطاطی فن کے درجے سے نیچے گر کر بازاری کتابت کی چیز بن کے رہ گئی۔ زود نویسی عام ہو گئی۔ فن کے معیار زیرِ نظر رکھنے کے بجائے صرف مالی منفعت پر زور دیا جانے لگا۔ وہ روایتیں ختم ہوتی ہوئی نظر آئیں جن کو دنیائے خطاطی میں کشمیری قلم، "اسلوبِ کشمیر" یا "طرحِ کشمیری" کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اساتذہ عنقا ہو گئے یا ان کی کوئی وقعت نہ رہی۔ ان ہی ایام میں سری نگر اور

جموں سے بہت سے اخبارات جاری کئے گئے۔ سرکاری، نیم سرکاری اور نجی طور مختلف موضوعات پر کتابیں تیار کی گئیں لیکن اچھے خوشنویسوں کا کال پڑ گیا۔ اکثر کتابوں کی کتابت ریاست سے باہر کروائی جاتی تھی۔ اخباروں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے بعض اداروں جن میں ریاستی کلچرل اکادمی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے نے ۱۹۵۹ء میں تعلیم گاہ خوشنویسی قائم کی۔ اس کے لئے اُس وقت کے ایک سرکردہ خوشنویس حسام الدین خانیاری کو اُستاد مقرر کیا گیا یہ سلسلہ کئی برس چلا۔ مذکورہ تربیت گاہ سے کئی خطاط فارغ الاصلاح کئے گئے اور ایک اُمید سی بندھ گئی لیکن بعد میں اس تربیت گاہ کو بند کر دیا گیا اور کاتبوں کی کمی کا معاملہ پھر شدت سے سر اٹھانے لگا۔ اس پُر آشوب دور میں جن حضرات نے فنِ خطاطی اور خوشنویسی کی آبیاری کی اُن میں درج ذیل قابلِ ذکر ہیں۔

میرزا کمال الدین شیدا :- ایک باکمال شاعر، ادیب اُستاد اور خطاط تھے۔ انہوں نے بڑی محنت سے کشمیر کی قدیم خطاطی کے بہت سے نمونے جمع کئے اور یہ گنج گرانمایہ اِس وقت اُن کے وارثوں کے پاس محفوظ ہے۔ خود اُن کے لکھے ہوئے خطاطی کے کئی نمونے قابلِ دید اور قابلِ تعریف ہیں۔

سیف الدین پنڈت :- آپ ایک ممتاز عالم، تاریخ دان اور خوشنویسی کے رمز شناسوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اُن کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطاطی کے بہت سے نمونے اُن کے فرزند محمد امین پنڈت کے پاس موجود ہیں۔ آپ خطِ نسخ اور نستعلیق، دونوں پر دسترس رکھتے تھے۔

غلام رسول بٹ (علمگری بازار) آپ نسخ و نستعلیق کے اُستاد تھے۔ اُن کے خط میں ایک خاص پختگی اور روانی پائی جاتی تھی۔ آپ خطاطی کی باریکیوں پر نظر رکھتے تھے۔ آپ نے سو سے زاید کتابوں کی کتابت کی ہے۔ آپ ریاستی

محکمہ اطلاعات میں بطور خوشنویس کام کرتے تھے۔ آپ کی مہارت کا اعتراف سرکردہ ماہرینِ فن نے کیا ہے۔ بٹ صاحب کے فرزند بشیر احمد نے فنِ کتابت اپنے والد سے سیکھا۔ کمال یہ ہے کہ باپ بیٹے کے خط میں بہت کم فرق ہے۔ بشیر صاحب بھی محکمہ اطلاعات سے وابستہ ہیں۔

غلام حسن وفائی :- وفائی صاحب اس خاندان کے چشم و چراغ تھے جن کی کئی پیڑھیاں فنِ خطاطی کی خدمت میں گزری ہیں۔ تمام عمر فنِ خطاطی سے وابستہ رہے اور بہت سے شاگردوں کو اس فن سے روشناس کرایا۔ آپ گورنمنٹ پریس سری نگر سے بطور ہیڈ کاتب ریٹائر ہوئے اور ریٹائرمنٹ کے بعد بھی مشق کا سلسلہ جاری رکھا۔

غلام حسن رضوی :- آپ پیشے سے ایک اُستاد تھے اور خطاطی کا شوق بچپن ہی سے رکھتے تھے۔ عمر بھر مشق کرتے رہے اور عمدہ خوشنویسی میں شہرت حاصل کر لی۔

پیر محمد افضل مخدومی :- ایک ادیب اور صحافی تھے۔ ساتھ ہی خطاطی کا شوق بھی رکھتے تھے اور اس فن میں اُستادانہ مہارت حاصل کی تھی۔ ۱۹۷۴ء میں جب کلچرل اکادمی نے تعلیم گاہ خوشنویسی کا قیام عمل میں لایا تو آپ کو اس تربیت گاہ کا سربراہ بنایا گیا۔ آپ نے بہت سے طالبانِ فن کو اس فن کی تربیت دی۔ آپ خطاطی کی تاریخ پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔

کامگار کشتواڑی :- ایک عالم و فاضل ہونے کے علاوہ خطِ نسخ اور نستعلیق میں ان کی مہارت مسلّم ہے۔ آرائشی خطوط سے بھی آپ کو دلچسپی تھی اور نقش و نگار بھی خوبصورت بناتے تھے۔ خطاطی شوقیہ کرتے اور اسے ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ اُن کی خطاطی کے کئی نمونے اُن کے وارثوں کے پاس محفوظ ہیں جن کا جائزہ لیکر اُن کی اُستادانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

کشتواڑ کی جامع مسجد کے در و دیواروں پر آپ کی خطاطی کے کئی نادر نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔

حسام الدین وفائی:۔ تقریباً نصف صدی تک فنِ خوشنویسی کی آبیاری کرتے رہے۔ آپ کے خاندان میں خوشنویسی کا فن کئی صدیوں سے چلا آرہا ہے اور آپ نے اس روایت کو ذوق و شوق سے آگے بڑھایا۔ آپ کے فرزندان شریف الدین وفائی اور محمد سلیم نصیر نے یہ فن اپنے والد سے ہی حاصل کیا۔ شریف صاحب ریاستی محکمہ تحقیق و اشاعت میں بطور خوشنویس کام کرتے تھے جبکہ سلیم صاحب پیشے سے انجینئر ہیں۔ حسام صاحب کا زورِ قلم اپنی مثال آپ تھا۔ آپ خاص طرز کے نکاح نامے، دعوت نامے اور دیگر دستاویزات تیار کرنے میں خاص مہارت رکھتے تھے۔

غلام نبی مہاجن:۔ روشِ لاہوری میں غلام نبی مہاجن اپنا ایک منفرد مقام رکھتے تھے۔ اُن کی لکھی ہوئی کتابوں سے اُن کی خوبیوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اُنہوں نے آرائشی خطاطی میں کئی نئے تجربات کئے جو بہت مقبول ہوئے۔ تقریباً نصف صدی تک خوشنویسی اور کتابت سے وابستہ ہے۔

پنڈت کاشی ناتھ رازداں:۔ پنڈت جی کا شمار اپنے وقت کے سرکردہ خوشنویسوں میں ہوتا تھا۔ آپ گورنمنٹ پریس سرینگر سے بطور ہیڈ کاتب ریٹائر ہوئے۔ انتہائی شریف النفس، ملنسار، متوکل اور وعدہ وفا شخص ہیں۔ آپ لاہوری طرز پر نستعلیق لکھتے اور اس میں خاص شان پیدا کرلی تھی۔ آپ نے کلچرل اکادمی کے زیرِ اہتمام تعلیم گاہ خوشنویسی میں بطور اُستاد اپنے فرائض انجام دیئے۔ اُن کے شاگردوں کا حلقہ کافی وسیع ہے۔

محمد صدیق:۔ آپ گزشتہ تقریباً پچیس برسوں سے تعلیم گاہِ خوشنویسی میں بطور اُستاد اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ صدیق صاحب کی اپنی انفرادی

شناخت ہے۔ نستعلیق دہلوی طرز میں لکھتے ہیں۔ فی الوقت سرکردہ خوشنویسوں میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ سے بہت سے لوگوں نے خوشنویسی کا فن حاصل کیا ہے۔ آپ نے درجنوں کتابوں کی کتابت کی ہے اور مختلف اخباروں میں فن کا جادو جگایا۔

**سیّد شبیر احمد رضوی:-** خطاطی کے میدان میں کارہائے نمایاں دکھانے پر شبیر صاحب کو زرین قلم ثانی کا نام بھی دیا گیا ہے۔ شبیر صاحب دورِ حاضر کے تمام خطاطوں میں بلند مقام رکھتے تھے۔ اُنہوں نے مروجہ خطوط کے علاوہ جدید خطوط میں اپنی مہارت کے جوہر دکھائے ہیں۔ شبیر صاحب نے خطاطی کی ابتدائی تربیت اپنے والد سید غلام حسن رضوی سے حاصل کی اور اُن کی زیر نگرانی عرصہ دراز تک مشق جاری رکھی۔ اُن کے خط میں متانت، لوچ، رنگارنگی اور شان پائی جاتی تھی اُن کی صلاحتیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی تھی۔ افسوس کہ کشمیر کا یہ مایہ ناز خطاط سرطان کے مہلک مرض میں مبتلا ہوکر عینِ جوانی کے عالم میں اِس عالمِ ناپائیدار سے کوچ کر گیا۔

**محمد یوسف مسکین:-** مسکین صاحب ریاستی کلچرل اکادمی میں بطورِ ہیڈ کاتب اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ کئی خطوط کے ماہر ہیں۔ آپ نے خطاطی کے کل ہند مقابلوں میں کئی مرتبہ امتیاز حاصل کیا ہے۔ خطاطی کے علاوہ آپ صحافت ادب، اور سٹیج سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔

مذکورہ بالا خطاط حضرات کے علاوہ جن دیگر خوشنویسوں نے اس عرصے کے دوران فنِ خطاطی کی آبیاری کی اُن میں موتی لال ریبہ، غلام رسول عارف۔ پیر سلام الدین، محمد امین واجدی، ہلکھی رام، ولی محمد میر، غلام محمد مخدومی، فاضل کاشمیری، غلام محمد ڈار، کے ایل گپتا، قاضی نظام الدین، قاضی محمد حسین، نصیر الدین خانیاری، قاضی عبد الروف، سید بہار شاہ، سید محمد افضل اندرابی، اسد اللہ خان،

محمد خلیل، غلام قادر، عبدالحمید بٹ اور پنڈت لسہ کول وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

۱۹۰۰ء کے بعد خطاطی کی کمزور ہوتی روایات کو نئی خلا بخشنے خوشنویسوں اور کاتبوں کی کمی پورا کرنے کے لئے سرکاری سطح پر بھی کوششوں کا آغاز کیا گیا۔ چنانچہ ۱۹۷۴ء میں ریاستی کلچرل اکادمی نے ٹیگور ہال سری نگر میں تعلیم گاہِ خوشنویسی قایم کی۔ کشمیر میں خطاطی اور کتابت کو ازسرِنو فروغ دینے میں یہ تربیت گاہ سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ستر کی دہائی میں کشمیر میں گنے چنے خطاط اور خوشنویس ہی نظر آتے تھے۔ حتیٰ کہ مقامی پریس اور اخباروں کی ضروریات کے لئے جہاں مشکل سے کاتب دستیاب تھے، وہاں اس وقت تعلیم گاہِ خوشنویسی سے فارغ اصلاح لاتعداد خطاط، خوشنویس اور کاتب اپنے پیشہ ورانہ فرائض انجام دے رہے ہیں۔ آہستہ آہستہ کشمیری خطاطی کی روایات میں نئی جان پڑ رہی ہے۔ اور یہ پھر اس قابل ہو رہی ہے کہ موجودہ دور کے خطاطی کے کسی بھی مرکز کا جواب پیش کر سکے۔ تعلیم گاہ خوشنویسی سے گذشتہ دو دہائیوں سے زاید عرصے کے دوران جو لاتعداد خوشنویس فارغ الاصلاح ہو چکے ہیں اُن میں کئی خوشنویس ایسے ہیں جنہوں نے اس میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں اور دادِ تحسین حاصل کی ہے ان میں سے بعض یوں ہیں۔

محمد عباس:- اس وقت آپ کلچرل اکیڈیمی میں بطور خوشنویس اپنے پیشہ ورانہ فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ابتدائی تربیت اپنے والد عبدالسلام سے حاصل کی جو کہ ایک ممتاز فنکار تھے۔ تعلیم گاہِ خوشنویسی میں تربیت کے دوران آپ کے فن کو اور جِلا ملی۔ آپ نوجوان خطاطوں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ نسخ اور نستعلیق قدیم اساتذہ کی روش پر خوب لکھتے ہیں۔ جدید خطوط اور انگریزی کیلیگرافی میں بھی اپنی مثال آپ ہیں۔

**معراج ترکوی:-** معراج ترکوی نے اپنے فن کا جادو اس وقت سے ہی جگانا شروع کیا جب آپ تعلیم گاہِ خوشنویسی میں زیرِ تربیت تھے۔ آپ نے خطاطی کے کئی مقابلوں میں انعامات حاصل کئے ہیں۔ اس وقت کشمیر یونیورسٹی میں بطورِ خطاط کام کر رہے ہیں۔ آپ کے خط میں خاصا بانکپن پایا جاتا ہے۔

**گلزار احمد:-** نستعلیق کے نامور اساتذہ کی روش پر لکھنے والے گلزار احمد کے فن کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دِکھانے کے مترادف ہے۔ آپ نے بہت تھوڑے عرصے میں اپنے لئے ممتاز مقام بنالیا ہے۔ آپ کے قلم کی لوچ، نفاست اور ہم رنگی آپ کو دیگر خوشنویسوں سے ممتاز کرتی ہے۔ آپ اس وقت ایک سرکاری ادارے میں بطورِ خطاط تعینات ہیں۔

**محمد یعقوب:-** مروجہ خطوط کے ساتھ ساتھ جدید خطوط سے آشنا محمد یعقوب نے درجنوں کتابوں کی کتابت کی ہے۔ خطاطی کے ساتھ ساتھ نقاشی اور دیگر فنون سے بھی آراستہ ہیں۔

**محمد ایوب بٹ (شہری)** آپ بچپن ہی سے مختلف خطوط کی مشق کرتے رہے تعلیم گاہِ خوشنویسی سے فارغ اصلاح ہونے کے بعد خطاطی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے اُن کے خط میں پختگی اور انفرادیت ہے۔

**عبدالرشید ڈار:-** مسلسل محنت اور مشق سے آپ نے نستعلیق پر دسترس حاصل کی ہے۔ خطاطی کے اسرار و رموز سے واقف ہیں۔ اس وقت انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں بطورِ استاد تعینات ہیں اور وہاں خطاطی کی تربیت دے رہے ہیں

**شریف احمد اندرابی:-** شریف صاحب کا تعلق سرینگر کے ایک علمی خاندان سے ہے۔ خوش خط انہیں ورثے میں ملا ہے۔ اعلیٰ پائے کے خوشنویس، طغریٰ نویسی میں اپنا جواب نہیں رکھتے، خطاطی کے کل ہند مقابلوں میں پہلا انعام حاصل کرچکے ہیں۔

کتے ہیں۔ یہ البم کشمیر میں خطاطی کی قدیم روایات کا بیش حاصل جائزہ لینے کے علاوہ دلآویزی میں اپنی مثال آپ ہیں۔

سری نگر اور جموں میں انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں خوشنویسی کی تربیت دینے کے پورے پورے انتظامات ہیں جن سے ہر سال درجنوں طلبہ فارغ التحصیل ہوکر فنِ خوشنویسی کی آبیاری کر رہے ہیں۔

بیورو فار پروموشن آف اردو جو کہ اب نیشنل کونسل فار پروموشن آف اردو کے نام سے ہندوستان میں اردو زبان کی ترقی و ترویج کے سلسلے میں سرگرمِ عمل ہے کے اشتراک سے ریاست میں پچھلے کئی سالوں سے سوپور میں مجلس النساء اور جموں میں بانو کیلیگرافی سنٹر کے نام سے خطاطی کے دو مراکز کام کر رہے ہیں جن کی روح رواں عتیقہ جی ہیں جو عتیقہ جی کے نام سے زیادہ معروف ہیں۔ عتیقہ جی آج کل ڈائریکٹر لائبریریز ہیں۔ دونوں ہی مرکزوں میں طالبات کو خطاطی میں تربیت دی جارہی ہے۔ نیشنل کونسل اکادمی کے زیراہتمام چلائی جارہی تعلیم گاہِ خوشنویسی کی بھی مالی معاونت کرتا ہے۔

تقریباً ایک دہائی قبل جدید ٹیکنالوجی بروئے کار لاتے ہوئے خطاطی کے لئے COMPUTERISED COMPOSING ایجاد کی گئی جسے خط نستعلیق کا نام دیا گیا۔ یہ کمپوزنگ آہستہ آہستہ کتابت کی جگہ لے رہی ہے کیونکہ اس سے وقت اور پیسے دونوں کی بچت ہو جاتی ہے لیکن اس میں خونِ جگر، عرق ریزی اور برسوں کی مشق کا وہ اعجاز کہاں جو خطاطی کا خاصا ہے۔ لیکن یہ کمپیوٹر کتابت یقیناً خطاطی کے لئے بہت بڑا چیلنج بنتی جارہی ہے جس کا بروقت اور موثر مقابلہ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

## کتاب نامہ:-

۱- تاریخ حسن : پیرزادہ حسن کھویہامی -

۲- صحیفہ خوشنویساں :- احترام الدین احمد شاغل عثمانی ۔

۳- اعجاز رقم منشی شمس الدین ۔

۴- بازیافت (فایل) مطبوعہ شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی ۔

۵- ہمارا ادب (فایل) مطبوعہ کلچرل اکادمی ۔

۶- شیرازہ (فایل) مطبوعہ کلچرل اکادمی -

۷- شیریں قلم (۲ جلد) مطبوعہ کلچرل اکادمی -

ضیاء الدین*

# ریاستی کلچرل اکادمی اور اردو زبان

ریاست میں اُردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لئے ریاستی کلچرل اکادمی نے جو رول ادا کیا ہے اسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ جب کبھی ریاست میں اردو زبان و ادب کی تاریخ لکھی جائے گی۔ کلچرل اکادمی کی گرانقدر خدمات کو بھی سراہا جائے گا کہ ریاست میں اُردو کی مخصوص پوزیشن، مرتبے اور تشخص کو متعین کرنے میں اکادمی کی کارکردگی قابل ستائش ہے۔

ریاست میں اس ادارے کا قیام ۱۹۵۷ء میں اس وقت کے وزیر اعظم بخشی غلام محمد کی حکومت میں عمل میں آیا اور اس وقت اُردو زبان ریاست میں رابطے اور سرکاری زبان کا درجہ حاصل کرکے کئی مراحل سے گزر چکی تھی۔ کئی انجمنیں اور ادبی مراکز قائم ہو چکے تھے۔ تعلیمی اداروں میں اس کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام تھا۔ جموں کشمیر اور لداخ تینوں علاقوں میں رابطے کی زبان کی ضرورت کو پورا کرتے ہوئے فروغ حاصل کر رہی تھی اور ریاست کے اس وقت کے ادیب و شاعر اپنی مادری زبان کے بجائے اُردو زبان کو اپنے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنا رہے تھے۔ ایسے وقت میں کلچرل اکادمی کے قیام نے اردو زبان و ادب کے فروغ کو مزید استحکام عطا کیا۔ ادبی سرگرمیوں کے لئے ایسی سازگار فضا استوار کی جس نے اُردو زبان و ادب کو وادی میں پھیلایا۔

* شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی جموں

رسالوں اور کتابوں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ مشاعروں، سیمناروں اور ادبی محفلوں کا اہتمام بھی کیا گیا۔ وادی کے تخلیق کاروں کو انعامات، اعزازات اور مالی معاونت سے نوازا گیا۔ اردو خوشنویسی، فن خطاطی یا کتابت کا درس بھی اکادمی میں دیا جانے لگا۔ گویا اردو کو ایک ایسا سہارا مل گیا جو ہر طرح سے اسکے پھلنے پھولنے میں مددگار و معاون ثابت ہوا۔ اپنے قیام کے ۴۰ برسوں کے دوران اکادمی نے نہ صرف بہت سے مصنفین کی کتابیں شائع کیں بلکہ علاقائی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو میں تین رسالے "شیرازہ" "ہمارا ادب" اور خبرنامہ "اکادمی" شائع ہونے لگے۔

اکادمی کا اردو جریدہ "شیرازہ" اس کے قیام کے ساتھ ہی شائع ہونے لگا۔ پہلے یہ رسالہ سہ ماہی، دوماہی اور پھر ۱۹۷۹ء سے ماہانہ شائع ہونے لگا۔ اس رسالے کی اشاعت سے ریاست کے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی بھی ہونے لگی۔ اکادمی ہر سال خصوصی محفلیں منعقد کرتی اور ان محفلوں میں ریاست کے فنکاروں کو اپنی تازہ تخلیقات پیش کرنے کی دعوت دی جاتی۔ اور بعد میں ان تخلیقات کو شیرازہ کے نوجوان نمبر میں شائع کیا جاتا۔ ریاستی ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کی اشاعت کے علاوہ شیرازہ کے خاص نمبر بھی شائع ہونے لگے۔ جن میں اقبال نمبر، افسانہ نمبر، شیخ العالم نمبر، صادق نمبر، لل دید نمبر، پریم چند نمبر، شیر کشمیر نمبر، زور نمبر، ثقافت نمبر، حسن نمبر، شاہ ہمدان نمبر، عجائبات نمبر، مغل نمبر اور کشمیری صوفیانہ موسیقی نمبر خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ اکادمی کے رسالے شیرازہ نے اردو رسائل کی تاریخ میں اپنا ایک خاص منفرد معیار قائم کیا ہے ریاستی شعر و ادب کے ساتھ ساتھ یہاں کی ثقافتی اور عملی سرگرمیوں کو بھی دوسرے علاقوں تک پہنچانے کا کام شیرازہ سے لیا گیا۔

ہمارا ادب کلچرل اکادمی کا دوسرا اہم سالانہ رسالہ ہے۔ پہلے تو اس میں شیرازہ سے سال بھر کی منتخب تخلیقات اکٹھا کر کے انہیں شائع کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اس رسالے میں تنقیدی اور تحقیقی مقالات بھی پیش کئے جاتے تھے۔ یہ رسالہ ضخیم کتابی صورت میں شائع ہوتا رہا۔ اس میں شائع شدہ مقالات سے ریاستی اکادمی کی گراں قدر ادبی خدمات کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۷۵ء کے بعد اس سالانہ رسالے کے خاص نمبر بھی شائع کئے گئے جن میں لوک ادب نمبر، جموں و کشمیر نمبر (۵ جلد) شیرازہ انتخاب نمبر اور مشاہیر نمبر (۲ جلد) شائع کئے گئے۔ مشاہیر نمبر میں ریاست کی ان اہم شخصیات کا تعارف کرایا گیا جنہوں نے ریاستی فنون لطیفہ، مذہب، سیاست اور دوسرے شعبوں میں اہم کارنامے سرانجام دیئے تھے۔ اس کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور ہمارا ادب کے شخصیات نمبر (۵ جلد) اور اولیا نمبر منظر عام پر آئے۔ جموں و کشمیر کے اولیائے کرام کی دینی اور علمی و دیگر خدمات کا احاطہ کرنے والے اس خصوصی نمبر کی چار جلدیں اب تک زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں جبکہ چوتھی جلد کے ایڈیٹوریل کے مطابق پانچویں جلد زیر ترتیب ہے۔

شیرازہ اور ہمارا ادب کے علاوہ خبر نامہ اکادمی بھی اکادمی کی جانب سے شائع ہوا۔ یہ اپنی نوعیت کا منفرد نیوز لیٹر تھا۔ اس خبر نامے میں اکادمی کی ادبی سرگرمیوں کے ساتھ ریاست کی تہذیبی اور تمدنی زندگی کے مختلف گوشوں کے بارے میں خبریں، مضامین اور معلومات شامل ہوتی رہیں۔ لیکن نہ جانے کن وجوہات کی بنا پر اس کی اشاعت ۱۹۸۸ء کے بعد روک دی گئی۔ اس کے جتنے بھی شمارے نکلے وہ سب قابل تعریف ہیں۔

ان رسائل کے علاوہ بلند قامت ادیبوں اور شاعروں کی یاد کو تازہ کرنے کے لئے اکادمی نے خصوصی اقدامات کئے۔ غالب صدی تقریبات کے دوران اکادمی نے غالب

کی غزلوں کے کشمیری ترجمے شیرازہ میں شائع کئے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر گیان چند جین کی کتاب تفسیرِ غالب اور رقعاتِ غالب کے نام سے کتابیں شائع کی گئیں۔ ان کے علاوہ بھی کلچرل اکادمی نے بہت سی کتابیں شائع کیں۔ ان میں ڈاکٹر اکبر حیدری کا "دیوانِ میر" اور "تذکرہ شاعراتِ اُردو" بھی شامل ہیں۔ اکادمی کی اردو مطبوعات میں اُردو کشمیری فرہنگ بھی شامل ہے جو بارہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس فرہنگ میں نوے ہزار کے قریب الفاظ اور مرکبات شامل ہیں۔ اس فرہنگ کو مکمل کرنے میں پندرہ سال سے زیادہ وقت صرف ہوا۔ اور کشمیری اُردو تین جلدوں پر مشتمل وہ گراں قدر کارنامہ ہے جو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے علاوہ اکادمی نے بہت سے سیمنار منعقد کئے۔ علامہ اقبال کے فن اور فلسفہ پر سرینگر اور جموں میں دو سیمنار کئے گئے۔ ان میں اُردو کے مشہور شاعروں اور نقادوں نے شرکت کی جن میں علی سردار جعفری، وحید اختر اور عبدالحق وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان سیمناروں میں جو مقالات پڑھے گئے انہیں محفلِ اقبال کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ اقبال صدی تقریبات کے دوران علامہ اقبال کے کلام کا کشمیری زبان کے علاوہ ڈوگری، پنجابی، ہندی اور دوسری زبانوں میں بھی تراجم شائع کئے گئے۔ شیرازہ (اُردو) کے دو ضخیم اقبال نمبر شائع کئے گئے ہیں۔ پہلا ڈاکٹر رشید نازکی کی ادارت میں اور دوسرا محمد احمد اندرابی کی ادارت میں۔ اسی طرح دوسری زبانوں میں بھی شیرازہ کے اقبال نمبر شائع کئے گئے۔

منشی پریم چند کی صد سالہ برسی کے موقع پر اکادمی نے شیرازہ (اُردو) کے علاوہ دیگر زبانوں میں شیرازہ کے مختلف ایڈیشنوں میں خصوصی شمارے شائع کئے۔ اس کے علاوہ منشی پریم چند کے افسانوں کے تراجم شائع کئے گئے۔ کلچرل اکادمی کا اہم کارنامہ وہ سیمنار اور اُردو کانفرنسیں ہیں جن میں ریاستی شعراء و ادباء کے علاوہ اردو

ادب کے نامور ادیبوں کو دعوت دی جاتی رہی۔ اب تک جن ادبی شخصیات کو بلایا گیا ہے ان میں اختر الایمان، کرشن چندر، شمس الرحمٰن فاروقی، جوگندر پال اور عصمت چغتائی قابل ذکر ہیں۔

کلچرل اکادمی ہر سال جموں میں یوم جمہوریہ کے موقع پر کل ہند مشاعرے کا اہتمام کرتی ہے جس میں ریاست کے شعرا کے علاوہ ریاست سے باہر کے نامور شعرا حضرات کو بھی بلایا جاتا ہے۔

شاعروں اور ادیبوں کی ان تقاریب کے علاوہ جو اہم کارنامہ اکادمی نے انجام دیا وہ اکادمی کی سلور جوبلی تقریبات کے سلسلے میں ایک تاریخی سیمنار ہے جس میں اکادمی کی پچیس سالہ کارکردگی کا جائزہ لیا گیا۔ اس سیمنار کا مقصد زبان وادب کے مسائل پر غور کرنا تھا۔

ریاستی کلچرل اکادمی کی اردو خدمات کے ساتھ اسکے سابق سیکرٹری محمد یوسف ٹینگ کا ذکر بھی لازمی ہے۔ ٹینگ صاحب ۱۹۵۸ئ سے لے کر ۱۹۹۳ء تک اکادمی میں رہے۔ انہوں نے اردو زبان وادب کو فروغ دینے میں ذاتی دلچسپی کی۔ وہ پہلے شیرازہ اور ہمارا ادب کے مدیر تھے۔ پھر ڈپٹی سیکرٹری بنے اور پھر سیکرٹری۔ مگر انہوں نے شیرازہ اور ہمارا ادب سے اپنا ناطہ نہیں توڑا بلکہ ان جرائد کے مدیران ڈاکٹر رشید نازکی اور محمد احمد اندرابی کے ساتھ بطور نگران و مدیر اعلیٰ ان کی دیکھ بال کرتے رہے۔ خبرنامہ "اکادمی" اور دوسری مطبوعات کے ادارتی فرائض میں بھی اہم رول ادا کرتے رہے۔

اکادمی کی اردو خدمات کے ایک اجمالی جائزے کے بعد اس حقیقت سے پردہ اٹھانا بھی ضروری ہے کہ نامساعد حالات کی بنا پر اکادمی کی اردو کے تئیں خدمات میں وہ خلوص اور جذبہ باقی نہیں رہا اور نہ وہ معیار قائم رہا جو ابتدا میں قابل تحسین

نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ اتنی اچھی اُٹھان کے بعد توقع تو یہ تھی کہ کلچرل اکادمی کا میدان
کے نئے جہاں سر کرے گی اور اس کی چھتر چھایہ میں بدنصیب اُردو کو بھی خاطر خواہ فروغ
ہوگا۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شاید علاقائی عصبیت کی ناگن اُردو کو ڈسنے
لگی ۔۔۔۔ لوگوں کے دلوں کا چور کہیں اُسے ڈوگری تو کشمیری کا حریف مان کر ایک
عفریت کی طرح سر ابھارنے لگا۔ اور خوب سے خوب تر کی جستجو تو محض خواب و خیال
کی بے نام وادیوں میں کھو گئی۔

اُردو کے چاہنے والوں کے لئے اُردو کی موجودہ صورتحال ایک ڈراونے خواب
سے زیادہ کچھ نہیں ــــ دور دور تک کوئی امید کی کرن نظر نہیں آتی۔ اُردو
کے نام پر ہوتی ہوئی اقربا پروری ایسے کاری وار کر رہی ہے جس سے بنیادی نقصان
پہنچ رہا ہے اور مستحق لوگوں کی کمر ٹوٹ رہی ہے۔ ــــ میں چلتے چلتے کلچرل اکادمی
کے ارباب اقتدار سے صرف یہ کہہ کر اجازت لیتا ہوں ؎

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

عبدالحق نعیمی*

# اردو تنقید میں ریاستی ناقدین کا حصّہ

ریاست جموں وکشمیر ہر دور میں علم وادب کا گہوارہ رہی ہے۔ یہاں متعدد شعرا، ادبا، نقاد اور دانشور پیدا ہوئے جنہوں نے زبان وادب کے گرانقدر کارنامے انجام دیئے۔ ان بزرگ شاعروں، ادیبوں اور نقادوں کو زبان وادب کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

ریاست میں اردو تنقید کا چراغ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانے میں روشن ہوا جب موصوف نے "بدیا بلاس" نام سے نہ صرف ایک اردو ہندی ہفتہ وار اخبار جاری کیا بلکہ "بدیا بلاس" نام سے ایک انجمن بھی قایم کی جس کا مقصد مختلف زبانوں کے ادبی شہ پاروں کا اردو اور ہندی میں ترجمہ کرنا اور ان سے متعلق تنقیدی وتاریخی مباحث کو بھی چھیڑنا تھا۔ "بدیا بلاس" اخبار میں اس انجمن کی ساری ادبی کاروائی شائع کی جاتی تھی۔

"بدیا بلاس" کی روایت کو بعد میں ان ادیبوں اور فنکاروں نے جاری رکھا جنہیں مہاراجہ نے دور دور سے بلاکر یہاں علمی وادبی کام پر مامور کیا۔ یہ سلسلہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے زمانے تک جاری رہا۔

ادبی تنقید کے ابتدائی نقوش ہمیں محمد عمر نورالٰہی کی معرکتہ الآرا

---

* معرفت شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی جموں

تصنیف " ناٹک ساگر " میں ملتے ہیں جو پہلی بار لاہور کے مرکنٹائل پریس سے ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کو عالمی ڈرامہ نگاری کے فن و تاریخ پر پہلی اُردو تصنیف قرار دیا جاتا ہے۔ " ناٹک ساگر " کو فنِ ڈرامہ نگاری میں امتیازی خصوصیت حاصل ہے۔ اس میں دُنیا کے اکثر ممالک میں ڈرامے کے آغاز وارتقا کی کہانی کو بڑے مختصر اور موثر انداز میں مُستند شواہد کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس کام کو مکمل کرنے میں مؤلفین کو علم و ادب اور تاریخ و تنقید کے کیسے کیسے ہفت خوان سر کرنے پڑے ہوں گے اس کا اندازہ اس پر ایک نظر ڈالنے سے ہی ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے علامہ برج موہن کیفی یوں فرماتے ہیں۔

" یہ وہ کتاب ہے جو اُردو ادیبوں اور ڈرامانویسوں اور اسٹیج یعنی تھیٹر کے ہر قسم کے متعلقین کے لئے روزنامچہ ہدایت کا کام دے گی۔ یورپ کے ڈراما کی عہد بہ عہد ترقی، اُس کا عروج، ارتقا اور تنزلِ فن تمثیل یعنی اداکاری اسٹیج کا لباس اور سینری وغیرہ ایسے مطالب ہیں جن کا ذکر جا بجا اس کتاب میں آیا ہے اور جن پر موٴرخانہ تعبیر کے ساتھ نظر ڈالی گئی ہے "[1]

علامہ کیفی نے ناٹک ساگر کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ برحق ہے۔ مصنفین نے بڑی محنت و جانفشانی کے ساتھ پہلے مواد اکٹھا کیا اور پھر اس کو بہ نظر غائر دیکھا۔ ناٹک ساگر کو جہاں اُردو میں ڈرامے کی تاریخ و تنقید کی خشتِ اول قرار دیا جاتا ہے وہاں اسے ریاست کی اُردو تنقید میں ایک سنگِ میل کی حثیت حاصل ہے۔

تنقیدی کُتب میں عبدالاحد آزاد کی گراں قدر تصنیف

---

[1] ناٹک ساگر از محمد عمر نور الٰہی ص ۸-۹

"کشمیری زبان اور شاعری" بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کا مسودہ ۱۹۴۷ء سے قبل تیار ہوا لیکن اُن کی حیات میں شائع نہ ہو سکا اور ۱۹۵۹ء میں ریاستی کلچرل اکادمی نے اِسے شائع کیا۔ اس معتبر تذکرے میں لل دید سے لیکر مہجور اور حیرت کاملی کے عہد تک بیشتر شعرا کا تفصیل سے ذکر ملتا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت یوں بھی ہے کہ اس میں آزاد نے تحقیق کے ساتھ ہی ساتھ تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے۔

پریم ناتھ بزاز ریاست جموں و کشمیر کے نامور صحافی ہوتے ہیں تنقید کے شعبے میں اُن کی تصنیف "شاعرِ انسانیت (۱۹۵۲) کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس میں اُنہوں نے عبدالاحد آزاد کی شاعری کا تنقیدی جایزہ لیا ہے اور ناقدانہ نظر سے آزاد کے تخلیقی ذہن تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ وہ آزاد کی شاعری سے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"ہم اس وقت اُن کی شاعری کو زیر بحث لانا چاہتے ہیں نثر کو نہیں۔ شاعری میں بھی ہم اُس حصّے کو نظر انداز کرتے ہیں جو اُن کی ابتدائی زندگی سے متعلق ہے جب کہ وہ قومی مسایل اور سماجی سوالات کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیتے ہیں۔ آزاد کی شاعری کا بیشتر حصّہ ابھی شائع نہیں ہوا ہے بلکہ جو کچھ اس وقت پبلک کی نظروں سے گذر چکا ہے اتنا ہی ہماری تنقید کا موضوع ہے۔"

اُردو تنقید نگاروں میں ڈاکٹر عزیز احمد قریشی کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ عزیز احمد کا بنیادی موضوع دینیات تھا وہ احمدیہ فرقے سے تعلق رکھتے تھے اور شعر و ادب کے ساتھ اُن کو دلچسپی تھی۔ اِس سلسلے میں اُن کی دو (۲) تصانیف "ہماری قومی اور انقلابی شاعری" (۱۹۵۹) اور "جدید تنقیدی زاویے" قابلِ ذکر ہیں۔ "ہماری قومی اور انقلابی شاعری" میں سیاسی اور قومی شاعری سے متعلق بحث کی گئی ہے اور جدید تنقیدی زاویے میں شاعری کے بارے میں یورپی

نقادوں کے تاثرات، شاعری کے لوازمات، لاشعوریت، ابہام اور ایسے ہی بہت سے مسایل اور مباحث ملتے ہیں۔

۱۹۴۷ کے بعد ریاست جموں وکشمیر میں جن لوگوں نے تنقید کے میدان میں قلم اٹھایا۔ اُن میں امتیازی نام پروفیسر حامدی کاشمیری کا ہے۔ حامدی نے مختلف اصناف ادب کو وسیلہ اظہار بنایا۔ اُن کے یہاں شاعری، افسانے، ڈرامے تحقیق وتنقید وغیرہ بھی طرح کا ادب ملتا ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اکتشافی تنقید کے نام سے ایک نئے موضوع کا آغاز کیا ہے۔ ادبی تنقید پر حامدی نے خاصی توجہ دی ہے۔ حامدی کے اہم تنقیدی کارناموں میں "جدید اُردو نظم پر یورپی اثرات" "غالب کے تخلیقی سرچشمے"، "نئی حسیت اور عصری اُردو شاعری" "اقبال اور غالب" "معاصر تنقید ایک تناظر میں" "کارگہ شیشہ گری" (میر کا مطالعہ) "ناصر کاظمی کی شاعری" "تفہیم وتنقید"، "جدید شعری منظر نامہ" وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ "جدید اُردو نظم پر یورپی اثرات" اُن کا تحقیقی مقالہ ہے لیکن اس میں تحقیق سے زیادہ تنقید ملتی ہے۔ یہ اُردو نظم کے ایک خالص تجزیاتی مُطالعے پر مشتمل ہے۔ حالی اور آزاد کے دور سے ۱۹۴۷ء تک اُردو شاعری کا احاطہ کرتا ہے۔ "غالب کے تخلیقی سرچشمے" میں غالب کی نفسیات پر بحث کی گئی ہے اور غالب کے فکری پہلو کو اجاگر کرنے کی بہت اچھی کوشش کی گئی ہے۔

حامدی روایتی تنقید کے قایل نہیں وہ جدیدیت اور نئی تحقیقات سے متاثر ہیں لیکن اس میں بھی انہوں نے ایک الگ راستہ اختیار کیا ہے۔ "نئی حسیت اور عصری اُردو شاعری" بھی اپنے موضوع کے اعتبار سے اہم ہے۔ حامدی نے جدید شاعری اور نئی شعریات کے مباحث کا معروضی طور پر مطالعہ کیا اور نئے شعری احساس اور جذبے کی دید ودریافت کی

عصری سیبیت کی اصل اور اُس کے مباحث کا احاطہ کیا ہے۔ "کارگہہ شیشہ گری" میں میر کی شاعری میں پوشیدہ تخلیقی کائنات میں حیاتی اور علامتی پیکروں کی تلاش اور اُن کی معنویت کا مطالعہ ملتا ہے۔ حامدی کی تنقید نگاری کے مطالعے سے اُردو میں ایک نئی آواز کا احساس ہوتا ہے۔ "امکانات" بھی حامدی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ "حرفِ راز" (اقبال کا مطالعہ) اقبال سے متعلق وقتاً فوقتاً اُن کے تحریر کردہ مضامین کا مجموعہ ہے جس کے مطالعے سے اُن کے اقبال سے متعلق تنقیدی خیالات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر اکبر حیدری کا نام ریاست کے نامور ناقدین میں آتا ہے۔ حیدری بنیادی طور پر محقق ہیں لیکن اُن کی تصانیف کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ تنقید بھی اُن کا میدان رہا ہے۔ اُنہوں نے محققانہ جگر کاوی سے مرثیہ، تذکرہ اور کلاسکی شعر و نثر کے لئے بے شمار دفینوں کو کھنگالا ہے جن پر شدایدِ زمانہ کی دھول پڑی تھی۔ اُردو ادب میں اُن کے کئی تحقیقی کارنامے منظرِ عام پر آئے لیکن اُنہوں نے تنقیدی خیالات کا بھی اظہار کیا۔ تنقید کے ضمن میں اُن کی مشہور کتب "میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر" "مطالعہ زور" "میر ضمیر" "تحقیق و تنقید" "مضامین حیدری" اور "دیوانِ میر" قابلِ ذکر ہیں۔ اِن کتب کے مطالعے سے اکبر حیدری کی تنقیدی بصیرت کا پتہ بخوبی چل سکتا ہے۔

۱۹۴۷ کے بعد جن لوگوں نے تنقیدی کارنامے انجام دیئے اُن میں ایک نام ڈاکٹر برج پریمی کا بھی ہے۔ ڈاکٹر برج پریمی کی چند کتابیں تحقیق و تنقید کے حوالے سے چھپ کر منظرِ عام پر آتی ہیں جن میں "حرفِ جستجو" جلوۂ صد رنگ" "منٹو کتھا" (سعادت حسن منٹو حیات اور کارنامے) ذوقِ نظر" "جموں و کشمیر میں اُردو ادب کی نشو و نما" "چند تحریریں" "مباحث" قابلِ

ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر برج پریمی کے تنقیدی مضامین ملک کے مختلف رسایل میں شایع ہو چکے ہیں۔ مذکورہ بالا کتب کے مطالعے سے یہ بات واضح طور پر عیاں ہے کہ ڈاکٹر برج پریمی ایک بالغ نظر نقاد اور ادیب ہیں۔ موصوف نے بساط بھر خلوص اور ادبی دیانت کے ساتھ اظہار خیال کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر برج پریمی کی تنقیدی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"ڈاکٹر برج پریمی نے اردو زبان و ادب کی تدریس اور تنقید کے سلسلے میں جو نمایاں کام انجام دیتے ہیں اُن کی اہمیت مسلم ہے۔ منٹو پر اُن کی کتاب ایک بڑے فنکار کو سمجھنے اور پرکھنے میں بہت مدد دیتی ہے"[1]

ہماری ریاست کے ایک نقاد محمد یوسف ٹینگ ہیں۔ ٹینگ کشمیری اور اردو ادبیات کے سنجیدہ قاری ہیں اور جا نبین پر اُن کی ناقدانہ نظر ہے اُن کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "شناخت" شایع ہو چکا ہے۔ ریاست کے اور ملک کے معتبر رسایل میں اُن کے تنقیدی مضامین برسوں سے شایع ہو رہے ہیں۔ ٹینگ کلچرل اکادمی کے سیکریٹری بھی رہے۔ ملازمت کے دوران وہ اکادمی کے مجلہ "شیرازہ اور "ہمارا ادب" کے مدیر بھی رہے۔ انھوں نے اپنے اداریوں اور تنقیدی مضامین سے شیرازہ کو ایک امتیازی مقام عطا کیا اور شیرازہ کو ادبی حلقوں میں قدر اور تحسین کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا۔

ٹینگ ایک معتبر ادیب اور ناقد ہیں۔ شیرازہ کے اداریوں کے علاوہ ریاست کے ادیبوں اور مصنفوں کی کتابوں پر اُن کے مقدمے اور دیباچے اُن کی دقتِ نظر کا ثبوت ہیں۔ آرٹ، ادب کلچر، تاریخ اور دوسرے

---

[1] برج پریمی ایک مطالعہ از پریمی رومانی ص ۱۴۴

ثقافتی پہلوؤں پر ٹینگ کے مضامین دستاویزی اہمیت کے حامل ہیں لیکن اُن کے باوصف غالب، اقبال، منٹو اور کشمیر میں اُردو کے تعلق سے اُن کے بعض مضامین نہ صرف اُن کی دیدہ وری اور محققانہ جگر کاوی کا ثبوت ہیں بلکہ اُن کے مطالعے سے اُن کی تنقیدی بصیرت اور معروضی اندازِ نظر کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اُن کا بات کہنے کا انداز شگفتہ اور مدلّل ہے۔

ریاست کے نامور ناقدین میں ایک بلند قامت نام پروفیسر ڈاکٹر ظہور الدین کا ہے جو اپنے دور کے ناقدین میں امتیازی اہمیت کے حامل ہیں۔ پروفیسر موصوف پندرہ[15] کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ نے اپنے تخلیقی سفر کے دوران کتنی منزلیں طے کرتے ہوئے مختلف اصنافِ ادب پر قلم اُٹھایا ہے اور ہر بات کو بڑے پُر لطف پیرائے میں دلایل ساطعہ اور براہین بیّنہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ تحقیق و تنقید کے شعبے میں موصوف کی جو کتابیں خاصی مشہور ہیں اُن میں "نفکرات"، "محروم کی شاعری"، "تعلیل و تاویل"، "بیسویں صدی کے اُردو ادب میں انگریزی کے ادبی رجحانات" "DEVELOPMENT OF URDU LANGUAGE AND LITERATURE IN JAMMU REGION" اور "کہانی کا ارتقا" خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

پروفیسر موصوف کو تنقید کے فن پر پوری دسترس حاصل ہے۔ "محروم کی شاعری"، میں اُنھوں نے تلوک چند محروم کی شاعری کے اُن عناصر کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ جن پر اُن سے پہلے کسی نے قلم نہیں اُٹھایا تھا۔ "بیسویں صدی کے اُردو ادب میں انگریزی کے ادبی رجحانات"، پروفیسر موصوف کی ایسی معرکتہ الآرا تصنیف ہے۔ جن میں ادب کی غایت، کلاسیکیت، رومانیت، مارکسیت، ترقی پسند ادب، تحلیلِ نفسی، شعور کی رو، وجودیت، اشاریت، مکعبیت، ڈاڈازم

تاثریت جیسے اہم موضوعات کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور ہر موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ رومانیت کے حوالے سے ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"لفظِ رومانٹک" سب سے پہلے سترھویں صدی عیسوی کے نصف میں اس ادب کے لئے استعمال کیا گیا ہے جو فرضی موضوعات کا حامل تھا۔ کچھ وقت کے بعد اس مفہوم میں تبدیلی رونما ہوئی اور اب اِسے قدرتی مناظر کے بیان کے لئے استعمال کیا جانے لگا اور ایک سو سال تک یہ لفظ اِس مفہوم کی ترجمانی کے لئے رہا۔ رفتہ رفتہ یہ مفہوم بھی بدلا اور بالآخر اِسے جذبے اور وجدان کی تجدید کے لئے مخصوص کیا گیا۔"[1]

"DEV. OF URDU LANGUAGE AND LITERATURE IN JAMMU REGION" پروفیسر موصوف کی نہ صرف تحققانہ جگر کاوی کا ثبوت ہے بلکہ موصوف نے معروضی انداز میں صوبہ جموں میں اُردو زبان وادب کا تجزیہ کیا ہے اور دلائل سے اُن رجحانات کا ذکر کیا ہے جو تاریخی سفر کے دوران وقتاً فوقتاً رونما ہوتے رہتے ہیں۔ "حقیقت نگاری اور اُردو ڈرامہ" اور "جدید اُردو ڈرامہ" ڈرامے سے متعلق دو کتابیں منظر عام پر آئیں جنہیں اُردو ڈرامے کے بعض نئے پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مذکورہ کتب عوام الناس میں مقبولِ عام ہوئیں اور ایم اے کے نصاب میں بھی شامل ہیں۔ پروفیسر موصوف کا انداز متوازن اور سُلجھا ہوا ہے۔ "ارمغان آزاد" جو پروفیسر موصوف کی تالیف ہے اس میں پروفیسر موصوف کا ایک تنقیدی مضمون بھی شامل ہے جس کے متعلق پروفیسر گیان چند جین یوں رقمطراز ہیں۔

"مجموعے کا سب سے طویل اور پُر مغز مضمون "پروفیسر جگن ناتھ آزاد

---

[1] بیسویں صدی کے اُردو ادب میں انگریزی کے ادبی رجحانات، ڈاکٹر ظہور الدین ص ۵۶، ۵۷

کی فلسفیانہ بصیرت" خود مرتب مجموعہ ڈاکٹر ظہور کے قلم سے ہے یہ ص ۷۷ سے ص ۱۰۸ تک یعنی ۳۲ صفحوں کو محیط ہے اس کے دو حصے ہیں۔ شاعری اقبالیات، مضمون نگار نے اقبال کی شاعری میں غوطہ لگاکر، کھنگال کر کہاں کہاں سے مفکرانہ اشعار اور بیانات تلاش کئے۔ لگتا تھا مضمون انہیں پر ختم ہو جائے گا لیکن اس کے آگے اقبالیات کے سلسلے میں آزاد کی خالص فلسفیانہ آزاد شاعری میں زیادہ ظاہر ہوتا ہے کہ اقبالیات کی نثر میں بہر حال مضمون خوب سے خوب تر ہے"۔[۱]

مذکورہ اقتباس میں جبین صاحب نے بھی پروفیسر موصوف کے قلمی رشحات کا اعتراف کیا ہے۔ ملک کے معتبر رسایل میں مختلف موضوعات پر پروفیسر موصوف کے اسی تنقیدی مضامین چھپ چکے ہیں۔ اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی مصنف کے متعدد مضامین موقر رسایل میں شایع ہو چکے ہیں اس کے علاوہ موصوف کا مقالہ "DEVELOPMENT OF URDU LANGUAGE AND LITERATURE IN JAMMU REGION" انگریزی زبان میں ہی شایع ہوا ہے۔

محمد زماں آزردہ ریاست کے اہم محققین اور نقادوں میں شمار ہوتے ہیں۔ مرزا سلامت علی دبیر (حیات اور کارنامے) اُن کا ایک قابلِ قدر مقالہ ہے۔ اس میں حیاتِ دبیر کے ایسے گوشوں کو منظرِ عام پر لایا گیا ہے جو مدتوں سے تاریکیوں میں دفن تھے۔ آزردہ نے دبیر کے غیر مطبوعہ کلام اور دوسری کاوشوں کو بھی دریافت کیا ہے۔ پریم ناتھ در کی افسانہ نگاری، اقبالؔ کا تصورِ عشق، کشمیر کے اردو ادیب، پریم چند کی حقیقت نگاری، تنہا انصاری بحیثیت اردو شاعر اور ایسے متعدد مضامین ملک کے مختلف رسائل میں شایع ہو چکے ہیں جن سے

---

[۱] نولے ادب بمبئی اکتوبر ۱۹۹۶ء ص۔ ۲، ۳

آزردہ کی تنقیدی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

پروفیسر کنول کرشن بالی کی تصنیف "آزاد نظم اور اُردو شاعری" اپنے موضوع کی مطابقت سے اچھی کتاب ہے اس میں متعدد موضوعات پر تنقیدی مضامین شامل ہیں۔

"سرودِ سحر آفریں" پروفیسر غلام رسول ملک کی تصنیف تنقید کے ضمن میں اہمیت کی حامل ہے اس میں موصوف نے بڑی محنت سے اہم تنقیدی رحجانات سے بحث کی ہے جس سے اُردو تنقید میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔

مندرجہ ذیل ادبا اور شعرا جو بعد میں ریاست کی دوسری مقامی زبانوں سے منسلک ہوگئے ہیں اور جن میں سے کچھ اب حیات نہیں ہیں وقتاً فوقتاً اُردو میں بھی تنقیدی مضامین لکھتے رہتے ہیں ان حضرات میں یہ نام قابل ذکر ہیں:۔

پروفیسر پشپ، بجے لال کولؔ، محی الدین قاضی، تنہا انصاریؔ عبدالرحمان راہی، ڈاکٹر شمس الدین، ڈاکٹر کاشی ناتھ پنڈتا، امین کاملؔ غلام رسول نازکی، قیصر قلندر، موتی لال ساقی، بلدیو پرشاد شرما، رشید نازکیؔ، بنسی لال ناز، محمد عبداللہ شیداؔ، اوتار کرشن رہبر، مرغوب بانہالیؔ نشاط انصاری، مشعل سلطانپوری، سیف الدین سوز، شانتی سروپ نشاطؔ عشرت کشتواڑی، عبدالغنی شیخ، عبدالاحد رفیق، محمد احمد اندرابی، ارجن دیو مجبور، محمد اشرف ٹاک۔ ان میں سے بہت سے اہلِ نظر برسوں سے لکھ رہے ہیں لیکن یہ بات مسلم ہے کہ ان ادیبوں اور نقادوں نے شعر و ادب

---

لہ نور نئے ادب بمبئی اکتوبر ۱۹۹۳ء ص۔ ۲۔ ۳

کے مختلف پہلوؤں پر قلم آزمائی کی ہے جن سے ان کی تنقیدی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

کشمیر یونیورسٹی کے اقبال انسٹی ٹیوٹ نے پروفیسر محمد امین اندرابی کی بصیرت افروز رہنمائی میں گراں قدر کارنامے انجام دیئے ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ کے جریدے "اقبالیات" میں ملک بھر کے معروف اہلِ نظر کے مضامین شائع ہوتے ہیں اور اقبال کے فکر و نظر کے نئے گوشے سامنے آرہے ہیں اسی جریدے میں دوسرے موضوعات پر بھی تنقیدی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ اہتمام ہر سال قومی اور بعض اوقات بین الاقوامی سطح پر سیمینار منعقد ہوتے ہیں جن میں ملک کے بڑے بڑے عالم اور نقاد شریک ہوتے ہیں، مقالے پڑھتے ہیں جن پر بحث و تمحیص ہوتی ہے۔ یہ مقالے انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ اہتمام کتی کتابی سلسلوں میں شایع ہو کر منظرِ عام پر آتے ہیں۔ اردو تحقیق و تنقید کو بالعموم اور اقبالیات کو بالخصوص اس مطبوعہ مواد سے فایدہ ہوا ہے۔ اردو تنقید میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کی سعی سے یقیناً اضافہ ہوا ہے۔

اردو تنقید کی توسیع میں جموں اور کشمیر یونیورسٹی کے اردو شعبہ جات، ریاستی کلچرل اکادمی، دوردرشن اور ریڈیو جموں کی مساعی کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تمام ادارے وقتاً فوقتاً اپنے سیمناروں، مباحثوں اور مختلف پروگراموں کے ذریعے اردو تنقید کی نئی جہتوں کی طرف نشاندہی کرتے رہے ہیں۔ شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کے "بازیافت" اور دوسرے کتابی سلسلوں میں ریاستی کلچرل اکادمی کے "شیرازہ" اور

"ہمارا ادب" محکمہ اطلاعات کے "تعمیر" کے ذریعے بھی برسوں سے اچھا کام ہو رہا ہے۔ ان رسالوں میں علمی اور تحقیقی مضامین کے علاوہ خاصی تعداد میں تنقیدی مضامین بھی شائع ہوتے ہیں۔ ان کے مضمون نگار مقامی اُدبا کے کے علاوہ ملک کے مشاہیر ادیب اور نقاد اپنے مضامین شائع کرواتے ہیں۔ یہ مضامین بلند معیار کے ہوتے ہیں۔ شعبۂ اُردو کشمیر یونیورسٹی میں تحقیق و تنقید کا کام ہوا ہے ان میں ڈاکٹر اسداللہ کامل کا "اُردو میں سیرت النبیؐ کا ادب"، ڈاکٹر نذیر احمد ملک کا "اُردو رسم خط کا ارتقا اور جایزہ" ڈاکٹر محبوبہ وانی کا "اُردو اور کشمیری شاعری میں رومانی رجحانات" قابل ذکر ہیں۔ یہ مقالے اگرچہ بنیادی طور پر تحقیقی ہیں لیکن ان میں تنقید کے منصب سے بھی عہدہ برآ ہونے کی کوشش ملتی ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد ملک کا مقالہ بھی اہم ہے۔ اس لئے کہ وہ لسانیاتی موضوع پر یہاں پر پہلا کام ہے۔ ڈاکٹر محبوبہ وانی نے اُردو اور کشمیری شاعری کے رومانی رجحانات تلاش کئے ہیں اور تنقیدی مطالعہ کرتے ہوتے اپنی تنقیدی صلاحیت کا اظہار کیا ہے۔

ڈاکٹر قدوس جاوید کی کتاب "ادب اور سماجیات" میں بھی تنقیدی مباحث ملتے ہیں جن سے موصوف کی تنقیدی صلاحیتوں کا اندازہ ہو سکتا ہے

جموں یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے زیر اہتمام بھی کئی گراں قدر مقالے تحقیق و تنقید کے حوالے سے لکھے گئے جن میں سے بعض تو شائع ہو چکے ہیں اور بہت سے مقالے ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔ ان میں ڈاکٹر ظہور کا "بیسویں صدی کے اُردو ادب پر انگریزی کے ادبی رجحانات"۔ ڈاکٹر منظر اعظمی مرحوم کا "اُردو میں تمثیل نگاری"، ڈاکٹر تہمینہ اختر کا "اُردو ادب میں گاندھیائی اثرات اور ملی عباس حسینی کا فن"، ڈاکٹر ضیاء الدین کا "خواجہ احمد عباس"

ڈاکٹر شجاعت عنایت ملک کا "قرۃ العین حیدر بحیثیت افسانہ نگار اور گردش رنگ چمن" ڈاکٹر صابر مرزا کا "صوبہ جموں کے اُردو ادب میں علاقائی زبانوں کے اثرات"، سردار کرتار سنگھ کا "بیدی کا فن" ڈاکٹر سکھ چین سنگھ کا "جوش کی نثری خدمات" قابل ذکر ہیں۔ مذکورہ مقالات تنقید کے ضمن میں آتے ہیں جن سے اُردو تنقید میں گرانقدر اضافہ ہوا ہے۔

نئی نسل سے تعلق رکھنے والے بعض نوجوان بڑی صلاحیتوں کے مالک ہیں جنہوں نے تنقید کے میدان میں قدم رکھا ہے۔ ان میں ڈاکٹر خورشید احمد صدیقی، ڈاکٹر اسداللہ وانی، ڈاکٹر مجید مضمر، ڈاکٹر بشیر احمد نحوی، ڈاکٹر نصرت چودھری، ڈاکٹر ضیاء الدین، پریمی رومانی، یوسف سلیم، منیب الرحمان چند اہم نام ہیں۔ ڈاکٹر خورشید احمد کی تصنیف "اُردو زبان مختلف نظریے اور حقائق" موضوع کی مناسبت سے تحقیقی کتاب ہے لیکن اس میں تنقیدی عنصر بھی موجود ہے۔

ڈاکٹر اسداللہ وانی کی تصانیف "شیخ العالم ایک مطالعہ" اور "اقبالیات آزاد" تنقیدی حوالے سے اچھی کتابیں ہیں۔ "شیخ العالم ایک مطالعہ" میں شیخ العالم کی حیات و خدمات کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اسی طرح "اقبالیات آزاد" میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی ادبی خدمات کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے ڈاکٹر مجید مضمر نے علامتی افسانوں پر کام کیا ہے۔ اُن کے متعدد تنقیدی مضامین شائع ہو چکے ہیں جن سے اُن کی تنقیدی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔

ڈاکٹر نصرت چودھری کی تصانیف "فیض کی شاعری ایک مطالعہ" "فیض احمد فیض روایت اور انفرادیت" میں فیض کی شاعری اور انفرادیت کا تجزیہ ہے جس سے جدید تنقید نگاری میں اضافہ ہوا ہے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کی تصانیف

"خواجہ احمد عباس اور اسالیبِ نثر پر ایک نظر" اپنے موضوع کے اعتبار سے اہمیت کی حامل ہیں ان میں بعض نئے تنقیدی نظریات کو ابھارا گیا ہے۔ برجی رومانی کی تنقید و تحقیق کے حوالے سے جو کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں اُن میں "اوراق"، "تحریر و تقریر"، "انتخاب مضامین"، "ردِ عمل" قابلِ ذکر ہیں۔ مذکورہ کُتب سے برجی رومانی کی تنقیدی صلاحتوں کا معروضی مطالعہ سامنے آتا ہے۔ یوسف سلیم وجودیت کے فلسفے سے متاثر ہیں اور اُردو شاعری میں ان ہی اثرات کو تلاش کرتے ہیں اس سلسلے میں اُن کے چند مضامین شایع ہو چکے ہیں۔

اُردو تنقید نگاری کا ذکر کرتے ہوتے ریاست کی ادبی اُنجمنوں اور رسائل کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں جموں کی بزم ادب شعبہ اُردو، جموں و کشمیر اُردو فورم، رسا جاودانی میموریل لٹریری سوسایٹی، اُنجمن فروغِ اردو، اُنجمن محبانِ اُردو اور کشمیر کی اُردو سبھا، اُنجمن ترقی پسند مصنفین، بزم ادب شعبہ اُردو کشمیر یونیورسٹی قابلِ ذکر ہیں اور رسایل میں امر سنگھ کالیج کا میگزین "لالہ رخ" "آزاد" سرینگر سے شایع ہوتا ہے، اکونگ پوش ماہنامہ تعمیر جموں سے نکلنے والے رسائل میں نوری چھم، دھنک، دیہات سدھار حریم ناز قابل ذکر ہیں۔ مذکورہ رسایل اور اُنجمنوں سے لوگوں میں تحقیق و تنقید کی ایک تحریک پیدا ہوئی۔ پروگراموں میں جو تنقیدی مقالات پڑھے جاتے ہیں۔ وہ ان رسایل کے ذریعے چھپ کر منظرِ عام پر آتے جن سے اُردو تنقید میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ اُنجمنوں کے فعال نوجوانوں میں شمیم احمد شمیم مرحوم آبین بنجارہ اور ڈاکٹر شہاب عنایت ملک کے نام قابل ذکر ہیں۔ شمیم احمد شمیم کے جذبات کو سراہتے ہوتے ڈاکٹر برج پریمی رقمطراز ہیں:-

"شمیم ایک آندھی کی طرح اٹھے اپنی شعلہ بیانی اور قلم کے تیکھے

انداز سے بہت ہی قلیل عرصہ میں پوری ادبی فضا پر چھا گئے۔"

آخر میں اُن عالموں، فاضلوں، دانشوروں، محققین اور نقادوں کا ذکر کرنا ضروری ہے جن کا تعلق اگرچہ اس ریاست سے نہیں مگر یہ حضرات اُردو ادب کی آبرو ہیں اور اُردو دنیا میں کون ایسا ہے جو ان کے کارناموں سے واقف نہیں یہ حضرات برسوں سے ہمارے درمیان موجود رہے اور بعض حضرات ابھی تک اقامت پذیر ہیں۔ یہیں پر انہوں نے تنقیدی کارنامے انجام دیے جن سے اُردو دُنیا نے راہ و روشنی پائی۔ پنڈت برج موہن کیفی، جعفر علی خان اثر، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر زور، پروفیسر آل احمد سرور، پرویز شکیل الرحمان، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر گیان چند جین، پروفیسر عالم خوندمیری، ڈاکٹر جعفر رضا، پروفیسر منظر اعظمی مرحوم، پروفیسر شیام لال کالرا، پروفیسر عبدالقادر سروری، مظہر امام وغیرہ کے تنقیدی کارناموں سے اُردو ادب کے قارئین بہ خوبی واقف ہیں۔

ان مقتدر عالموں میں آل احمد سرور، شکیل الرحمان، جگن ناتھ آزاد، منظر اعظمی اور شیام لال کالرا کا قیام نسبتاً طویل ہے۔ سرور صاحب اُردو تنقید کی سب سے بلند قامت شخصیت ہیں۔ اُنھوں نے اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی میں بھی اُردو تنقید کی گرانقدر خدمات انجام دیں۔ اُن کے سائے میں اُردو ادبی تنقید کے بال و پر نکل آئے۔ لیکن سرور صاحب کی آواز منفرد و مختلف رہی۔ وہ قدیم و جدید دونوں طرح کے نظریات اپنانے والوں کے قریب ہیں۔ وہ صرف اقبالیات کے ہی ماہر نہیں ادب کے بیشتر شعبوں پر وہ ماہرانہ نظر کے مالک ہیں۔ شکیل الرحمان کا وطن ثانی کشمیر ہے۔ شکیل صاحب کا شعور اس زمین پر نکھرا اور اُن کے تنقیدی نظریات، نفسیات، جمالیات اور اساطیر پر استوار

؎ ادبی حلقوں میں عابد پشاوری کے نام سے معروف ہیں۔

ہیں۔ وہ اپنے لہجے اور طرزِ فکر سے اُردو کے منفرد ناقد ہیں۔ اُن کی اہم تصانیف ہیں ادبی قدریں اور نفسیات، لاوے کا سمندر، روشنی کی جمالیات، غالب کی جمالیات، فیض کی شاعری، شعور اور تنقیدی شعور، اقبال اور فنونِ لطیفہ قابلِ ذکر ہیں۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد اقبال کے شیدائی ہیں۔ آزاد کا وطن ثانی جموں ہے وہ برصغیر کے مشاہیر شعرا اور ماہر اقبالیات میں شمار ہوتے ہیں جن کا اقبال پر سب سے زیادہ کام ہے۔ اُن کی اہم تصانیف میں اقبال اور کشمیر، اقبال اور مغربی مفکرین، محمد اقبال ایک ادبی سوانح، فکر اقبال کے بعض اہم پہلو، اقبال اور اس کا عہد، اقبال کی کہانی، نشانِ منزل، ہندوستان میں اقبالیات، وطن میں اجنبی، نوائے پریشان، اقبال زندگی شخصیت اور شاعری قابلِ ذکر ہیں۔ آزاد نے اقبال کے اُن اہم پہلوؤں کی طرف توجہ دلاتی ہے جو گوشۂ تاریکی میں پڑے ہوئے تھے۔ عبدالقادر سروری کی تصانیف "کشمیر میں فارسی کی تاریخ اور "کشمیر میں اُردو" اپنی امتیازی اہمیت کی حامل ہے۔ پروفیسر منظر اعظمی مرحوم کی تصانیف میں اُردو میں تمثیل نگاری، سب رس کا تنقیدی جائزہ اور تلاش و تعبیر، چراغِ راہ قابلِ ذکر ہیں۔

پروفیسر شیام لال کالرا کو کلاسکی ادب سے خاصی دلچسپی ہے۔ اُنہوں نے بطور خاص انشا کی نثری خدمات پر کام کیا ہے۔ انشاء سے متعلق تصانیف سے اُن کی تنقیدی صلاحتوں کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی تصانیف اُردو ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی تصانیف میں انشا کے حریف و حلیف، نقطے اور شوشے، تعلقات انشا، ذوق اور محمد حسین آزاد، "نگاہ ہے گا ہے باز خوان، انشاء اللہ خاں انشا قابلِ ذکر ہیں ——— ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ حال میں بھی تنقیدی کام اچھا خاصا ہو رہا ہے ہمارے بہت سارے نوجوان اس میدان میں سرگرم عمل ہیں۔

پرتیمی رومانی*

# اردو کے تئیں ریاست کے ادبی اداروں کا رول

علمی و ادبی اداروں کی افادیت سے انکار نہیں۔ علم و ادب کو فروغ دینے میں جہاں اخبارات اور رسائل و جرائد، لائبریریاں اور دانش کدے فعال ثابت ہو سکتے ہیں۔ وہاں نشریاتی اداروں، انجمنوں اور ادبی اور تمدنی اداروں کے رول کو کسی بھی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ریاست جموں و کشمیر اردو زبان و ادب کا گہوارہ رہی ہے۔ یہاں کے علم و ادب، تہذیب و تمدن اور کلچر کو فروغ دینے میں یہاں کے اخبارات کے ساتھ ساتھ مختلف ادبی، ثقافتی اور تہذیبی اداروں کا بھی زبردست ہاتھ رہا ہے۔ ریاست میں گزشتہ ایک صدی کے دوران کئی ایسے ادارے وجود میں آئے جن سے ہمارے کلچر، تہذیب اور ادب کو بے پناہ وسعت اور ترقی ملی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ادبی اور تمدنی ادارے تہذیبی قدروں کے پھیلاؤ، فنکاروں اور ادیبوں کو جمع کرنے اور ان کو ایک ہی پلیٹ فارم پر لاکر اُن کی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کرنے کے معاملے میں سرگرم رول ادا کرتے ہیں۔ ہمارے علمی و ادبی اور تہذیبی ادارے ریاست کے طول و عرض میں وقتاً فوقتاً مشاعروں، مذاکروں، مباحثوں، سیمیناروں، سمپوزیموں اور تقاریر کا اہتمام کرتے رہے ہیں لیکن ان اداروں اور انجمنوں کے ساتھ ساتھ اُردو زبان و ادب کو فروغ دینے میں ریاست کے مختلف کالجوں کی طرف سے منعقد کئے گئے ادبی تقاریب کی پہل کو صرفِ نظر نہیں کیا

* ۱/۲ نعیب نگر جانی پور۔ جموں توی

جا سکتا۔ جہاں اساتذہ کے ساتھ ساتھ باذوق طلبا چھوٹے چھوٹے ادبی و ثقافتی ادارے قائم کرتے رہے۔ یہ ادارے "بزم ادب" کے نام سے موسوم تھے[1] اس کے ساتھ ساتھ ریاست میں اُردو کو فروغ دینے میں محرّم کی مجلسوں کا بھی ہاتھ رہا ہے[2]۔ اس قسم کی محفلیں جموں اور سری نگر کے مختلف علاقوں میں آراستہ ہوتی تھیں اور اب بھی یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔

ریاست کے علمی و ادبی اداروں اور انجمنوں کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہوئے ہمارے ذہن میں ایک ایسی علمی و ادبی انجمن کا نام آتا ہے جو اس صدی کے اوائل میں "مفرح القلوب" کے نام سے میر منشی سراج الدین احمد خان نے اپنے چند ہم عصروں چودھری خوشی محمد ناظر، محمد حسن عارف اور مرزا اسعد الدین سعد کے اشتراک سے قائم کی اور ریاست میں باضابطہ طور پر ادبی سرگرمیوں کا آغاز کیا[3]۔ ان ادبی سرگرمیوں نے زیادہ سے زیادہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ اس انجمن کی تقاریب میں بعض سرکردہ علمی و ادبی شخصیات حصہ لیتی رہیں جن میں شیخ عبدالقادر، علامہ اقبال جیسے سربرآوردہ ادیب بھی شامل ہوتے تھے[4]۔ یہ انجمن ایک عرصہ تک مشاعروں اور محفلوں کے ذریعے سے علمی و ادبی خدمات انجام دیتی رہی۔ انجمن وقتاً فوقتاً ڈل کے پانیوں پر تیرتی ہوئی کشتیوں میں مشاعروں کا اہتمام بھی کرتی رہی اور اس طرح سے خاص و عام میں کشمیر کا یہ علمی و ادبی ادارہ مقبول ہو گیا۔

انجمن مفرح القلوب کی ادبی اور علمی سرگرمیاں دیکھ کر ۱۹۰۵ء میں انجمن نصرۃ الاسلام کے نام سے ایک اور ادبی انجمن کا قیام عمل میں آیا۔ اس انجمن کے روح رواں میر واعظ غلام رسول شاہ صاحب تھے[5]۔

---

[1] کشمیر میں اُردو (دوسرا حصہ) از پروفیسر عبدالقادر سروری ص ۵،۸
[2] کشمیر میں اردو از حبیب کیفوی ص ۲۴۔
[3] جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو و نما۔ از ڈاکٹر برج پریمی ص ۱۳۲
[4] جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو و نما از ڈاکٹر برج پریمی ص ۱۳۳
[5] کشمیر میں اردو، از حبیب کیفوی، ص ۴۷۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس انجمن نے علم و ادب کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ سماجی، اصلاحی اور دینی خدمات بھی انجام دیں۔ اس کے جلسوں اور مشاعروں میں منشی امیر الدین امیر، صادق علی خان، محمد الدین فوقؔ اور منشی غلام محمد خادم وغیرہ شامل ہوتے تھے۔ انجمن کے بعض جلسوں میں پنڈت ہر گوپال خستہ بھی شریک ہوتے تھے۔ انجمنِ نصرۃ الاسلام دراصل لاہور میں قائم کی گئی "انجمنِ حمایت الاسلام" کے طرز پر چلنے والی انجمن تھی اور اس کے اراکین سر سید احمد خان سے متاثر تھے اور ان کا نصب العین کشمیر کے مسلمانوں کو مغربی تعلیم سے آراستہ کرنا اور اس قوم کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرنا تھا۔ اس انجمن نے کشمیر میں علم و ادب کی ترقی و بقا کے لئے اہم رول ادا کیا۔ چنانچہ انجمن کی طرف سے مختلف مقامات پر مدرسے قائم کئے گئے اور لوگوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کا کام عمل میں لایا گیا۔

"بزمِ سخن" ایک اور علمی و ادبی انجمن تھی جو پنڈت دینا ناتھ مستؔ کاشمیری کی کوششوں سے ۱۹۰۴ء میں جموں میں قائم ہوئی۔ اس انجمن کے ساتھ مست کے علاوہ ہرکھم، اور دوست وشوا ناتھ درماہ جموی اور قیس شیروانی بھی وابستہ تھے۔ اس انجمن کا دائرہ کار پہلے پہل تو جموں تک ہی محدود تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ علم و ادب کے ساتھ لوگوں کی بے پناہ دلچسپی کو دیکھ کر اس انجمن کی طرف سے سری نگر میں بھی ایک شاخ قائم کی گئی۔ اس طرح سے اس کا نام بعد میں "بزمِ سخن جموں و کشمیر" رکھا گیا۔ انجمن کی ہفتہ وار میٹنگوں میں طرحی کلام پیش کیا جاتا رہا۔ اس انجمن کی طرف سے بعض موقعوں پر شاندار تقاریب کا اہتمام کیا گیا، جن میں جوشؔ، ساغرؔ، حفیظؔ، تاجور نجیب آبادی، اختر شیرانی، روشؔ صدیقی، احسان دانش اور قمر جلال آبادی وغیرہ جیسے شعرا حصہ لیتے رہے۔ "بزمِ سخن" کے ساتھ ساتھ "بزمِ مشاعرہ" بھی جموں میں کافی عرصہ تک علم و ادب کو فروغ دینے میں سرگرمِ عمل رہی۔ اس کے اجلاس عام طور پر جموں کے عجائب گھر میں ہوا کرتے تھے۔ یہ انجمن ۱۹۱۴ء کے آس پاس جموں میں قائم ہوئی۔ اس کے اراکین میں سردار وزیر محمد خان،

صاحبزادہ محمد عمر، منشی غلام علی حسرت اور غلام حیدر خان غوری وغیرہ شامل تھے۔ انجمن کی تقاریب میں جو کلام پیش کیا جاتا تھا اس کو کتابی صورت میں شائع کرنا اس ادارے کی خاص کارکردگی رہی ہے۔ حبیب کیفوی اس انجمن کی کارکردگی پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنی کتاب میں رقمطراز ہیں:

"یہ بزم ہفتہ وار مشاعروں کے بجائے پندرہ روزہ مشاعرے جموں کے عجائب گھر میں منعقد کرتی۔ اس میں بڑی کثرت سے صاحبِ ذوق حضرات شرکت کرتے۔ حکومت کے اعلیٰ عہدیدار بھی شامل ہوتے اور گھنٹوں شعر اور سخن کا دور چلتا رہتا۔ بزم کبھی کبھی اپنے مشاعروں میں پڑھا جانے والا کلام کتابچوں میں بھی شائع کرتی، جس پر بزمِ سخن کے اراکین کتابچوں پر تنقیدی پمفلٹ شائع کرتے۔ اس طرح بڑی دلچسپ ادبی بحثیں شروع ہو جاتیں۔"[1]

یہ انجمن چند برسوں تک علمی و ادبی خدمات انجام دیتی رہی۔ چوں کہ اس انجمن کے ساتھ بیشتر سرکاری ملازمین وابستہ تھے۔ اس لئے اس کا شیرازہ اس وقت بکھر گیا جب ان کا تبادلہ ریاست کے دوسرے مقامات پر ہو گیا۔

بیسویں صدی کے تیسرے دہے کے آس پاس مولانا مبارک شاہ فطرت گیلانی نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ایک اور انجمن "اخوان الصفا" کی بنیاد ڈالی۔ بعد میں حیرت کاملی اور محمد امین دارآب جیسے علما اس انجمن کے ساتھ وابستہ ہو گئے اور اس میں نئی جان پھونک دی۔ یہ لوگ اُردو کے علاوہ فارسی زبان و ادب پر بھی دسترس رکھتے تھے لہٰذا اُردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی شعر گوئی کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

ریاست جموں و کشمیر میں ادبی انجمنوں اور علمی اداروں کی روایت برقرار رکھنے میں

---

[1] کشمیر میں اردو۔ از حبیب کیفوی۔ ص ۴۵

یہاں کے اہل علم حضرات پیش پیش رہے ہیں۔ انہوں نے اس روایت کو آگے بڑھانے میں ہر دور میں سرگرم حصہ لیا اور اُردو کے کاز کو آگے بڑھایا۔ ۱۹۳۶ء میں ملک کے دوسرے حصوں میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کی شاخیں قائم کی گئیں۔ کشمیر میں اس کی بنیاد کا پہلا پتھر مشہور افسانہ نگار پریم ناتھ پردیسی مرحوم نے ۱۹۴۲ء میں رکھا۔ اس انجمن کے پروگرام آگے بڑھانے میں پردیسی کے ساتھ ساتھ ان کے ہمعصر رامانند ساگر بھی پیش پیش رہے۔ ابتدا میں اس کی نشستیں پردیسی کے گھر پر ہوا کرتی تھیں[1] لیکن بعد میں جب اس کا دائرہ وسیع ہوگیا تو یہ نشستیں سری پرتاپ کالج سری نگر کے ہال میں ہونے لگیں۔ انجمن کی تقاریب میں مقامی اُدبا کے ساتھ ساتھ باہر سے تعلق رکھنے والے قلمکار اور شعرا بھی حصہ لیا کرتے تھے، جن میں خواجہ احمد عباس، بلراج ساہنی، دیویندر ستیارتھی، بیدی، محمود ہاشمی، سہیل عظیم آبادی وغیرہ شامل ہیں۔ اس انجمن کے جلسوں میں شاعر کشمیر مہجور، عبدالستار عاصی، پروفیسر محمود ہاشمی، کنول نین پرواز، قیصر قلندر وغیرہ بھی بڑے شوق سے جایا کرتے تھے اور اپنی تخلیقات پیش کرتے تھے۔ انجمن نے کشمیر میں اُردو شعر وادب کی فضا سازگار بنانے میں اہم رول ادا کیا۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کے ساتھ ساتھ پرنسپل محمد الدین تاثیر کی قیادت اور رہنمائی میں اُردو سبھا کے نام سے ایس پی کالج سری نگر میں ایک اور ادبی انجمن قائم کی گئی۔ اس کے ممبران باذوق نوجوانوں کے ساتھ ساتھ ریاست کی کئی سرکردہ ادبی شخصیتیں تھیں۔ اس کا مقصد بھی ریاست میں علم وادب کو فروغ دینا تھا۔ محمد الدین تاثیر خود بھی ایک جانے پہچانے شاعر اور ادیب تھے۔ وہ کشمیر سے تعلق رکھنے والے شاعروں اور ادیبوں کی صلاحیتوں سے واقف تھے اور ساتھ ہی ساتھ ادبی محفلوں اور مجالس کے دلدادہ تھے۔ انہوں نے اُردو سبھا کی اور سے بہت ہی یادگار جلسے منعقد کئے

---

[1] جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشوونما از ڈاکٹر برج پریمی، ص ۱۳۴۔ ۱۳۵۔

بڑے شاندار مشاعرے کرواتے۔ ایس پی کالج کی یہ ادبی محفلیں ہمیشہ یاد کی جائیں گی۔

۱۹۴۶ء میں سرینگر کے اندرونی علاقے فتح کدل میں کشمیری زبان کے سرکردہ شاعر مرزا عارف نے "بزم ادب" کے نام سے ایک اور انجمن کا قیام عمل میں لایا۔ اس انجمن نے بھی اُردو کے ساتھ ساتھ کشمیری زبان وادب کے فروغ دینے کے لئے کام کیا۔ اس انجمن نے بھی مشاعروں اور مباحثوں کے ساتھ ساتھ اشاعت کا کام عمل میں لایا۔ چنانچہ "گلریز" نام کے رسالے کے ساتھ ساتھ کئی کتابیں ادارے کی طرف سے شائع ہوئیں جن میں "حبہ خاتون" اور "رباعیاتِ عارف" قابل ذکر ہیں[1]۔

۱۹۴۷ء کے قبائلی حملے کے دوران ریاستی ادیبوں، فنکاروں اور شاعروں نے کلچرل فرنٹ کے نام سے ایک ثقافتی اور ادبی محاذ منظم کیا۔ یہ ایک ہنگامی تنظیم تھی اگرچہ اس میں ادب سے زیادہ سیاسی مقاصد کارفرما تھے لیکن اس تاریک دور میں اس انجمن نے جو کارکردگی دکھائی، اس کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس انجمن کا رول تاریخی بھی رہا ہے اور تعمیری بھی۔ کلچرل فرنٹ کو بعد میں کلچرل کانگریس کا نام دیا گیا۔ اس کے تین شعبے تھے:۔

۱۔ ادیبوں اور شاعروں کا شعبہ۔

۲۔ مصوروں کا شعبہ اور۔

۳۔ تھیٹر کا شعبہ۔

چنانچہ انجمن کی طرف سے مشاعروں اور مباحثوں کا انعقاد کیا گیا۔ چونکہ اردو زبان کو اپنی شیرینی اور مٹھاس کی وجہ سے ہر ایک زبان پر سبقت حاصل تھی اس لئے انجمن کی طرف سے سٹیج پر کھیلا جانے والا اولین ڈرامہ اردو کا ہی تھا جو پروفیسر

---

[1] ماہنامہ تعمیر سرینگر (جموں وکشمیر اردو ادب نمبر) جلد ۱۴، شمارہ ۲، ۱۹۸۳ء ص ۱۵۴

محمود ہاشمی نے "کشمیر یہ ہے" کے نام سے لکھا۔ ڈرامے کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کے گانے کشمیری زبان میں لکھے گئے۔ اس ڈرامے میں پہلی بار مردوں کے ساتھ ساتھ زنانہ فنکاروں نے حصہ لیا۔[1] اسی دور میں پردیسی نے شہید تیسر واتی کے نام سے ایک ڈرامہ لکھا۔ اس ڈرامے کے گانے شاعر کشمیر مہجور نے لکھے تھے۔ کلچرل فرنٹ کے سرپرست خواجہ غلام محمد صادق تھے اور اس کے روح رواں مشہور ناول نگار اور نقاد شودھان سنگھ چوہان تھے۔ کلچرل فرنٹ یا کلچرل کانگریس کے ساتھ پیر عبدالاحد، غلام رسول رینزو، پیر غیاث الدین، موتی لال مصری، پران ناتھ جلالی، بدری ناتھ نشاط، مدھوسودھن کوشر وغیرہ جیسے دانشوروں اور قلم کاروں کے ساتھ ساتھ چند بزرگ ادیب اور شاعر بھی شامل ہوئے جن میں مہجور اور ماسٹر زندہ کول کا نام پیش پیش ہے۔ نئی نسل سے تعلق رکھنے والے جو قلم کار اور دانشور اس جماعت سے وابستہ تھے ان میں نادم، راہی، کامل، مہندر ناتھ، نور محمد روشن، عزیز ہارون، حبیب کامران، ارجن دیو مجبور، اختر محی الدین، سوم ناتھ زتشی، تیج بہادر بھان، قیصر قلندر، بنسی تردوش، علی محمد لون، دیپک کول وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ اس انجمن کی طرف سے "آزاد" کے نام سے ایک رسالہ بھی شائع ہوتا رہا۔

۱۹۴۷ء کے بعد ریاست میں علمی و ادبی اداروں کی طرف زیادہ توجہ دی جانے لگی۔ نہ صرف پرائیویٹ طور پر کئی انجمنیں اور علمی ادارے ابھرے بلکہ سرکاری سطح پر بھی کئی اہم ادارے قائم کئے گئے اور اس طرح سے اردو شعر و ادب کو زیادہ سے زیادہ فروغ ملا۔ سرکاری اداروں میں جموں اور کشمیر کے ریڈیو اسٹیشن، ٹیلی ویژن سینٹر، جموں اور کشمیر کی یونیورسٹیوں کے اردو کے شعبے، کلچرل اکادمی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ وہ ادارے ہیں جو اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمت کرتے آئے ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں

---

[1] مباحث، از ڈاکٹر برج پریمی ص ۹۶۔

ریڈیو کشمیر سرینگر قائم ہوا۔ اس کی نشریات کا آغاز باضابطہ طور پر اردو سے ہی ہوا۔ آل انڈیا ریڈیو کی اردو مجلس کے بعد ریڈیو کشمیر سرینگر ہی ایک ایسا اسٹیشن ہے جو زیادہ سے زیادہ پروگرام اردو زبان میں نشر کرتا رہا ہے۔ ریڈیو کے اردو پروگراموں کی ترتیب دینے میں ابتدا میں جن اہم شخصیات کا ہاتھ رہا ہے اُن میں خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سہیل عظیم آبادی، کمال احمد صدیقی اور کے کے نیر وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ پردیسی، ٹھاکر پونچھی، میکش کاشمیری، عبدالحق برق، پران کشور، پشکر بھان، قیصر قلندر، سوم ناتھ سادھو وغیرہ جیسے قلمکاروں نے ڈراموں، موسیقی، خبروں، فیچروں، مباحثوں کا اہتمام کر کے ریڈیائی پروگراموں میں نئی روح پھونک ڈالی اور اپنی بھرپور صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ ریڈیو کشمیر سری نگر سے سب سے پہلا اردو ڈرامہ "چودہ گولیاں" کے نام سے نشر ہوا۔ یہ ڈرامہ خواجہ احمد عباس نے لکھا۔ اس کے بعد بے شمار اردو ڈرامے پیش کئے گئے۔ ان میں سے بعض ڈرامے قومی ایوارڈ کے لئے منتخب ہوئے۔ ڈراموں کے علاوہ ریڈیو کشمیر سری نگر وقتاً فوقتاً آل انڈیا مشاعروں کا بھی اہتمام کرتا رہا۔ یہ روایت تادم تحریر جاری و ساری ہے۔ ۱۹۴۹ء میں ریڈیو کشمیر کی طرف سے ایک عظیم الشان مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں مقامی شعرا کے ساتھ ساتھ باہر سے آئے ہوئے بعض نامور شعراء نے حصہ لیا۔ ریڈیو سے سامعین کی دلچسپی کے لئے اردو کے مختلف ادبی ثقافتی پروگرام بھی نشر ہوتے ہیں۔ اس طرح سے ریڈیو اردو زبان کی توسیع کے لئے بہت ہی اہم رول ادا کر رہا ہے۔ نہ صرف ریڈیو کشمیر سرینگر ہی بلکہ ریڈیو کشمیر جموں اور ریڈیو کشمیر لداخ بھی مقامی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کی فلاح و بقا کے لئے بڑا مفید کام کر رہے ہیں اور اردو کے معیاری پروگرام نشر کرتے ہیں۔ اب چند برسوں سے ریڈیو جموں کی طرف سے آل انڈیا مشاعرے منعقد ہوتے ہیں۔ جن میں ملک کے مختلف شہروں سے تعلق رکھنے والے شعراء حصہ

لیتے ہیں۔

ریاستی کلچرل اکادمی بھی اردو زبان و ادب کی ترقی و بقا کے لئے سالہا سال سے کام کرتی آئی ہے۔ یہ ادارہ صدر ریاست ڈاکٹر کرن سنگھ نے ۱۹۵۸ء میں جموں و کشمیر کے آئین کی دفعہ ۱۴۶ کے تحت قائم کیا۔ اس کے صدر ریاست کے وزیر اعلیٰ ہیں۔ اکادمی ریاست کے تینوں خطوں کے درمیان تمدنی رشتہ قائم کرنے میں سرگرم رول ادا کرتی ہے اور ریاست جموں و کشمیر کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے باصلاحیت لوگوں کے کارناموں کی حوصلہ افزائی کرتی رہی ہے۔ اکادمی نے نہ صرف ڈوگری، کشمیری، لداخی، گوجری، پنجابی اور تہذیبی ادب کی ترویج میں نمایاں کام انجام دیا ہے بلکہ اردو زبان و ادب کی ترقی و بقا کے لئے اکادمی کے رول کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس بلند پایہ علمی و ادبی ادارے کی طرف سے اب تک باقی تمام علاقائی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کی درجنوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں کشمیر میں اردو (تین حصوں میں)، کشمیری زبان اور شاعری، کشمیر میں عربی ادب کی تاریخ، جدید ڈوگری ادب کا ارتقاء، انتخابِ اُردو ادب، محفلِ اقبال، پربت اور پنگھٹ، ریشیات، ساز کی لے تیز کرو، وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کتابوں کے ساتھ ساتھ اکادمی کی طرف سے ۱۹۶۲ء میں اُردو دوماہی جریدہ "شیرازہ" کا اجرا ہوا۔ جریدے کی ادارت کے فرائض جناب محمد یوسف ٹینگ کو تفویض کئے گئے، جنھوں نے قلیل عرصے میں اسے ملک کے مقتدر ادبی رسائل کی صف میں لا کھڑا کیا۔ ٹینگ صاحب کافی عرصہ اس جریدہ سے منسلک رہے۔ آج کل جناب محمد احمد اندرابی اس کے مدیر ہیں۔ یہ جریدہ باقاعدگی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ اس جریدے کو نہ صرف ریاست کے قلم کاروں اور شاعروں کا تعاون حاصل ہے بلکہ یہ ملک کے مختلف حصوں سے تعلق رکھنے والے ادیبوں اور شاعروں کا تعاون حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہوا ہے۔ گزشتہ برسوں میں اس جریدے کے عام شماروں کے علاوہ

متعدد خاص نمبر منظر عام پر آئے جن میں لل دید نمبر، ثقافت نمبر، مہجور نمبر، شیخ العالم نمبر، پریم چند نمبر، افسانہ نمبر، تروز نمبر، اقبال نمبر، حسن نمبر، فوق نمبر، اردو کانفرنس نمبر، کامگار نمبر، عجائبات نمبر، مغل نمبر، شاہ ہمدان نمبر، صوفیانہ موسیقی نمبر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ شیرازہ کے ساتھ ساتھ اکادمی کی طرف سے ہر سال کے آخر پر "ہمارا ادب" کے نام سے ایک مجلد شائع ہوتا ہے جس کے کئی یادگار نمبر جیسے لوک ادب نمبر، مشاہیر نمبر (دو جلد) شیرازہ انتخاب نمبر، جموں کشمیر نمبر (۵ جلد) شخصیات نمبر (۵ جلد) اور اولیاء نمبر (چار جلد) چھپ کر ادبی حلقوں میں دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اکادمی کی طرف سے ایک خوبصورت "خبر نامہ" بھی سالہا سال تک شائع ہوتا رہا جس میں اردو زبان و ادب کے بارے میں مفید معلومات شائع ہوتی رہیں۔ اکادمی ہر سال مختلف ادیبوں کو کتابیں شائع کرنے کے لئے مالی امداد فراہم کرتی ہے۔ بہترین کتاب پر ہر سال انعام دیا جاتا ہے۔ اس طرح سے اس علمی و ادبی ادارے کی طرف سے اردو کی کافی ترقی ہوتی ہے۔

دوردرشن کیندر بھی ایک اور ثقافتی ادارہ ہے جو گوجری، ڈوگری، پنجابی، بھدرواہی، کشمیری وغیرہ جیسی زبانوں میں خبریں، فیچر، ڈرامے، نظمیں، بحث و مباحثے، گانے وغیرہ شروع سے ہی پیش کرتا رہا ہے۔ ان تمام زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں مختلف نوعیت کے پروگرام بھی پیش کئے جا رہے ہیں۔ سرکاری زبان ہونے کے ناطے دوردرشن کیندر کی نشریات میں کشمیری کے بعد اردو کو ہی فوقیت حاصل ہے۔ چنانچہ ہر ماہ "دھنک" کے نام سے ماہانہ اردو پروگرام دوردرشن سے ٹیلی کاسٹ ہوتا ہے جو خالص علمی و ادبی نوعیت کا ہوتا ہے۔ نوجوانوں کے لئے "نئے چراغ"، اور ریسرچ اسکالروں کے لئے "عکس و آہنگ" جیسے اردو کے پروگرام ایک زمانے سے ٹیلی کاسٹ ہوتے رہے ہیں اس کے علاوہ ڈرامے، فیچر، مشاعرے اور قومی یکجہتی کے موضوع پر بہت سے

پروگرام وقتاً فوقتاً دوردرشن کیندر سے پیش ہوتے رہے ہیں۔ جو خالص علمی و ادبی نوعیت کے پروگرام ہوتے ہیں۔

گزشتہ چند برسوں سے یہ پروگرام کافی مقبول ہو رہے ہیں اور اردو پروگراموں کے ناظرین کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ اب صوبہ جموں میں بھی ایک الگ اسٹیشن قائم کیا گیا۔ اور اس نے گزشتہ تین چار سال سے کام کرنا شروع کیا ہے۔ اس کیندر کی طرف سے بھی اردو کے بعض معیاری اور قابل تعریف پروگرام پیش ہو رہے ہیں۔

سری نگر اور جموں یونیورسٹیوں کے پوسٹ گریجویٹ اردو کے شعبہ جات بھی ریاست میں علم وادب کے بڑے مراکز میں شمار ہوتے ہیں۔ یہاں اردو زبان وادب کی تعلیم دی جارہی ہے۔ شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی نے ۱۹۵۸ء سے کام کرنا شروع کیا ہے اس طرح سے آج تک ہزاروں کی تعداد میں طلبا اور طالبات اردو کی تعلیم سے مستفید ہوئے۔ ان طلبا اور طالبات میں بہت سے شاعر، افسانہ نگار، ادیب اور فنکار ابھرے۔ یہ اس زبان کے ساتھ محبت اور عقیدت کا جذبہ ہی ہے کہ طلبا اور طالبات میں روز افزوں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ تحقیق کے میدان میں بڑی تیزی آئی ہے اور اردو زبان وادب کے مختلف موضوعات پر سالہاسال سے تحقیقی کام ہوتا رہا ہے۔ علم وادب کے جن موضوعات پر آج تک شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی میں تحقیق ہوئی ہے ان میں درج ذیل موضوعات قابل ذکر ہیں۔

"اردو نظم پر یورپی اثرات — آغا حشر کاشمری"۔ سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے"۔ "اردو اور کشمیری شاعری میں رومانیت" "اردو ناول میں کردار نگاری"۔ "اردو تنقید میں غالب شناسی"۔ "اردو تنقید میں اقبال شناسی"، "اردو شاعری میں میر کی روایت"، "۱۹ ویں صدی کی اردو

نثر میں سماجی طنز"، "مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر نگاری"، "عصمت چغتائی ۔ شخصیت اور فن"، "کشمیری غزل پر اردو غزل کے اثرات" وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

شعبے کی طرف سے "بازیافت" کے نام سے ایک رسالہ بھی شائع ہوتا ہے ۔ جس میں ملک کے مختلف حصوں سے تعلق رکھنے والے اعلیٰ پایہ کے محققوں، شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ ریاست کے نامور ادیبوں کی تخلیقات شائع ہوتی ہیں۔ شعبے کی طرف سے "آگہی" کے نام سے ایک خبر نامہ بھی شائع ہوتا ہے۔

شعبہ اردو جموں یونیورسٹی بھی ایک باوقار شعبہ ہے ۔ یہ بھی علم و ادب کا ایک نمائندہ مرکز ہے۔ اس کی عمر اگرچہ شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کے مقابلے میں کم ہے لیکن اس علمی و ادبی ادارے کی کارکردگی صرفِ نظر نہیں کی جاسکتی ۔ شعبے کی طرف سے وقتاً فوقتاً مختلف علمی و ادبی موضوعات پر سیمینار ہوتے ہیں، مشاعروں اور مباحثوں کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ اردو کی ترقی و بقا کے لئے مختلف پروگرام منعقد کئے جاتے ہیں ۔ یہ اردو زبان و ادب سے محبت اور عقیدت کا جذبہ ہی ہے کہ شعبے میں طلبا و طالبات کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوتا جارہا ہے ۔ مختلف علمی و ادبی موضوعات پر تحقیقی کام بھی شروع سے ہی ہوتا رہا ہے۔

ریاست جموں و کشمیر میں علم و ادب کے پھیلاؤ اور توسیع کے لئے کشمیر یونیورسٹی کا اقبالیات سے متعلق شعبہ اقبال انسٹی ٹیوٹ بھی علمی و ادبی خدمات انجام دے رہا ہے ۔ یہ شعبہ مرحوم شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں آج سے تقریباً بیس سال قبل عمل میں آیا اور اس کے سربراہ برصغیر ہند و پاک کے معروف نقاد، شاعر اور ماہر اقبالیات پروفیسر آل احمد سرور مقرر ہوئے۔ اُن کی رہنمائی میں اقبال انسٹی ٹیوٹ ترقی کی راہ پر گامزن رہا انسٹی ٹیوٹ نے سرور صاحب کی سرپرستی میں اقبالیات سے متعلق بہترین لائبریری کا

قیام عمل میں لایا۔ اس لائبریری میں اقبال کے فن اور ان کے فلسفے کو سمجھنے کے لئے کتابوں کا ایک نادر خزانہ ہے۔ اس کے علاوہ اقبالیات کے نام سے ہر سال ایک مجلد شائع ہوتا ہے۔ اس مجلّہ میں اقبال سے متعلق مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں، جن میں اقبال کے فکر و فن کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ اس مجلد نے نہ صرف ملک میں بلکہ برصغیر ہند و پاک کے علمی و ادبی حلقوں میں اپنی ایک الگ شناخت قائم کی ہے۔ اقبال کے مختلف پہلوؤں پر سیمنار کرانا اور کتابیں شائع کرنا اس علمی و ادبی ادارے کی خاص کارکردگی رہی ہے اقبال کے فکر و فن پر اب تک تقریباً دو درجن سے زائد طلبا اور طالبات تحقیق کر چکے ہیں۔

ریاست جموں و کشمیر کے اطلاعات کے محکمے کی کارکردگی اگرچہ اُردو زبان و ادب تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ ایک وسیع محکمہ ہے لیکن پھر بھی اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج میں اس محکمہ کے رول کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ محکمہ کی طرف سے سالہا سال سے ایک جریدہ ماہنامہ تعمیر شائع ہوتا رہا۔ عام شماروں کے ساتھ ساتھ اس جریدے کے کئی شاندار نمبر بھی نکالے گئے جن میں مہجور نمبر، آزاد نمبر، پریم چند نمبر، جموں و کشمیر اردو ادب نمبر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ماہنامہ تعمیر سب سے پہلے ۱۹۵۴ء میں معروف سیاستدان، دانشور اور ادیب مرحوم شمیم احمد شمیم کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اُن کے بعد ادارت کے فرائض نامور ادیب محمد یوسف ٹینگ انجام دیتے رہے۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سب سے پہلے اس رسالے کی ادارت دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی کو سونپ دی گئی تھی۔ ان کی ادارت میں تعمیر کے ایک یا دو شمارے ہی شائع ہوئے۔ چند برسوں تک اس کی ادارت غلام نبی بابا، انصاری اور خالد بشیر کیا کرتے رہے۔ یہ رسالہ کچھ مدت تک بند ہو گیا تھا لیکن اب شکیل ٹینگ کی ادارت میں پھر سے شائع ہونے لگا ہے۔ محکمہ اطلاعات کی طرف سے انگریزی اور ہندی زبانوں میں

کشیر ٹوڈے اور یوجنا جیسے رسائل بھی اس ادارے کی طرف سے شائع ہوتے ہیں ۔ یہ ادارہ اطلاعات کے نام سے ایک خبرنامہ بھی شائع کرتا رہا ہے اور ایک ہفتہ وار اخبار مکتوب بھی ۔ اس محکمے کی طرف سے ابھی چند سال قبل پونچھ کے فوارہ باغ میں اردو کے عظیم افسانہ نگار کرشن چندر کی برسی کے موقعہ پر ایک عظیم الشان تقریب کا اہتمام کیا گیا ۔ اس تقریب میں ریاست کے ادیبوں، دانشوروں اور قلم کاروں نے اس عظیم افسانہ نگار کی شخصیت اور فن پر مقالے پیش کئے اور اس طرح سے انہیں شاندار خراج عقیدت ادا کیا ۔ محکمہ نے اس باغ میں کرشن چندر کا بت نصب کر کے اردو نوازی کا پورا پورا ثبوت فراہم کیا ہے ۔

ریاست کے عجائب گھر اور ڈوگرہ آرٹ گیلری بھی علم و ادب کے لحاظ سے کم اہمیت کے حامل نہیں ۔ ان اداروں میں ہندو عہد، بودھ عہد کے علاوہ افغانوں، مغلوں، سکھوں اور ڈوگروں کے عہد کے قدیم ترین آثار دیکھنے میں آتے ہیں ۔ ان اداروں میں مجسمہ سازی اور مصوری کے اعلیٰ نمونے بھی ملتے ہیں ۔ مختلف قدیم آلہ جات اور مورتیاں وغیرہ بھی کچھ اس طرح سے سجائی گئی ہیں کہ قدیم تہذیب سے متعلق بے شمار معلومات فراہم ہوتی ہیں ۔ ان تمام علمی و ادبی اور تہذیبی اداروں کے ساتھ ساتھ اور بھی کئی ادارے ہیں جن کی اردو زبان و ادب کے تئیں خدمات فراموش نہیں کی جا سکتیں ۔ ایسے اداروں میں کشمیر یونیورسٹی کا سینٹرل ایشین سٹیڈیز، جموں اور کشمیر یونیورسٹیوں کے ہندی، سنسکرت، ڈوگری، بودھی، فارسی، کشمیری اور ہسٹری کے شعبہ جات وغیرہ ۔ ان شعبوں کی طرف سے بھی بڑا اہم اور قابل قدر تحقیقی کام ہو رہا ہے اور اردو میں تو ایسے کئی موضوعات پر تحقیق کرنے والوں کی راہیں استوار ہوئی ہیں ۔

آزادی کے بعد کی سطح پر جن علمی و ادبی اداروں اور انجمنوں نے وقتاً فوقتاً علمی و ادبی تقاریب کا انعقاد کیا، ان میں حلقہ علم و ادب خانیار، ہندی سنسد گنپت یار،

انجمن ارباب ذوق سری نگر، انجمن ادب بڈگام، انجمن ترقی اردو ادب، سیمابی ادبی انجمن، کشمیر کلچرل سوسائٹی، کشمیر کلچرل لیگ سرینگر وغیرہ جیسی انجمنوں اور ادبی اداروں کے نام لیئے جاسکتے ہیں۔ ان اداروں نے وقتاً فوقتاً ریاست میں اردو زبان و ادب کی ترقی اور اس کے فروغ کے لئے بہت مفید کام کیا۔ موجودہ دور میں اقبال اکادمی سری نگر، انجمن فروغ اردو جموں، آل انڈیا ہندی اردو سنگم سری نگر، بزم شعرا سری نگر، ادبی کنج جموں، برج پریمی میموریل کمیٹی جموں، محروم میموریل کمیٹی جموں، رسا جاودانی میموریل لٹریری سوسائٹی جموں، بزم فریدیہ بھدرواہ، بزم ادب کشتواڑ، تلاش ادب سری نگر، اقبال بزم ادب بھدرواہ وغیرہ کے نام لیتے جاسکتے ہیں۔ یہ علمی و ادبی ادارے اور انجمنیں اردو زبان و ادب کو وسعت دینے میں مصروف ہیں۔

انجمن ارباب ذوق سرینگر، ۱۹۵۰ء میں قائم کی گئی۔ اس کے سرگرم اراکین میں تیج بہادر بھان، برج پریمی، وجیہہ احمد اندرابی، حکیم منظور اور مخمور حسین بدخشی شامل تھے۔ یہ انجمن نہ صرف مشاعرے، محفل افسانہ اور محفل مقالات کا اہتمام کرتی رہی بلکہ موسیقی کی محفلیں بھی منعقد کرتی رہی۔

اسی زمانے کے آس پاس ہندی سنسد کے نام سے گنپت یار سری نگر میں ایک اور ادبی تنظیم قائم کی گئی۔ اس تنظیم کے صدر ہندی زبان کے ایک مستند ادیب وسنت تیجسوی تھے اور سیکرٹری کے فرائض برج پریمی انجام دے رہے تھے۔ یہ ہندی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی مختلف ادبی پروگراموں کا انعقاد کرتی تھی۔

"انجمن ادب بڈگام" بھی مقامی ادیبوں کی کوششوں سے قائم ہوئی۔ اس کے صدر فاروق بڈگامی تھے۔ انجمن ترقی اردو ادب سرینگر بھی مقامی ادیبوں کے تعاون سے ۱۹۵۴ء میں قائم ہوئی۔ موجودہ دور میں بھی ریاستی سطح پر کئی انجمنیں اور علمی و ادبی ادارے کام کر رہے ہیں جن میں "اقبال اکادمی" کی طرف سے سری نگر میں

چند یادگار جلسے کئے گئے۔ اس ادارے کی طرف سے علامہ اقبال کی شخصیت اور ان کے فن پر کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ ریاست سے تعلق رکھنے والے مقتدر شعراء اور ادبا کے ادبی کارناموں پر بھی بعض اہم کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں مرزا عارف اور محمد امین بچھ کے ادبی کارناموں پر کتابیں شامل ہیں اس ادارے کے روحِ رواں بشیر احمد نحوی ہیں۔

آل انڈیا ہندی اردو سنگم شاخ سری نگر کی ادبی خدمات بھی کم اہم نہیں۔ اس انجمن کا صدر دفتر لکھنؤ (یو۔پی) میں ہے۔ سنگم نے سری نگر کے گرد و نواح میں چند یادگار ادبی محفلیں منعقد کی ہیں۔ اس انجمن کی طرف سے ۱۹۷۶ء میں ایک شاندار آل انڈیا مشاعرہ منعقد کیا گیا جس میں مقامی شعراء کے علاوہ ملک کے دوسرے حصوں سے آئے ہوئے بعض اہم شاعروں نے حصہ لیا۔ اس تاریخی تقریب میں ریاست سے تعلق رکھنے والے بعض اردو اور ہندی ادیبوں میں ایوارڈ تقسیم کئے گئے۔ سنگم کے سرپرست اعلیٰ اس وقت کے وزیر اعلیٰ (مرحوم) شیخ محمد عبداللہ تھے۔ سنگم کی طرف سے مشہور سیاست دان اور دانشور آنجہانی ڈی، پی، دھر پر ایک سوونیر بھی شائع ہوا۔ اس شاندار تقریب کی کامیابی کا سہرا نذیر احمد نظیر اور پریمی رومانی کے سر باندھا جا سکتا ہے جو اس انجمن کے جنرل سیکرٹری اور سیکرٹری رہے ہیں۔

برج پریمی میموریل کمیٹی جموں بھی ایک علمی و ادبی ادارہ ہے۔ یہ ادارہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ریاست کے معروف ادیب اور نامور نقاد ڈاکٹر برج پریمی کے انتقال کے بعد وجود میں آیا۔ اس ادارے کی بنیاد پروفیسر ظہور الدین، پشکر ناتھ عرش صہبائی، آنند لہر اور پریمی رومانی نے رکھی۔ چنانچہ اس ادبی اور علمی تنظیم کی طرف سے پہلی ادبی تقریب جموں کے جاگرتی نکیتن اسکول میں منعقد ہوئی جس میں

برج پریمی کی پہلی برسی کے موقعہ پر، ان کی شخصیت اور فن سے متعلق مقالات پیش کئے گئے۔ یہ مقالات بعد میں کتابی صورت میں منظر عام پر آئے۔ اس کے علاوہ کمیٹی نے برج پریمی کے غیر مطبوعہ مسودات کو کتابی شکل میں شائع کیا جو قابلِ مطالعہ ہیں۔

اس مختصر سے مضمون میں اُردو کے تئیں ریاست کے تمام علمی و ادبی اداروں کی خدمات پر روشنی ڈالنا ناممکن ہے۔ لہٰذا صرف چند نمایاں علمی و ادبی اداروں کی کارگزاری پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔

○

## قارئین سے گذارش

- "شیرازہ" کے بارے میں اپنی رائے بطورِ خاص مرحمت فرمایئے اور اپنے مشوروں سے ہمیں نوازتے رہیئے۔
- "شیرازہ" کو اپنے دوستوں سے متعارف کرایئے اور خریداری کے لئے توجہ دلا کر اسے زیادہ سے زیادہ ادب نوازوں تک پہنچانے کی کوشش میں ہمارا ساتھ دیجئے

○

عبدالرشید فدا

# اُردو زبان اور جموں و کشمیر

برصغیر ہند و پاک میں ۱۹۴۷ء میں رونما ہوئے سماجی اور سیاسی واقعات سے اُردو زبان کافی متاثر ہوئی اور اسے زک پہونچی اگرچہ برصغیر میں جنگ آزادی کے حوالے سے اردو زبان کا رول بہت ہی اہم رہا ہے۔ اس زبان میں آزادی کے نغمے گاتے ہوئے لوگوں نے خندہ پیشانی سے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کئے، تختہ دار تک پہنچے، کوڑے کھائے، پھانسی کے پھندے چومے۔ غرض لوگوں میں جذبۂ آزادی کو بیدار کرنے، دلوں کو گرمانے، ذہن و ضمیر کو بیدار کرنے، فکر و فہم کو پختہ کرنے، آزادی کے حصول کے لئے غیر متزلزل ارادوں کو جنم دینے اور شعوری و روحانی سطح پر عوام میں سامراجیوں کے خلاف لام بندی کرنے میں اسی گنگا جمنی زبان نے ناقابل فراموش رول ادا کیا۔

جو لوگ ریاست کی تاریخ سے واقف نہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ریاست میں ۱۹۴۷ء کے بعد اردو کا بول بالا ہوا اور اسے آئینی تحفظ ملا۔ ہندوستان کے بیشتر علاقوں سے بے گھر ہونے کے بعد اسے جموں و کشمیر میں پناہ ملی اور گوشۂ عافیت نصیب ہوا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ریاست میں اردو کا چلن اس سے تقریباً پون صدی قبل بھی تھا۔ ڈوگرہ حکمرانوں نے اُس زمانے میں اردو کی طرف توجہ دی تھی اور اسے سرکاری کام کاج کے لئے برتا تھا۔ فارسی کے چل چلاؤ کے حوالے سے یہ ایک اعتراف



★ بہرودٹ۔ راجوری (جے اینڈ کے)

حقیقت بھی تھا اور انتظامی دُور اندیشی بھی، مفاد عامہ بھی تھا اپنی شناخت اور پہچان بھی۔ اس لئے ریاستی آئین ساز اسمبلی کا اردو کو ریاست میں سرکاری زبان تسلیم کرنا بہت بعد کی بات ہے یعنی ۱۹۵۶ء کی۔ جبکہ اُردو اس سے پہلے یہاں کی سرکاری زبان کے طور تسلیم بھی کر لی گئی تھی اور کام کاج میں شامل بھی تھی۔ بلکہ لسے سیدین کمیٹی کی سفارشں کے تحت ریاست میں ذریعہ تعلیم بھی قرار دیا جا چکا تھا۔ ریاستی آئین ساز اسمبلی نے صرف ایک روبہ کار اور روزمرہ کے مسئلے کو مزید استحکام و ترقی اور ترویج کے لئے آئینی صورت دی۔

اُردو "نیا کشمیر" کے آئین کے تحت یہاں کی قومی زبان قرار دی گئی۔ ظاہر ہے اس حیثیت میں اسے سرپرستی حاصل ہوگی۔ اس کے دائرہ کار کو وسعت اور استحکام دینے کے لئے اقدامات کئے جائیں گے۔ حدودِ جموں وکشمیر میں ذریعہ تعلیم یہی زبان ہوگی حکومت کا روزمرہ کا کام کاج اور کارروائی اسی زبان میں ہوگی۔ عوامی افہام وتفہیم اور ترسیل و ابلاغ اسی زبان کے ذریعے ہوگا۔ سرکاری زبان ہونے کے ناطے اسے دیگر ریاستی علاقائی زبانوں پر زیادہ تحفظ و تفوق حاصل ہوگا۔

زبانیں ماضی کے مطالعے حال کے اظہار اور مستقبل کی پیش بندی کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ قومیں نسل درنسل اپنی روح و احساسات، اس کا عصری ارتفاع یا بحران اس کی قوتِ تعمیر و تشکیل زبان کے ذریعے آنے والی پیڑھیوں تک منتقل کرتی ہیں۔ ریاضیاتی یا سائنسی فارمولے اس انتقالِ روح و احساسات پر قادر نہیں ہوتے۔ زبان کوئی بھی ہو اس میں یہ جذبہ اور قوت کار فطرتاً ودیعت ہوتا ہے۔ انسان صرف اقتصادی شناخت اور زندگی کا محتاج نہیں ہے۔ وہ سماجی، سیاسی، روحانی، مذہبی اور آفاقی تخصیت کا مظہر ہے اور محتاج بھی۔ وہ اِن جہات سے متعلقہ احساسات کا حامل بھی ہے اور جویا بھی۔ اس کی زندگی کی یہ جہتیں کسی زبان سے منسلک ہو کر ہی پروان چڑھتی ہیں یا

بہ الفاظ دیگر اس کی شخصیت کی تکمیل و تشریح کسی زبان کے ذریعہ ہی ہوتی ہے۔

ریاست جموں و کشمیر ایک متنوع ریاست ہے۔ زبان، جغرافیہ، تاریخ، ثقافت، مذہب، عقائد و افکار سب متنوع صورت میں یہاں ودیعت ہیں۔ اس ریاست کو مختلف جغرافیائی حالات، تاریخی روایات، ثقافتی توارث اور مختلف لسانی وحدتوں کا گہوارہ یا گلدستہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ ریاستی آئین میں مختلف بولیوں اور زبانوں کی ترقی کی ضمانت اگرچہ موجود ہے لیکن عملاً عوامی احساسات کو نظر انداز کرکے یہاں کی مادری زبانوں کی تعلیم و تدریس کے لئے کوئی طریقہ کار یا وضاحت موجود نہیں۔ نتیجہ ظاہر ہیکہ آجتک متعدد تحریکوں، ہنگامہ آرائیوں، عرضداشتوں اور اجتماعات کے باوجود اس ضمن میں مادری زبانوں کی افادیت و اہمیت کو نہ تسلیم کیا گیا ہے نہ ان کی تعلیم و تدریس کا بندوبست ہوا ہے۔ ملکی طریقہ کار کے برعکس سہ لسانی فارمولے کے بجائے یہاں چار زبانوں کا فارمولا اپنانا چاہئے تھا جس سے مادری زبانوں کی تدریس بھی ممکن ہوتی انتقال فکر و فہم ہوتا اور احساسات کی تصعید و پاسداری بھی۔

ریاستی قومی اور بین الاقوامی زبانوں کی تدریس کے لئے ابتدائی مڈل ہائی اور ہائر سیکنڈری کی سطح منتخب کی جاسکتی ہے، ہر سطح پر ہر بچے کے لئے دو زبانوں کی تدریس و تحصیل لازمی رکھی جائے۔ قومی یا ریاستی زبان ہائی اور ہائر سیکنڈری سطح پر لازمی ایزادی رکھی جائے۔ بچے کو ہر درجے پر فہم و فراست اور نقطۂ نظر آزادی سے انتخاب کی اجازت دی جائے۔

مادری اور ریاستی یا قومی زبان براہ راست پانچویں تک، چھٹے سے ریاستی یا قومی زبان اور انگریزی زبان آٹھویں تک۔ آٹھویں سے قومی یا ریاستی زبان اور انگریزی دسویں تک۔ ریاستی اور قومی زبان کا لازمی ایزادی نصاب چھٹے سے دسویں تک ترتیب دیا جائے اور اسے بچوں کے تعلیمی نتائج سے منسلک اور مربوط کیا جائے۔

ریاست میں ہندی اُردو کے مسئلے کو "ایک عام فہم زبان" دو رسم الخط کے اسی اصول کے تحت جو مروج رہا ہے بروئے کار لایا جائے تاکہ تعلیم و تدریس میں آسانی ہے، اس طرح رسم الخط ذریعہ تعلیم کی جگہ بروئے کار آئے گا۔ رسم الخط بوجھ بنے زبان بوجھ نہیں بننی چاہئے جو بصورت دیگر مادری زبان اور ریاستی یا قومی زبان سے محرومی کی صورت میں منتج ہوتی ہے۔

زبانوں کی تدریس و تعلیم کا ایک مقصد شخصیت کی تشکیل، تعمیر و تشریح بھی ہوتا ہے کہ زبان شخصیت کے نکھار اور پھیلاؤ میں ممد و معاون ہوتی ہے اسے اپنی بدقسمتی سے تعبیر نہ کیا جائے تو اور کیا کہ ہمارے ہاں اس سلسلے میں وقتاً فوقتاً غیر حقیقی اور غیر نفسیاتی پالیسی اپنائی گئی اور پوری کی پوری نسل کو کسی نہ کسی طرح اظہار و بیان تفہیم و تعبیر اور ترسیل و ابلاغ کے سلسلے میں تقریباً اپاہج بنا دیا گیا۔ بدیشی زبانیں پڑھانا ایک ضرورت بھی ہے اور ایک بہتر اقدام بھی تاکہ وسعت نظری، وسعت فکری، وسعت اظہار و بیان میسر آئے۔ اس حد تک انگریزی زبان ہماری ضرورت بھی ہے اور مجبوری بھی۔ لیکن کیا غیرت مند قومیں اپنی قومی اور ثقافتی شناخت کی قیمت پر غیروں کے ہاتھوں بک جاتی ہیں، اپنے ماضی سے دستبردار ہو جاتی ہیں اور اپنے فکری اور فہمی ورثہ سے منہ موڑ لیتی ہیں۔ غیر کو اپناتی ہیں اور اپنوں سے چھٹکارا حاصل کر لیتی ہیں۔ یہ پستی انتہائی بے حسی اور غفلت کی نشانی ہے۔ یہ اقدام مہلک بھی ہوتا ہے، باعث تذلیل و ندامت بھی۔ اور اگلی پیڑھی اپنے ماضی اور ثقافت سے کٹ کر نہ صرف اپنے ورثہ سے ہی کٹ جاتی بلکہ نئے حالات سے پیوند و پیوست بھی نہیں ہو سکتی۔ یہیں سے فکری انحطاط و بحران پیدا ہوتا ہے اور ذہنی و روحانی انتشار کی حدیں کھلتی ہیں۔

ارباب بست و کشاد نے بزعم خود شاید ہندوستان میں شامل اس ریاست کو برطانیہ یا نیویارک وغیرہ بنانے کے خیال سے انگریزی ساز پالیسی ترتیب دی اور آج تک اسے نبھا رہے ہیں جس کے نتیجے میں ریاست کی مادری و قومی زبانیں دب سی گئی ہیں، ہمارا اندریشہ

تعلیم کا سارا زور انگریزی پر ہے۔ انگریزی پڑھنا، انگریزی کے ذریعہ پڑھانا، انگریزی گویا وجہ افتخار و عزت ہے اور نفسیاتی و روحانی آسودگی۔ یہ ذہنی دیوالیے پن کی کھلی دلیل ہے۔ اپنی زبانیں گویا باعث تحقیر ہیں۔ اس پس منظر میں ریاست میں اردو کی ترویج و ترقی کے سارے دروازے بند ہیں۔ یہ روٹی روزی سے کٹ گئی ہے اور ضرورت کے مقام سے نیچے اتر آئی ہے۔ ہمارے تعلیم یافتہ ماہرین اور انگریزی خوان اس سے نابلد ہیں۔ آئے روز اس کا استعمال کم ہو رہا ہے۔ اس کی لغت اور اس کا پس منظر مختصر ہو رہا ہے۔ قربتیں نہیں فاصلے بڑھ رہے ہیں۔ زبانِ غیر یا دیارِ غیر کی کیفیت ابھر رہی ہے۔

اُردو سے متعلق فنون خوشنویسی، خطاطی، ٹائپنگ، کمپیوٹر یا ریسرچ کے لئے نہ ترغیبات ہیں نہ اقدامات۔ سرکار کے عملے اور کارندوں کے سب زمرے بالخصوص انجینئرنگ، ٹیکنالوجی، صحت عامہ اور باقی قریباً ٪۸۰ اردو کے استعمال و تعلق سے دستبردار ہو چکے ہیں۔ دستبردار ہی نہیں بعض حالات میں نفرت اور بیزاری کا مظاہرہ بھی ہوتا ہے۔

ریاستی ملازمتوں کے سارے زمروں کے لئے اُردو دانی کوئی پابندی نہیں۔ اس کا جاننا نہ لازمی ہے نہ کوئی شرط۔ حالانکہ یہ ایک غیر آئینی اور غیر اخلاقی بات ہے۔ اُردو کے اساتذہ کی فراہمی اور تربیت کے لئے کوئی موثر نظام نہیں۔

انگریزی پاگل پنے کی حد تک ہمارے دل و دماغ پر چھائی ہے۔ ۳ سال کا بچہ زیریں کنڈرگارٹن میں انگریزی ABC اور RHYME SCHEME شروع کرتا ہے اور پھر انگریزی ترکِ تعلیم تک بطور مضمون اور بطور ذریعہ تعلیم ساتھ رہتی ہے بچوں کی چھٹی کی درخواستیں ہوں یا ملازمین کی درخواستیں، عوام کی عرضیاں ہوں یا مسائل کے سلسلہ میں عرضداشتیں، انگریزی میں موثر سمجھی جاتی ہیں اور ہمارے حکمران ان سب پر صرف انگریزی زبان میں ہی چڑی مارنا (دستخط ثبت کرنا) جانتے ہیں، اردو میں

لکھی عرضیاں کم ہی آفیسر پڑھتے ہیں یا پڑھ سکتے ہیں اور درخواست دہندہ سے پوچھ کر ان پر مناسب ہدایات انگریزی میں لکھ دیتے ہیں اور یہ سلسلہ نیچے تک چلتا ہے اور زیادہ سرکاری روزمرہ کا کام کاج انگریزی میں ہوتا ہے اس طرح عوام اپنے افیسران کی کارکردگی سے بے خبر رہتے ہیں اور مسائل بھی رفع ہونے یا ختم ہونے سے رہ جاتے ہیں۔

دفتر میں اردو درخواست لے کر جایئے ایک پرائے پن کا احساس ہوتا ہے ہمارے حکمران "سودیشی انگریز" گویا نہ اس زمین اور عوام سے اٹھے ہیں نہ انہیں ان سے نسبت ہے لگتا ہے کہ یہ خود کو دوسروں سے الگ سمجھتے ہیں۔ انہیں اس زمین میں نہ جینا ہے نہ مرنا۔ دیش ادیکچا ہے یا بدیش یہ بات شاید ان کے دماغ میں آتی ہی نہیں۔ ہندی بھاشا بھی ان کے لئے باعث تحقیر ہے۔ یہ حضرات عوام سے خود کو دور رکھ کر عوامی حکومت کی جڑیں کھوکھلی کرتے ہیں۔ افہام وتفہیم اور تشریح وابلاغ کی بنیادیں اسی طرح کمزور ہوتی ہیں۔

کیا یہ ملک دشمنی اور قوم دشمنی نہیں ہے کہ پیدا ہوں اور پلیں بڑھیں مادر وطن میں مگر رکھ رکھاو، طریقہ، زبان اور برتاؤ ــــــ! خیر جانے دیجئے یہ کسی قوم کی روحانی اور ذہنی غلامی کی کھلی دلیل ہے۔ آزاد معاشرے اور قومیں اپنی قوم، اپنی زبانوں اور ثقافت کو فروغ دیتے ہیں، اپنا ماضی، اپنی تاریخ اور روایات دوسروں تک پہنچاتے ہیں، انہیں توسیع دے کر دوسروں کو اپنا ہمنوا بناتے ہیں اور اس طرح اپنا تعارف وسیع کر کے اپنا مقام مضبوط اور اپنی بات باوزن بناتے ہیں۔ اس پس منظر سے دیکھئے اور سوچئے ہم کتنے بے خبر اور بے گانہ ہیں۔ ہندوستانی (اردو ہندی) بیزاری اور انگریزی کی از حد بڑھتی ہوئی ہمنوائی سے ہم انگریز تو بہر حال نہ بن سکے لیکن اپنے ماضی، ورثے اور روایت سے کٹ کر ہم ہندوستانی مزاج کے

نہ رہے، کیا ہمارا ماضی نہایت گندہ ہے اور اب تابناک بن رہا ہے، کیا ہمارے بزرگ اور پڑھے لکھے بے بصیرت اور نادان تھے؟ اور ان کا چھوڑا ورثہ قابلِ ترک ہے؟ کیا ہم اپنی زبانوں کی مدد سے ایک بہتر نصاب کے ذریعے ملکی یا ریاستی سطح پر افرادی قوت پیدا کرنے کے اہل نہیں؟ کیا ہمیں اپنی زبانوں میں درس و تدریس کی روایت کو آگے بڑھانے اور اُن کی دھوپ چھاؤں میں نئی نسل تیار کرنے میں کچھ دقت محسوس ہوتی ہے؟

جس شد و مد سے سرکاری و غیر سرکاری مدرسوں میں انگریزی پر دباؤ اور زور ہے وہ ہمارے قومی اور شخصی کھوکھلے پن کا کھلا ثبوت ہے۔ اَن پڑھ غریب والدین اپنے TIT - BIT پڑھتے بچے کو دیکھ کر اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ بچے کی تعلیم و تربیت اعلیٰ ہو رہی ہے۔ حالانکہ وہ نہ TIT - BIT کی زبان میں قدرت حاصل کرتا ہے نہ اپنی زبان سے واقف ہوتا ہے، ماضی سے کٹا ہوا اپنی تاریخ اور جغرافیے سے بے خبر، اپنی روایت سے نفرت کرنے والا یہ طبقہ صالح اور سود مند کیسے بنے گا۔ اصلاح اور بہتری کی عمارت تو اپنی ہی زمین پر کھڑی ہو گی، دوسرے کی زمین پر نہیں۔ کوئی وقت تھا اور ماضی قریب میں ہی کہ ریاست میں تار برقی کوڈ فارسی رسم الخط میں تھا یا کہیے اُردو رسم الخط میں۔ آج صورتحال یہ ہے کہ ریاست میں سرکاری رابطے کی اور علاقائی زبان ہونے کے باوجود:

۱۔ ہمارا معاشرہ اس سے بے خبر اور غافل ہے اور بے اعتنائی برتتا ہے۔

۲۔ ہمارے بچے اوّل سے آخر تک انگریزی کے ذریعے ہی پڑھائی میں جُٹے رہتے ہیں، فیل ہوتے ہیں یا پاس، ہر دو صورتوں میں انگریزی کی مہارت کا فقدان اس کی بنیادی وجہ ہوتی ہے۔

۳۔ کسی بھی سطح پر اردو ہندی میں لازمی کامیابی پاس ہونے کی شرط نہیں ہے۔

۴۔ اردو ہندی کی معاون فارسی سنسکرت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی گئی ہیں جن کا براہ راست اثر ان زبانوں کی کمزور تحصیل اور اخلاقیات پر منتج ہوتا ہے۔

۵۔ ریاست میں اردو کی خصوصی مہارت کے لئے نہ شعبے ہیں، نہ تربیت نہ ترغیبات۔

۶۔ SIE اور DIETS کی چھتر چھایا میں حالات یہاں تک آن پہنچے ہیں کہ زیر تربیت اساتذہ کو دوران اسباق اردو پڑھنے والے بچے یا کلاس مہیا نہیں ہوتے۔

۷۔ SIE جموں اور ضلعی DIETS میں اردو کی ریاستی حیثیت کے مطابق اردو تدریس و آموزش کے بہتر اقدام نہ ہونے کے برابر ہیں۔

۸۔ خصوصی تربیت یا اردو اساتذہ کے کیمپ لگانے اور اردو کی بہتر افرادی قوت پیدا کرنے کے لئے کوئی منصوبہ بندی یا پلان موجود نہیں۔

۹۔ اردو سمٹ سمٹا کر مسلمانوں سے متعلق ہوتی جارہی ہے جو ایک بدقسمتی کی نشانی ہے۔

۱۰۔ عوامی مقامات، پارکیں، سڑکیں، دفاتر، گلیاں، گاڑیوں کی پلیٹیں، رستے، مقامات، سائین بورڈ، عام اشتہارات وغیرہ انگریزی اور ہندی میں متعارف ہیں گویا اردو ان مقامات سے خارج ہے۔

۱۱۔ سب ریاستی ملازمتوں میں بھرتی کے لئے اردو داں ہونا لازمی شرط نہیں رہا (حالاں کہ ریاست اور عوام کے مجموعی مفاد میں ایسا ہونا چاہیئے تھا)

۱۲۔ بورڈ آف سکول ایجوکیشن اپنے ترتیب کردہ نصابات بر دور اندیشی اور ریاستی مفاد کے عین مطابق عمل درآمد نہیں کروا رہا ہے۔ نتیجہ کے طور پر ہندی پڑھنے والے بچے اردو سے ناآشنا اور اردو پڑھنے والے ہندی سے نابلد رہتے ہیں۔ بورڈ ایک شمالی اور تعلیم سے متعلق ادارہ ہونے کی وجہ سے اردو میں بھی اپنا کام کاج کسی قدر کروا سکتا تھا جس سے اس زبان کی اہمیت اور تقویت مراد ہوتی لیکن بورڈ اپنا سارا کام کاج انگریزی میں کرواتا ہے۔

۱۳۔ مختلف سطحوں پر اردو کو بنیادی لازمی قرار دینا یا ایڈیشنل کی صورت میں لازمی پاس کی شرط رکھنا اور اس کے نمبرات مجموعی نتیجہ میں جمع کرکے نتیجہ بہتر بنانا۔ اس طرح اردو سیکھنے کی تحریک ہوگی اور وہ مفید مطلب بھی۔

۱۴۔ ضلعی اردو عملہ مقرر کرنا جو اساتذہ سے ہو اور مفید مطلب سفارشات پر عمل درآمد کروائے اور خود اقدامات کے ذریعہ بھی اردو کے فروغ اور ترویج کے لئے کام کرے۔

۱۵۔ بورڈ، یونیورسٹی یا ضلعی DIETS سے مراسلاتی کورس اجرا کروانا تاکہ اساتذہ اور بچے مستفید ہو سکیں۔ اور خواہش مند اردو سیکھ سکیں۔

۱۶۔ ذریعہ تعلیم و تدریس کے لئے موثر پالیسی بنانا (MEDIUM OF ISTRUCTION) اور ریاست بھر میں ثانوی درجہ تک اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دینا۔

۱۷۔ انگریزی پر صرف بحیثیت ایک زبان کی تحصیل کے توجہ دینا۔

۱۸۔ خود رو قسم کے انگلش میڈیم سکولوں کے پھیلاؤ کی حوصلہ شکنی۔

۱۹۔ حکومت کا اپنے جملہ دفاتر میں اردو کو رواج دینا، احکامات، کارروائی

اور کا غذات اردو میں نپٹانے کی حوصلہ افزائی کرنا۔

۲۰۔ اُردو لکھائی خوشنویسی چھپائی اور ٹائپنگ کے لئے ضلعی سطح پر مراکز قائم کرنا۔

۲۱۔ جموں وکشمیر اکادمی کو اُردو کے فروغ اور ترویج کے سلسلہ میں اور فعال بنانا تاکہ مختلف تربیتی اقدامات اور ریفریشر کورسز کروائے۔

۲۲۔ غیر اُردو داں طبقہ کو اُردو پڑھنے اور سیکھنے کے لئے ترغیبات (INCENTIVES) دینا۔

۲۳۔ غیر سائنسی علوم کو یونیورسٹی سطح پر اُردو کے ذریعہ پڑھانے کا اہتمام کرنا۔

۲۴۔ سائنسی مضامین پڑھنے والے طلبا کے لئے ہلکا پھلکا اُردو نصاب زاید اور لازمی رکھنا۔ یہ اعلیٰ تعلیم تک رکھا جاسکتا ہے۔ اس طرح امیدوار اپنی ثقافت اور زبان کے ساتھ جُڑے رہ سکتے ہیں تاکہ افہام وتفہیم اور اظہار ذات کے لئے صرف انگریزی کے استعمال کے علاوہ اپنے مطالب ومقاصد کو اُردو میں بھی بروئے کار لاسکیں۔

آئین (CONSTITUTION) رہنما اصول ہوتے ہیں اور عوامی طریقہ کار یا ریاستی انتظامیہ کے لئے ایک راستہ اور وعدہ (COMMITMENT) جسے پورا کرنا حکمران طبقہ کی بنیادی اور اخلاقی ذمہ داری ہوتی ہے۔ آئین کو کھوکھلا کرنا یا بروئے کار نہ لانے کا مطلب ظاہر ہے عوام سے وعدہ خلافی اور دیئے گئے اعتماد وذمہ داری کا پورا نہ کرنا دھوکہ دہی کے مترادف ہے۔ آئین حتمی دستاویز نہیں ہوتا لیکن رہبر خطوط مہیا کرتا ہے ان کے پورا کئے جانے کی سند دیتا ہے اور عوامی احساسات کو فعال اور بحال رکھتا ہے۔ ریاستی آئین کی روح کے خلاف کام کرنے کا صاف مطلب

ہر آئین میں کچھ رہنما اصول ہوتے ہیں جن پر کاربند رہنا حکومتوں پر لازمی ہے کہ یہ حکمران طبقے کی بنیادی اور اخلاقی ذمہ داری بھی ہوتی ہے۔ اِن رہنما اصولوں کی خلاف ورزی بجائے خود آئین کو کھوکھلا کرنے کے مترادف ہے۔

عوامی حکومتوں کے لئے تو یہ اور بھی لازمی ہے کہ عوامی احساسات کے عین مطابق اپنی پالیسیاں مرتب کرے اور اُن پر کاربند رہے ورنہ عوام کے احساسات کی پاسداری نہ کرنا آئین کی روح کے خلاف ہے اور اس کی انضباطی کارروائیاں بے سود اور اقدامات غیر عوامی کہلائیں گے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ اُردو کی ترقی ترویج اور بقاء کے لئے ایک موثر پالیسی اپنائی جائے اور بحیثیت سرکاری زبان اِسے جو آئینی تحفظ حاصل ہے اُس کے عین مطابق اس کی ترویج اور سرکاری کام کاج میں اس کے استعمال کے لئے مناسب اقدام کئے جائیں۔ اس ضمن میں یہ عرض کرنا بے جا نہ ہوگا کہ ریاست میں چونکہ کئی علاقائی زبانیں بولی جاتی ہیں اسلئے ضروری ہے کہ اُردو کے بارے میں کوئی فیصلہ لیتے وقت اُن کی ترقی و ترویج و مفادات کو بھی ملحوظ نظر رکھا جائے۔

ملکی اور قومی روایات، مفادات اور شناخت کے تحفظ کے لئے لازمی ہے کہ انگریزی پر انحصار کم کیا جائے اور علاقائی زبانوں کو اپنا مقام دیا جائے کیونکہ یہ اظہار کی زیادہ متحمل ہوتی ہیں اور اِن سے لسانی تسکین اور تربیت کے مقاصد بآسانی حاصل کئے جاسکتے ہیں ــــ!

سیما صغیر*

# کشمیر اور اردو ادب

## — سرسری جائزہ

کشمیر عہد قدیم سے علم و ادب، فکر و فلسفہ اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ چہار جانب سے بلند پہاڑیوں سے گھرا ہوا یہ خطہ برصغیر کے انتہائی شمال میں سطح سمندر سے پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے جو ہمیشہ سے محبت، بھائی چارے اور روحانی تصورات کو فروغ دینے میں پیش پیش رہا ہے۔ اس کی سوندھی پتھریلی مٹی میں خدا ترسی، انکساری، حلیمی اور خود شناسی کی مہک آتی رہی ہے۔ عہد قدیم سے یہاں شعر و ادب کے چراغ جلتے رہے ہیں اور ان کی ضیا پاش کرنوں سے قرب و جوار ہی نہیں بلکہ دور دراز کے گوشے بھی منور ہوتے ہیں۔ رشیوں، منیوں اور صوفی سنتوں کی بدولت پاکیزہ افکار و خیالات کا دور دور چرچا رہا ہے ہر چند کہ کشمیر نہ اردو کا علاقہ تھا اور نہ اردو یہاں کے لوگوں کی مادری زبان تھی لیکن پھر بھی یہاں کے عوام و خواص نے اسے گلے لگایا اور یہاں کے اہل قلم نے مذکورہ زبان کے توسط سے کشمیریوں کے جذبات و احساسات سے سبھی کو متعارف کرایا ہے۔

ماہرین لسانیات بڑی حد تک اس بات پر متفق ہیں کہ اردو زبان پنجاب کے قرب و جوار میں پیدا ہوئی۔ دکن میں پروان چڑھی، دہلی اور لکھنؤ میں سنواری گئی تو کشمیری زبان بھی جو ہند آریائی گروہ سے ہم رشتہ اور سنسکرت سے بہرہ مند



* شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

ہے، نے اپنے لچکدار رویے کی بدولت اس کو پنپنے کے مواقع دیتے۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ کشمیریوں نے بھی اُردو زبان وادب کو اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے اور اس کی ہر صنف میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں تو بیجا نہیں ہوگا تاریخی اعتبار سے، جس کے آثار پندرھویں صدی عیسوی میں زین العابدین بڈشاہ کی حکومت کے خاتمے کے بعد سے ملنے شروع ہوتے ہیں' اس افراتفری کے دور میں شمالی ہند کے لوگ اس جانب توجہ دیتے ہیں اور کشمیر کے بہت سے لوگ پنجاب، دہلی، آگرہ اور دوسرے علاقوں میں جا بستے ہیں۔ آمد و رفت کا سلسلہ دراز ہوتا ہے اور خود بخود اردو زبان پروان چڑھتی ہے۔ ۱۸۶۹ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ اسکی بے پناہ مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اسے سرکاری زبان کا درجہ دے دیتے ہیں اور آناً فاناً یہ دفاتر میں براجمان ہو جاتی ہے۔

جس طرح کشمیر کے بلند و بالا پہاڑ اور دلفریب وادیاں قدرت کے حسین نظاروں کے اعتبار سے اپنا ثانی نہیں رکھتے ہیں اسی طرح کشمیریوں کے دلوں میں پیار و محبت، خلوص اور اپنائیت کا دریا بھی رواں دواں ہے اور جس کے سوتے خشک نہیں ہوتے ہیں۔ اس کی جیتی جاگتی مثال اُردو زبان اور کشمیر کے درخشندہ اردو ادیب و فنکار ہیں۔ بشیر محمد خان قیس شیرانی "حبِ وطن" کے نام سے ایک نظم لکھتے ہیں! ؎

دنیا سے انوکھی ہے فضا میرے وطن کی
جاں بخش ہے پاکیزہ ہوا میرے وطن کی
شامِ اودھ و صبحِ بنارس سے سوا ہے
پاکیزگیِ صبح و مسا میرے وطن کی

تفریق نہ ہو شیخ و برہمن کے دلوں میں
ہر لحظہ ہے یہ حق سے دعا میرے وطن کی

علامہ اقبالؔ اس جنت نشان کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

کشمیر کا چمن جو مجھے دلپذیر ہے
اس باغ جانفزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثے میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائیداد
جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

کشمیری تہذیب کی ان گنت جہتوں، افکار و خیالات کے بے شمار پہلوؤں اور اس کی جمالیات کی گوناگوں وسعتوں اور گہرائیوں کو اُردو ادب نے کچھ اس طرح اپنے اندر اس حد تک سمیٹ لیا ہے کہ اس کو ایک مختصر سے مضمون میں مقید کرنا ممکن نہیں ہے۔ اصنافِ ادب کا جائزہ لیا جائے تو تحقیق و تنقید کے میدان میں عبدالاحد آزادؔ، حامدی کاشمیری، ڈاکٹر اکبر حیدری، محمد یوسف ٹینگ، رشید نازکی، موتی لال ساقی، مرغوب بانہالی، ظہور الدین، محمد زمان آزردہ، عابد پشاوری، برج پریمی، رحمان راہی، شمیم احمد شمیم، پی این پشپ، وغیرہ کے نام بے حد نمایاں ہیں۔ اسی طرح شاعری میں رتن ناتھ سرشار (شہرت افسانوی ادب میں حاصل ہوئی)، دیا شنکر نسیم، تربھون ناتھ ہجرؔ، آغا حشر کاشمیری، چراغ حسن حسرتؔ، علامہ اقبالؔ، علامہ دتاتریہ کیفی، تلوک چند محروم وغیرہ وادی کشمیر سے دور رہ کر بھی کشمیر کا نام روشن کرتے رہے لیکن وہ حضرات جو اسی ریاست میں پیدا ہوئے پروان چڑھے اور تمام عمر یہاں کے مسائل کو ہی اُردو کے دامن پر بیل بوٹوں کی طرح اُبھارتے رہے اُن کی ایک طویل فہرست ہے جن میں پنڈت

ہرپال خستہ، صادق علی خان، مرزا مبارک بیگ، مرزا اسعد الدین سعدؔ، راجہ شیر علی خان، تاراچند ترزؔل، کاشی ناتھ خوشترؔ، منشی سراج الدین، قمر قمراری، ڈاکٹر عماد الدین سوزؔ، حبیب کیفوی، وشوناتھ درماہ، اللہ رکھا ساغرؔ، حمید نظامی، غلام حیدر چشتی، طالب کاشمیری، شہہ زور کاشمیری، مرزا کمال الدین شیدا، میر غلام رسول نازکیؔ، دینا ناتھ مستؔ، منوہر لال دلؔ، میکش کاشمیری، رسا جاودانی، حامدی کاشمیری، غ۔م۔ طاؤس، شوریدہ کاشمیری، تنہا انصاری، کشن سمیل پوری، عبدالحق برقؔ، سیفی سوپوری، عشرتؔ کشتواڑی، غلام علی بلبل، عرشی صہبائی، قیصر قلندر، فاروق نازکیؔ، حکیم منظور، قاضی غلام محمد، ہمدم کاشمیری، سلطان الحق شہیدی، عابد مناوری، شجاع سلطانؔ، پرتپال سنگھ بیتابؔ، محمد یٰسین، رفیق رازؔ، اقبال فہیم، فاروق آفاقؔ، رخسانہ جبیں، شفق سوپوری، خالد بشیر، نذیر آزاد، فرید پربتی وغیرہ ایسے فنکار ہیں جن کے ادبی نقوش بیحد دلکش اور البیلے ہیں۔ اسی طرح افسانوی ادب میں آغا حشر کاشمیری، محمد عمر نورالہی، پریم ناتھ پردیسیؔ، علی محمد لون، ٹھاکر پونچھی، موہن یاور، اختر محی الدین، وید راہی، تیج بہادر بھان، پشکر ناتھ، نور شاہ، کلدیپ رعنا، جان محمد آزادؔ، خالد حسین، رامانند ساگر، کشمیری لال ذاکر، سنتوش اور بہت سے نئے افسانہ نگاروں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے کشمیریوں کی تہذیبی، سماجی اور اقتصادی زندگی کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ تمام تصاویر قاری کی آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتی ہیں جو ہندوستانی تہذیب وتمدن، رہن سہن، طرز زندگی اور رسم ورواج کی آئینہ دار ہیں۔

کشمیر کی تہہ دار، پہلو دار اور حد درجہ معنی خیز زندگی کو متعارف کرانے میں وہاں کی اردو صحافت اور اس کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔

خیر خواہ کشمیر، مراسلۂ کشمیر، بہار کشمیر، اخبار عام، پنجۂ فولاد، کشمیر میگزین، تحفۂ کشمیر، زنبیر، صداقت، حقیقت، ہمدرد، خالد، جہانگیر، برق، ہدایت، وکیل، کشمیر جدید، دیش، نور، امر، پاسبان، جمہور، خورشید، نوجوان، مارتنڈ، جیوتی، روشنی، خدمت، نوائے قوم، آفتاب، رنجیت، پیام، انقلاب، سندیش، سرینگر ٹائمز، نوائے صبح، آئینہ، الصفا، چٹان، جرأت وغیرہ جیسے اخبارات اور "شیرازہ" و "تعمیر" جیسے ماہناموں کے ذکر کے بغیر کشمیر میں اردو ادب پر لیا جانے والا جائزہ ادھورا رہے گا۔

کشمیر کے اردو ادیب اور شعرا اس زبان میں اپنے جذبات و احساسات کو اردو میں لکھنے والے کسی بھی جگہ کے ادیبوں کی طرح بیان کرتے ہیں۔ مثلاً کشمیر جس خون آشام دور سے گزرا ہے اس کی بازگشت اس دور کے اردو ادب میں موجود ہے۔ ان میں کشمیریوں کے ولولوں، خوابوں، حسرتوں اور دکھوں کی ترجمانی ہے۔ قلبِ مجروح، چہرے پژمردہ، خوف و ہراس کا ماحول ہے۔ پیش ہیں چند شعر میر غلام محمد طاؤس کی ایک نظم سے ؎

مرغزاروں، کوہساروں کی نہ پہلی شان ہے
ان بہاروں، آبشاروں میں نہ کوئی جان ہے
پھول کھلتے ہیں ابھی لیکن چمن ویران ہے
صحنِ گلشن جس کو سمجھے ہو وہ اک شمشان ہے
چاک ہے دل، ناک میں دم ہے جوان و پیر کا
اک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا!

# چند نوشتے

کشمیری زبان کا پہلا انسائیکلوپیڈیا کلچرل اکیڈمی کا بہت اہم منصوبہ ہے۔ اس کی پہلی جلد ریاست کے آثار قدیمہ کا احاطہ کرتی ہے جو شائع ہو کر صاحبِ نظر حضرات کی پسندیدگی حاصل کر چکی ہے۔ اُردو قارئین کی دلچسپی کیلئے ہم نے اس جلد کے ترجمے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ اب تک ۲۲۱ نوشتوں کا ترجمہ پیش کیا جا چکا ہے۔ زیر نظر شمارے میں مزید تین نوشتوں کا ترجمہ شاملِ اشاعت کیا جا رہا ہے۔

• — (ادارہ)

## (۲۲۲) ۔ مہاوراہ

راجہ للتادت (۷۳۱ - ۶۹۵ء) نے جو بہت سے مندر کشمیر میں تعمیر کرائے اُن میں ماوراہ بھی شامل تھا۔ راجہ نے یہ مندر پرسپور میں بنوایا جو سرینگر سے ۲۴ کلومیٹر کی دُوری پر سرینگر بارہمولہ سڑک کے داہنے کنارے کریوے کے ساتھ ساتھ آباد تھا۔

راج ترنگنی میں کلہن اس مندر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے؛

سونے کا زرہ بکتر باندھے مہاوراہ (وشنو کی مورت) اس طرح سورج کی طرح چمک رہا تھا جس طرح پاتال کا اندھیرا ختم کرنے کے لئے سورج نور پھیلایا کرتا ہے،

پرسپور کے آثار خلط ملط ہونے کی وجہ سے اب وہاں مندر کے آثار ڈھونڈ نکالنا مشکل ہے۔ البتہ ایک بات کھری ہے کہ کریوے کے جنوب مشرق میں گوردن کریوے پر جو کھنڈرات موجود ہیں ان کا تعلق ہندو مندروں سے ہے، جب کہ درے کے پار شمال مشرق کے آثار بدھ تعمیرات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ دور لکھمن پور میں مندر کے جو آثار موجود ہیں، مختلف واقعات سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ یہ آثار مکتہ کیشو اور پرہاس کیشو مندروں کا ملبہ ہیں۔ یہ ساری بات زیر نظر رکھکر مہاوراہ مندر کے آثار ان کھنڈرات میں تلاش کرنے ہونگے جو گوردن کریوے پر ہیں۔

کتاب نامہ:

★ STEIN: GEOG. ★ BATES.
★ STEIN: RAJ, A GAZETTEER.

• — (اصل: موتی لال ساقی
مترجم: نگہت جان)

## (۲۲۳) مہور گڈھ :-

مہور گڈھ قلعہ سانبہ کے شمال میں ۱۰ میل دور گوڈ سلاتھیاں کے نزدیک واقع ہے۔ قلعہ طرز تعمیر کے اعتبار سے مغل طرز تعمیر سے میل کھاتا ہے۔ قلعے کی ڈیوڑھی نہایت شاندار اور پرشکوہ ہے اور اس کی بناوٹ شمالی ہندوستان میں موجود مغل دور کے قلعوں سے ملتی ہے۔

اندازہ کیا جاتا ہے کہ یہ قلعہ اس دور کی یادگار ہے جب جموں کا علاقہ دُرانیوں کے ماتحت تھا جبکہ کئی لوگوں کا خیال ہے کہ اکبر کے ایک باغی سپہ سالار نے شاہی فوجوں کا مقابلہ کرنے کی خاطر یہ قلعہ تعمیر کیا جو اس کے پیچھے پڑی تھیں۔ اگرچہ قلعے کی فصیل گر چکی ہے مگر اس کے برج اور استادہ دیواریں اس ویرانے میں تعمیر کار کے جبروت اور جلال کا پتہ دیتی ہیں۔ قلعے کی ایک ڈیوڑھی پر عربی میں ایک کتبہ موجود ہے جس پر موجود عبارت مٹ جانے کی وجہ سے کتبہ پڑھا نہیں جا سکتا۔

قلعے کی تعمیر کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ہنگامی حالات میں چھپنے کی جگہ کے طور پر تعمیر ہوا ہے۔ قلعے کے احاطے میں ٹیلے کو ہموار کر کے دو بڑے تالاب بنوائے گئے ہیں جن میں قلعے میں رہنے والے لوگوں کے لئے پانی رہتا ہوگا۔

کتاب نامہ: ● ——(اصل: موتی لال ساقی
مترجم: نگہت جان )

* CHARAK: HIMALAYANA
* GULABNAMA.
* NARGIS.

## (۲۲۴) مینڈر آثار :-

مینڈر (سخی میدان) آثار گرد و نواح کے علاقوں میں پانڈو محل کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ آثار مینڈر کے مغرب میں تین میل دور مینڈر اور چھونگاں نالوں کے دوراہے پر ہیں۔ اس جگہ دو پہاڑوں کے درمیان کھلی جگہ ہے جس کے چاروں طرف سرسبز جنگل،

کھیت اور چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں۔

یہ آثار ایک وسیع رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں جس کے چاروں طرف دیوار ہے اور ہر دیوار ۱۵۰ فٹ سے زیادہ لمبی ہے۔ محل کی دیواروں پر ایک ہی تراش کے دوری پتھر لگے ہیں، دو میٹر لمبے پون میٹر چوڑے اور نصف میٹر اونچے یا موٹے تمام دوری پتھر چکنے اور ہموار ہیں۔ پتھروں کی تراش خراش اور بناوٹ اس قدر شاندار ہے کہ تعمیر کاروں کی فنکارانہ مہارت کی داد دینی پڑتی ہے۔ پتھر جوڑنے کے لئے کوئی مسالہ استعمال کیا گیا ہے جس سے لگتا ہے کہ کوئی چیز پگھلا کے اس سے گارے کا کام لیا گیا ہے۔ تعمیر کے دائیں طرف دیوار کے ساتھ پانچ کوٹھڑیوں کے آثار موجود ہیں۔ کوٹھڑیوں کے جنوب مغرب میں ایک ٹیلے کے آثار نظر آتے ہیں۔ مقامی روایت کے مطابق یہ ٹیلہ اگلے وقتوں میں پچاس فٹ تک اونچا تھا جس پر شنکر، وشنو اور برہما کی تین چہروں والی مورتیاں تھیں۔ مگر اب یہ اونچی سی ہموار جگہ ہے جس پر چڑھنے کیلئے غروب آفتاب کی سمت سیڑھی بنی ہے۔ عام لوگ اس جگہ کو مندر کہتے ہیں۔ اس مندر کے اوپری حصے میں پتھر کا ایک صندوق ہے جس کے ڈھکن پر گنیش کی مورتی بنی ہے۔ کہتے ہیں اس صندوق میں اگلے زمانے میں مورتیاں تھیں جو چرائی گئی ہیں۔ محل کے احاطے میں داخل ہونے کے لئے شمال مغرب میں پتھر کی ڈیوڑھی ہے جو ابھی سلامت ہے۔ احاطے کے اندر پتھروں کا ستون ہے جو آٹھ فٹ لمبا اور ایک فٹ چوڑا ہے۔ مقامی لوگوں نے پانڈوؤں کی بہت سی روایات اس تعمیر کے ساتھ وابستہ کی ہیں۔ کچھ عرصہ قبل یہاں شو اور وشنو کی مورتیاں نکلیں جن میں تانبے اور جست کی مورتیاں بھی شامل تھیں۔ محل کے احاطے میں موجود کنوئیں سے بھی کبھی مورتیاں دستیاب ہوتی ہیں۔

اونچے ٹیلے کے آثار اس بات کا احساس کراتے ہیں کہ پہلے زمانے میں اس تعمیر کا

تعلق بدھ مت سے رہا ہے، درمیان والی صفہ نما ہموار جگہ بھی اس بات کی توثیق کرتی ہے۔ بدھ مت کے زوال کے بعد اس جگہ کا استعمال مندر کے طور پر کیا گیا۔ عین ممکن ہے کہ اس جگہ ایک بڑا بودھ وہار رہا ہوگا۔ جہاں تک پتھر کے ستون کا تعلق ہے یہ چیتیہ کا حصہ رہا ہے۔ مینڈر آثار کا تعلق بھی للتادت کے دور سے رہا ہوگا کیونکہ اس کی تعمیرات کے آثار ہمیں کشمیر سے باہر کوہ نمک کے علاقے میں دور دور تک ملتے ہیں۔

کتاب نامہ: ● ——— (اصل: موتی لال ساقی

مترجم: نگہت جان)

★ FAUQ , ★ NARGIS.

○

## (۲۲۵) ناران ناگ:۔

ہرموکھ پہاڑی کے مشرق میں یہ تیرتھ گنگ بل کے راستے کا آخری پڑاؤ مانا جاتا ہے۔ ناران ناگ کے علاوہ اسے وانگت مندر، نندی کھیتر، شوبھوتیش اور رام رادن کہتے ہیں۔ کلہن اس تیرتھ کا ذکر سودر ناگ نام سے بھی کرتا ہے۔ سطح سمندر سے ۱۳۰۰۰ فٹ بلندی پر یہ تیرتھ کرینکہ ندی کے کنارے اٹھارہ مندروں پر مشتمل ہے یہ مندر دو جھرمٹوں میں منقسم ہیں۔ پہلے جھرمٹ میں گیارہ اور دوسرے جھرمٹ میں چھ مندر۔ اس کے علاوہ کئی مندروں کے آثار کرینکہ ندی کے پار کنارے موجود ہیں۔ ناراں ناگ یا نندی کھیتر جھیل میں کشمیری شوبھوتیش کی پوجا بہت پہلے سے کرتے چلے آئے ہیں۔ نیل مت پوران کے ایک حوالے کے بموجب اس جگہ نندی نے شو کی پوجا کی اور ان کی تپسیا کا پھل یہ نکلا کہ شو نے اس جھیل میں مستقل طور قیام کیا۔ کلہن پنڈت کا کہنا ہے کہ راجہ اشوک اکثر نندی کھیتر جایا کرتا تھا اور راجہ جلوک نے جب دیاس کے ایک شاگرد سے نندی پران سنا تو اس نے سودر ناگ جانے کا

عہد کیا اور وہاں اولین یادگار قائم کی۔ یہ بات زیر نظر رکھ کر وانگت علاقے میں پہلا مندر راجہ جلوک کے عہد میں تعمیر کیا گیا ہے۔ جلوک کے بعد اکثر کشمیری راجاؤں نے اس علاقے میں مندر بنوائے جن میں نریندر آدتیہ، اونتی ورمن اور للتادت جیسے بادشاہوں کے بناتے ہوئے مندر قابل ذکر ہیں۔ اس وقت ان مندروں کی وہ حالت نہیں ہے جو کسی زمانے میں رہی ہوگی۔ اکثر مندر کھنڈروں میں تبدیل ہو چکے ہیں اور کئی مندروں کے صرف آکار ہی باقی ہیں۔ ۱۸۱۹ء میں ان مندروں کا پتہ سر آرل سٹائن نے لگایا۔ تمام مندروں میں سرمئی رنگ کے چونے کا پتھر تراش کر لگایا گیا ہے اور حسن کھویہامی کے کہنے کے مطابق پتھروں کو اس خوبصورتی کے ساتھ جوڑا گیا ہے کہ اوپر سے نیچے تک کی دیوار ایک ہی پتھر کی بنی ہوئی لگتی ہے۔ مندروں کا چھوٹا جھرمٹ وانگت گاؤں میں چار دیواری کے اندر ہے۔ اس جھرمٹ کا سب سے بڑا مندر، جو ماہرین کے بقول للتادت کا بنایا ہوا جیشٹھ رُدر مندر ہے۔ یہ ۲۵ فٹ مربع اور ساخت کے اعتبار سے ایسا ہی ہے جیسے کشمیر کے اکثر مندر ہیں۔ البتہ اس کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ اس کے شمال مشرق اور جنوب مشرق میں دو دروازے ہیں۔ کشمیر کے اکثر مندروں میں جہاں اہرامی طرز کے چار بام چھت ہیں وہاں اس مندر پر برج جیسا بنایا گیا ہے۔ مندر کے برج کے اندر گول گنبد اور گنبد کے بیچ میں کھلا ہوا کنول۔ یہ برج چار ستونوں پر ایستادہ ہے۔ بیچ والی جگہ پوجا کا کمرہ ہے جو ۱۰ مربع فٹ ہے۔ اس کمرے کی وسطی جگہ خالی ہے۔ شاید یہاں شو کی مورتی رہی ہوگی۔ پوجا کے کمرے کے دو اطراف بالکل بند ہیں اور ان کے اندر سے نقاشی کی گئی ہے۔ مندر کے باہر تراشیدہ پتھر اور اندر سادہ پتھروں کا استعمال کیا گیا ہے۔ چاروں طرف تعمیر میں چونے اور سُرخی کا استعمال کیا گیا ہے۔ للتادت کے اس مندر کے علاوہ اس جھرمٹ میں اور بھی پانچ مندر ہیں۔ یہ مندر جیشٹھ رُدر کے مقابلے میں بہت

چھوٹے ہیں ۔ کئی مندروں کے باقیات دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ مختلف زمانوں میں تعمیر ہوئے ہیں ۔ کئی مندروں کی چھت اہرامی طرز اور کچھ مندروں کی گنبد طرز کی رہی ہے

مندروں کے اس جھُرمٹ سے تقریباً دو سو گز دور ایک لمبا سا پلیٹ فارم ہے ۔ یہ پلیٹ فارم ۱۰۰ فٹ لمبا اور ۶۷ فٹ چوڑا ہے ۔ اور کشمیر میں آہنی طرز کا واحد نمونہ ہے ۔ قیاس ہے کہ یہ راجہ جے سمہا کے وزیر رلہن کا بنوایا منڈپ ہے جس کا تذکرہ پنڈت کلہن نے راج ترنگنی میں کیا ہے ۔ اس منڈپ کے مشرق میں ایک قسم کی محراب یا سٹیج سا بنا ہے ۔ اس سٹیج کے اب صرف آٹھ ستون ایستادہ ہیں ۔ ان ستونوں کی سیدھ میں دوسری جانب برآمدہ ہے ۔ برآمدے کی سیڑھی سے مندروں کے اگلے جھُرمٹ کا راستہ بنا ہوا ہے ۔ سیڑھی کے آخری زینے کے دونوں طرف پتھروں کے ستون شاید اس وجہ سے نصف کئے گئے ہیں کہ ان پر پردے ٹانگے جاتے تھے ۔

مندروں کا دوسرا جھُرمٹ بھی پہلے جھُرمٹ سے سات سو گز دور ہے اور اس کے اردگرد چار دیواری ہے ۔ اس جھُرمٹ میں کل گیارہ مندر ہیں اور سب سے بڑا مندر اونتی ورمن کا شو بھوتیش ہے ۔

مندر کے جنوب میں ایک چھوٹا مندر ہے جو بناوٹ کے اعتبار سے سب مندروں سے الگ دکھائی دیتا ہے ۔ اس کی طرز بانڈے مندر کی ہے اور یہ چھوٹے چھوٹے گول پتھروں سے بنایا گیا ہے ۔ شو بھوتیش مندر کے شمال میں ایک اور مندر ایک بڑی چٹان کو کرید کر بنایا گیا ہے ۔

مندروں کے علاوہ یہاں ایک شو لنگ بھی موجود ہے اور دو چوکور پتھر بھی ہیں جن پر راج ہنسوں کی شکلیں بنی ہوئی ہیں ۔

عمارتوں کے ان دونوں جھرمٹوں کے گرد بڑے بڑے پتھروں کی دیوار ہے اور دیوار

کے شمال میں ناراں ناگ جھیل ہے۔ جھیل سے ہٹ کے ذرا اونچائی پر دوہری چھت

والا ایک پھر و مندر ہے۔

تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ سیاسی بحرانوں کی وجہ سے ناراں ناگ کے مندروں

کی تباہی ہوئی ——— جب سنگرام راج کشمیر پر حکومت کرتا تھا اس وقت ان

مندروں پر پہلی آفت ٹوٹ پڑی۔ اس کے علاوہ اچل کے دورِ حکومت میں نندی

کھیتر پر آگ لگ گئی۔ ناراں ناگ کا میلہ راجہ جے سمہا کے وقت میں ہاڑ کی چودھویں

تاریخ کو لگتا تھا۔

کتاب نامہ :

- ★ GAZETTEER.
- ★ STEIN ; RAJ.
- ★ BAMZAI ; HSTT.
- ★ PARIMOO ★ SOFI ; KASHEER
- ★ MOORCRAFT.

● ——— ( اصل : بشیر اختر

ترجمہ : نگہت جان )

## (۲۲۶) نارستان :۔

نارستان اونتی پور سے ۔ اسیں دور براری آنگن پہاڑی کے دامن میں

ایک گاؤں ہے جس کے بیچوں بیچ آریت نالہ بہتا ہے۔ نیل مت پوران میں نارائن ستھان

نام کے ایک تیرتھ کا ذکر ہے اور ماہرین کا اندازہ ہے کہ آج کا نارستان، لفظ نارائن

ستھان کا کشمیری روپ ہے۔ نارستان مندر پہاڑی کے دامن میں ایک ٹیلے پر

ہے اور اس کی طرزِ تعمیر اُس وقت کی فن کاری کا نمونہ ہے جب سنگتراشی اپنے

عروج پر تھی۔ اس مندر کی ساخت پایر اور پاندریٹھن کے مندروں کی سی ہے البتہ

اس میں سنگ تراشی اور نقاشی کے نمونے زیادہ واضح ہیں۔ چھٹی صدی عیسوی میں

جو مندر کشمیر میں بنائے گئے اُن کی سب سے بڑی خصوصیت چاروں طرف دیوار

بندی اور دیوار کے اندر تراشیدہ پتھروں کی راہداری ہے۔ نارستان مندر کے اردگرد

۶۵ فٹ مربع لمبی، ۶ فٹ اونچی اور ۵ فٹ چوڑی دیوار کھڑی کی گئی ہے۔ دیوار کے مغرب میں ڈیوڑھی ہے اس کے دونوں طرف پتھروں کے تراشیدہ ستون اور ڈیوڑھی کے اوپر محرابیں بنی ہوں گی کیونکہ ڈیوڑھی کے اردگرد اس وقت بھی بعض پتھر بکھرے پڑے ہیں جن پر مختلف آکار نمایاں ہیں۔ سب سے بڑے دروازے کے اندر ۱۰ فٹ صحن جیسا ہے۔ اس صحن کے بعد ایک اور دیوار آتی ہے۔ اس دیوار پر بھی ½۴ فٹ چوڑا دروازہ بنایا گیا تھا۔ اس طرح اصل مندر تک پہنچنے کے لئے دو ڈیوڑھیاں پار کرنی پڑتی ہیں۔ اصل مندر ½۳ فٹ اونچائی پر دیوری پتھروں کے پلیٹ فارم پر ایستادہ ہے۔ مغرب کی سمت میں جہاں مندر کا دروازہ ہے ۶ فٹ راہداری اور باقی تین اطراف میں ۲ فٹ چوڑا راستہ بنایا گیا ہے۔ اس پلیٹ فارم سے کلش تک مندر کی بلندی ۳۴ فٹ ہے۔ مندر پر چار بام چھت ایرانی طرز کی رہی ہوگی جس کا اوپری حصہ گر گیا ہے۔ مندر کی دیوار پر شمال کی طرف محراب دار طاق ہے جن میں مختلف دیویوں کے آکار کندہ ہیں۔ پوجا کے کمرے میں پتھر کی سلوں کا فرش ہے اور کلش کے عین نیچے کمرے کا فرش خالی ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ یہاں مورتی رہی ہوگی۔

یہ مندر کس نے تعمیر کیا ہے اور اس کا اصلی نام کیا ہے اس کے متعلق کوئی بات دریافت نہیں ہو سکی ہے۔ البتہ مغرب کی سمت میں دروازہ ہونے کی وجہ سے قیاس ہے کہ یہ شو مندر ہے۔ اس کا طرزِ تعمیر بہت ہی قدیم ہونے کی گواہی دیتا ہے۔ جس علاقے میں یہ مندر موجود ہے اس کو نیل مت پوران میں نرائن ستھان کا نام دیا گیا ہے جواب سمٹتے سمٹتے مندر تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

● ۔ (اصل: بشیر اختر
مترجم: نگہت جان)


کتاب نامہ:

* HASSAN; TAREEKH
* STEIN, RAJ, * KAK * BATES,
* SOFI; KASHEER.
* HUGEL * BAMZAI; HISST.

(۲۲۷) ناگر نگر فصیل :-

سری نگر میں ہاری پربت یا کوہِ ماران کی پہاڑی کے ارد گرد، حدود میں ساڑھے تین میل لمبی اس فصیل کا ایک سرا جنوب مشرق میں مزار بہاؤ الدین سے شروع ہوکر سعدہ کدل کے نزدیک جا پہنچتا ہے وہاں سے اس کا دوسرا سرا شمال میں امدا کدل میں ختم ہوتا ہے۔ امدا کدل سے شروع ہوکے اس کا ایک اور سرا مغرب میں حول اور بادام واری سے گزر کر پھر سے مزار بہاء الدین تک پہنچتا ہے۔ یہ فصیل ۲۸ فٹ اونچی اور ۱۲ فٹ چوڑی ہے۔ ہر پچاس گز کے بعد اس کے ۳۴ فٹ بلند اور ۱۵ فٹ گول برج یا سنگی پشتے ہیں۔ ہر دو فٹ بعد فصیل میں چار انچ چوڑے سوراخ یا نالیاں سی بنائی گئی ہیں جہاں سے دشمن پر حملہ کرنے کی غرض سے بندوقوں کی نالیاں گذاری جاتی تھیں۔ فصیل کے تین دروازے ہیں جن میں جنوب کا کاٹھی دروازہ سب سے بلند ہے۔ اس دروازے کی محراب ۲۵ فٹ بلند اور چوڑائی ۲۰ فٹ ہے محراب کے چاروں طرف دیوری پتھروں کے طاق ہیں جن پر نقش و نگار بنے ہوتے ہیں دروازہ کے اوپر تین حصوں میں اکبر بادشاہ کے زمانے کا نصب شدہ کتبہ ہے جس پر فصیل کی تعمیر اور دیگر کیفیات درج ہیں۔ اس محراب کا اوپری حصہ حال ہی میں از سرِ نو تعمیر کیا گیا ہے۔ فصیل کا دوسرا دروازہ مغرب میں ہے اور سنگین دروازے کے نام سے مشہور ہے۔ یہ دروازہ کاٹھی دروازے سے چھوٹا لیکن ساخت کے اعتبار سے زیادہ خوبصورت لگتا ہے۔ اس کے اندر اور باہر سنگِ سیاہ لگے ہیں اور دروازے کے دائیں بائیں طاق اور روشن دان ہیں۔

کھڑکیوں پر نقاشی کی گئی ہے۔ شاید یہی دروازہ بادشاہ کی آمد و رفت کے لئے اکثر اوقات استعمال کیا جاتا تھا۔ تینوں دروازوں کے پٹ غائب ہیں البتہ پتھروں سے تراشے گئے کھونٹے ابھی موجود ہیں۔ فصیل کا تیسرا دروازہ جنوب مغرب

میں ہے۔ اسے باچھی دروازہ کہا جاتا ہے۔ یہ دروازہ سب سے چھوٹا اور کسی نقش نگاری کے بغیر ہے اس دروازے کے دائیں بائیں ۲۵ گز تک سوراخوں کی ایک اور قطار ہے کہیں کہیں اس فصیل میں ۲ فٹ چوڑے اور ۶ فٹ اونچی چھوٹی محرابیں سی بنائی گئی ہیں جو دیوار کے آر پار جانے کے لئے استعمال ہوتی تھیں آج ان محرابوں کو اور بھی چوڑا بنایا گیا ہے اور درجن بھر سے زائد مقامات پر دیوار مسمار کر دی گئی ہے۔

فصیل کی تعمیر میں کثرت سے چونا سرخی استعمال کی گئی ہے اس فصیل میں کہیں کہیں دیوار کے لٹھے ڈالے گئے ہیں یہ لٹھے اب سڑ گئے ہیں۔ فصیل کی تعمیر کا حکم شہنشاہ اکبر نے ۱۵۹۰ء میں دیا جب وہ تیسری مرتبہ کشمیر آیا۔ کئی مورخین کا کہنا ہے کہ کشمیر میں شدید قحط پڑا تھا۔ عام لوگوں کے خورد و نوش کے انتظام کے لئے بادشاہ نے یہ فصیل تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ مگر کئی تاریخ دان کہتے ہیں کہ اس فصیل کی تعمیر سے قبل کشمیر میں مغل فوجوں کے لئے کوئی چھاؤنی مقرر نہیں تھی اور یہ مقامی لوگوں کے گھروں میں رہائش کرتے تھے۔ فوج اور لوگوں کے درمیان مخاصمت ختم کرنے کے لئے شہنشاہ اکبر نے ہاری پربت کے ارد گرد ناگر نگر کا نیا علاقہ بسایا اور اس کے ارد گرد گی پشتوں والی فصیل تعمیر کروائی۔ اس فصیل پر ۱۵۹۷ء میں کام شروع ہوا اور جہانگیر کے کہنے کے مطابق ۱۶۲۰ء میں بھی اس فصیل پر کام چل رہا تھا۔ فصیل کے اندر نئے علاقے میں فوج کیلئے بارکیں اور مغل سرداروں کے لئے کوٹھیاں تعمیر کی گئیں۔ بادشاہ کے حکم پر پربت کے مشرق میں باغ درشن یا جرہ وگہ شاہی نام کا باغ ڈل کے کنارے تعمیر کیا گیا۔ اس باغ کے چاروں طرف سنگ سیاہ کے تختے جڑے ہوئے تھے اور چاروں طرف سایہ دار درخت لگوائے گئے تھے۔ یہ باغ ۱۶۲۰ء میں خراب ہو گیا تھا اور جہانگیر نے اس

کی از سرِ نو مرمت کرائی۔ اس باغ میں شہنشاہ اکبر نے اپنی رہائش کے لئے چھوٹی سی بالادری بنوائی تھی۔ جہانگیر نے اپنے وقت کے مشہور مصوروں سے اس بالادری کی دیواروں پر تصویریں بنوائی تھیں۔ یہ باغ پٹھان سردار امیر خاں جواں شیر نے مسمار کیا اور اس کے پتھر اپنے محل میں لگوائے۔ اِس باغ کے کچھ آثار سنٹرل جیل کے جنوب میں نظر آتے ہیں۔ پربت کے جنوب میں شہزادہ دارا شکوہ نے ۱۶۳۹ء میں سنگِ سیاہ کا ایک خوبصورت محل اور اپنے اُستاد آخوند مُلا شاہ کے لئے حمام اور مسجد تعمیر کروائی۔ دونوں عمارتوں کے آثار اس وقت موجود ہیں۔ دارا محل سے ذرا اونچائی پر حضرت شیخ حمزہ مخدوم صاحبؒ کا آستانہ عالیہ ہے۔ ہاری پربت کے مغرب میں چکریشور کا مندر ہے۔ یہ مندر از سرِ نو تعمیر کیا گیا ہے۔ پربت کی فصیل کے اندر آج کل ایک باضابطہ بستی ہے۔ اس کے مشرق میں شہر کا سب سے بڑا جیل خانہ اور مغرب میں بادام واری ہے۔ ؎

کتاب نامہ ● — (اصل : بشیر اختر
ترجمہ : نکہت جان)

★ ABUL FAZL : AIN ★ VIGNE
★ BAMZAI : HIST. ★ STEIN : RAJ.
★ TUZK ★ HASSAN : TAREEKH ★ SOFI : KASHEER
★ BAMZAI : HIST.

○

## (۲۲۸) ناگم کوٹ :

ناگم کوٹ، ناگام گاؤں کے جنوب میں تھا۔ یہ گاؤں سرینگر کے جنوب میں چرار شریف جاتے ہوئے گیارہویں میل پر آتا ہے۔ کلہن کی راج ترنگنی میں گاؤں کا ذکر موجود نہیں۔ البتہ جونراج نے بار بار اس گاؤں کا نام لیا ہے۔

---

؎ بادام واری کی پلاٹ بندی کی گئی ہے اور وہاں آج کل ایک اچھی خاصی بستی ہے (ادارہ)

قلعہ کس جگہ تھا اُس کے متعلق حسن نے بھی اس کے ذکر کے دوران کوئی بھی اشارہ نہیں کیا۔ راج ترنگنی میں راجہ بالادتیہ کے دور میں قلعہ تعمیر کرنے کا کوئی بھی ذکر موجود نہیں البتہ گاؤں میں قلعہ سلطان فتح شاہ کے وقت تک موجود تھا۔ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ ناگام، لولی پورہ سڑک کے بائیں طرف ڈلی پورہ کے قریب کریوے کو "کھٹہ" کہا جاتا تھا۔ عمر رسیدہ بوڑھوں کا کہنا ہے کہ کسی زمانے میں یہاں دیوار کے نشان نظر آتے تھے۔ ۵۹-۱۹۵۸ء میں اس جگہ ہل جوتتے ہوئے کوڑیوں سے بھری ہانڈیاں اور مٹکے ملے۔ ناگام گاؤں میں یا ارد گرد کہیں کسی قسم کے قدیم آثار نظر نہیں آتے۔ موقع محل سے معلوم ہوتا ہے کہ قلعہ آثار دریافت ہونے کی جگہ ہی تھا کیونکہ کریوے سے ذرا نیچے پختہ اینٹیں دستیاب ہوئی ہیں۔ البتہ پختہ اینٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قلعہ اسلامی دور میں تعمیر کیا گیا ہے۔ لگتا ہے کہ نیا قلعہ پرانے آثار پر بنایا گیا ہے لیکن کوئی شہادت اسکی توثیق نہیں کرتی۔

کتاب نامہ ● — (اصل: موتی لال ساقی

* STEIN : GEOG * FERGUSON ترجمہ: نگہت جان)

* HASSAN : TAREEKH.

## ۳۲۹ نڈون وہار:

نڈون وہار سرینگر میں شمال مغرب کا وہ علاقہ ہے جو آج کل سنگین دروازے اور عید گاہ کے درمیان نزورہ نام سے جانا جاتا ہے۔ اس علاقے میں راجہ میگواہن (پانچویں صدی) کی رانی یوک دیوی نے یودھ وہار تعمیر کرایا۔ اس وقت علاقے میں اس محل کے آثار کہیں دکھائی نہیں دیتے نہ اس علاقے میں کسی جگہ کوئی کھدائی کی گئی ہے۔

شاتن نے جب وقت اِس علاقے کا دورہ کیا اُس وقت علاقے میں قبرستانوں اور زیارتوں کے ارد گرد پرانی تعمیرات کے آثار بکھرے پڑے تھے اس دہار کی خاص بات یہ تھی کہ اس کا ایک حصہ اُن بودھ بھکشوؤں کے لئے مخصوص تھا جو شادی شدہ تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پانچویں صدی میں کشمیر میں بدھ مت روبہ زوال ہونا شروع ہوا تھا۔

کتاب نامہ ● ـــ (اصل: موتی لال ساقی
ترجمہ: نگہت جان)

★ BAMZAI : AK. ★ BATES
★ STEIN : RAJ ★ KAK.
★ GAZETTEER.

## (۲۳۰) نربرستان:

سرینگر جہلم کے دائیں کنارے ملک آنگن اور کھان محلہ کے مابین نربرستان واقع ہے۔ روایت ہے کہ اس جگہ نریندر سوامن تھا جس کی نسبت سے اسکا نام نربرستان پڑ گیا، البتہ پرانے زمانے کے آثار یہاں آج کہیں دکھائی نہیں دکھائی نہیں دیتے۔

تذکرۂ اولیائے کشمیر میں درج ہے کہ حضرت قاسم حقانیؒ حضرت میر سید علی ہمدانی کے ساتھ (۱۳۷۹ء) میں یہاں آئے اور آج کے نربرستان محلے میں اُس جگہ قیام کیا جہاں آج کل آستانہ ہے یہ جگہ ایک لوہار کی ملکیت تھی۔

معرفت الحقانی میں درج ہے کہ شاہ صاحب کو موسیقی سے زبردست لگاؤ تھا جس پر بعض لوگوں نے اعتراض کیا۔ اُسکے جواب میں انہوں نے کہا کہ مجھے بانسری کی لے بہت عزیز ہے اور جب میں مرجاؤں تو میرے مزار پر نرکل اُگیں گے۔ کہتے ہیں کہ اُنکے انتقال کے بعد اُنکے مزار پر نرکل اُگتے رہے جس وجہ سے اس جگہ کا نام "نر پیر" پڑ گیا جو بعد میں نربرستان بن گیا۔

آستانے کے احاطے میں عزیز اللہ حقانی (وفات ۱۹۲۶ء) بھی دفن ہیں۔ عزیز اللہ حقانی حضرت قاسم حقانیؒ کی آٹھویں پُشت سے تھے۔ کشمیر میں عزیز اللہ حقانی کا مرتبہ بہت ہی بلند ہے۔ یہ محمود گامیؒ کے بعد کشمیری کے سب سے پُرگو شاعر ہیں۔ اسی محل میں حضرت قاضی حسین شیرازی بھی دفن ہیں۔ وہ فلسفے، طریقت اور معرفت کے مردِ کامل مانے جاتے تھے۔ وہ حضرت میر محمد ہمدانیؒ کے ساتھ کشمیر آئے۔ کہتے ہیں کہ شیراز میں سچّے قاضی مانے جاتے تھے۔ کشمیر میں وہ قاضی ولی کے نام سے مشہور رہتے

٥ــــ اصل : مجید عاصمی

ترجمہ : نگہت جان )

کتاب نامہ

* HASSAN : TAREEKH.

* STEIN : RAJ.